ادبی پارے

(نثر و نظم)

نویں، دسویں اور گیارھویں جماعتوں کے لیے

مؤلف

خلیل الرب بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے (علیگ)

سری رام مہرا اینڈ کمپنی
ایجوکیشنل پبلشرز آگرہ

۱۹۵۹ء

تین روپے ۵۰ نئے پیسے

حصّۂ نثر

فہرست عنوانات

صفحہ		مولف
	اردو نثر کا تدریجی ارتقا	
	قصہ ملک نیم روز کے شاہ زادے کا	۱۔ میر امّن
	ساحرہ کی عیاری	۲۔ رجب علی بیگ سرور
	خطوط	۳۔ اسد اللہ خاں غالب
	نوروز، بحث و تکرار	۴۔ سیّد احمد خاں
	اکبر کا دربار اردو شاعری کے پانچ دور	۵۔ محمد حسین آزاد
	مشقّت کی زندگی، ایک انگریز حاکم سے ملاقات	۶۔ نذیر احمد
	تخیّل اور اس کا تصرف غالب کی ظرافت نیچریہ شاعری	۷۔ الطاف حسین حالی
	آٹھواں کا میلہ	۸۔ رتن ناتھ سرشار
	زیب النسا بیگم انیس کی شاعری کے چند محاسن	۹۔ شبلی نعمانی
	جھلملاتا ہوا تارہ لکھنؤ میں فنون ادبیہ کی ترقی	۱۰۔ عبدالحلیم شرر
	سوتیلی ماں کا آخری وقت	۱۱۔ راشد الخیری
	ادب اردو اور چکبست	۱۲۔ عبدالحق

۱۳- حسن نظامی
مرچ نامہ
کربلا کی باتیں

۱۴- ابوالکلام آزاد
حکایت بادہ و تریاک

۱۵- پریم چند
عیدگاہ

۱۶- سجاد حیدر یلدرم
سفر بغداد

۱۷- مسعود حسن ادیب
واجد علی شاہ اور اُردو ادب

۱۸- نیاز فتح پوری
چاند کا سفر

۱۹- علی عباس حسینی
دل بہلاوا

۲۰- فرحت اللہ بیگ
پنکھے کا جلوس
ذوق، غالب اور مومن سے ملیے

۲۱- قاضی عبدالغفار
عروس البلاد
بجرو

۲۲- رشید احمد صدیقی
جگر صاحب

۲۳- پطرس
سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

۲۴- مجنوں گورکھپوری
تنقیدی میلانات

۲۵- شوکت تھانوی
صفی لکھنوی، عظیم بیگ چغتائی
لاٹری کا ٹکٹ

۲۶- آل احمد سرور
ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ

۲۷- کنھیا لال کپور
بے تکلفی

میر امّن

اٹھارویں صدی عیسوی میں دلّی میں رہتے تھے۔ اور لطفؔ تخلص کرتے تھے۔ جب دلّی کی سلطنت بگڑی تو یہ پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ وہاں کچھ عرصے تک نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم کے اتالیق رہے۔ پھر فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں میں شریک ہوگئے۔

اس کالج میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی نگرانی میں ایک شعبۂ اُردو زبان میں تصنیف و ترجمہ کا قائم ہوا تھا۔ اس ادارہ نے اردو زبان کی بیش بہا خدمت انجام دی۔

میر امّن نے میر عطا حسین تحسینؔ اٹاوی کی فارسی کتاب نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھ کر قصۂ چہار درویش، سلیس اُردو میں لکھا۔

اس کتاب کی بدولت میر امّن کو شہرت ابدی حاصل ہوئی اور انھیں نثرِ اُردو کا بانی قرار دیا گیا۔ زبان و بیان کی سلاست و دل کشی کے لحاظ سے یہ کتاب آج بھی لاجواب ہے۔ ڈیڑھ سو سال پرانی ہونے پر بھی اس کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اُس دور کی داستان گوئی کا اندازہ ہوتا ہے اور اُس زمانہ کے رسم و رواج، مذہبی عقائد، توہمات اور معاشرتی زندگی کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

سیر پہلے درویش کی

میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام، بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیوپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کے گھر میں موجود تھے۔ ان کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر اور بولتا ہے اور دوسری ایک بہن جس کی قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی ایک شہر کے سوداگر بچے سے شادی کردی۔ وہ اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماں باپ کے سایہ میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن، سوداگری کا بہی کھاتہ روزانہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس نہایت خوشی اور بے فکری میں گزرے۔ کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بیک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔ عجب طرح کا غم ہوا، جس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ یکبارگی یتیم ہوگیا۔ کوئی سر پہ بوڑھا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کرکے گزرے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے

قصہ ملک نیم روز کے شاہزادے کا

(یہ قصہ میر امن کی کتاب "باغ و بہار" سے منتخب کیا گیا ہے۔ جو امیر خسرو کی فارسی تصنیف چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ اس تصنیف کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے مولانا عبدالحق کا مضمون "مقدمۂ باغ و بہار" پڑھنا چاہیے)

برس دن کے عرصے میں ہرج مرج کھینچتا ہوا شہر نیم روز میں جا پہنچا۔ جتنے وہاں کے آدمی ہزاری اور بزاری نظر پڑے، سیاہ پوش تھے۔ جیسا احوال سُنا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کئی دنوں کے بعد چاند رات ہوئی۔ پہلی تاریخ کو سارے لوگ اُس شہر کے چھوٹے بڑے لڑکے بالے امرا، باد شاہ، عورت مرد ایک میدان میں جمع ہوئے۔ میں بھی اپنی حالت میں حیران سرگرداں اس کثرت کے ساتھ اپنے مال ملک سے جدا فقیر کی صورت بنا ہوا کھڑا دیکھتا تھا کہ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اتنے میں جوان گاؤ سوار منہ میں کف بھرے، جوش و خروش کرتا ہوا جنگل میں سے باہر نکلا۔ یہ عاجز جو اتنی محنت کرکے اس کے احوال دریافت کرنے کی خاطر گیا تھا، دیکھتے ہی اُسے حواس باختہ ہو کر حیران کھڑا رہ گیا۔ وہ جوان مرد قدیم قاعدے پر جو جو کام کرتا تھا کر کر پھر گیا اور خلقت شہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب مجھے ہوش آیا تب میں پچھتایا کہ یہ کیا تجھ سے حرکت ہوئی۔ اب مہینے بھر پھر راہ دیکھنی پڑی۔ لاچار سب کے ساتھ چلا آیا اور اس مہینے کو ماہ رمضان کے مانند ایک ایک دن گن کر کاٹا۔ بارے دوسری چاند رات آئی، مجھے گویا عید ہوئی۔ غرے کو پھر

بادشاہ خلقت سمیت وہیں جا کر اکٹھے ہوئے۔ تب میں نے دل میں مصمم ارادہ کیا کہ اب کے بار جو ہو سو ہو، اپنے تئیں سنبھال کر اس ماجرائے عجیب کو معلوم کیا چاہیے۔

ناگاہ جوان بدستور زرد بیل پر زین باندھے سوار ہو آپہنچا، اور اتر کر دوزانو بیٹھا۔ ایک ہاتھ میں ننگی سیف اور ایک ہاتھ میں بیل کی ناتھ پکڑی اور مرتبان غلام کو دیا۔ غلام ہر ایک کو دکھا کر لے گیا آدمی دیکھ کر رونے لگے۔ اس جوان نے مرتبان پھوڑا۔ اور غلام کو ایک تلوار ایسی ماری کہ سر جدا ہو گیا اور آپ سوار ہو کر مڑا۔ میں اس کے پیچھے جلد قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ شہر کے آدمیوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا یہ کیا کرتا ہے، کیوں جان بوجھ کر مرتا ہے؟ اگر ایسا ہی تیرا دم ناک میں ہے۔ تو بہتیری طرحیں مرنے کی ہیں۔ مر رہیو۔ ہر چند میں نے منت کی اور زور بھی کیا کہ کسو صورت سے ان کے ہاتھ سے چھوٹوں، چھٹکارا نہ ہوا۔ دو چار آدمی لپٹ گئے اور پکڑے ہوئے بستی کی طرف لے آئے۔ عجب طرح کا قلق پھر مہینے بھر گزرا۔

جب وہ بھی مہینا تمام ہوا اور سلخ کا دن آیا، صبح کو اسی صورت سے سارے عالم کا اژدحام ہوا۔ میں الگ سب سے نماز کے وقت اٹھ کر آگے ہی جنگل میں (جو عین اس جوان کی راہ پر تھا) گھس کر چھپ رہا کہ یہاں تو کوئی میرا مزاحم نہ ہوگا۔ وہ شخص اسی قاعدے سے آیا اور وہی حرکتیں کر کر سوار ہوا اور چلا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور دوڑتا دھوپتا ساتھ ہو لیا۔ اس عزیز نے آہٹ سے معلوم کیا کہ کوئی چلا آتا ہے۔ ایک بارگی باگ موڑ کر ایک نعرہ مارا اور گھرکا۔ تلوار کھینچ کر میرے سر پر آپہنچا۔ چاہتا تھا کہ حملہ کرے، میں نے نہایت ادب سے نہڑ کر سلام کیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر

کھڑا رہ گیا۔ وہ قاعدہ دان متکلم ہوا کہ اے فقیر! تو ناحق مارا گیا ہوتا، بچ گیا۔ تیری حیات کچھ باقی ہے۔ جا، کہاں آتا ہے؟ اور جڑاؤ خنجر موتیوں کا اور آویزہ لگا ہوا کمر سے نکال کر میرے آگے پھینکا اور کہا اس وقت میرے پاس کچھ نقد موجود نہیں جو تجھے دوں، اس کو بادشاہ کے پاس لے جا، جو تو مانگے گا، ملے گا۔ ایسی ہیبت اور ایسا رعب اس کا مجھ پر غالب ہوا کہ نہ بولنے کی قدرت، نہ چلنے کی طاقت، منہ میں گھگی بندھ گئی، پاؤں بھاری ہوگئے۔

اتنا کہہ کر وہ غازی مرد نعرہ بھرتا ہوا چلا۔ میں نے دل میں کہا ہرچہ بادا باد، اب رہ جانا تیرے حق میں برا ہے۔ پھر ایسا وقت نہ ملے گا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھو کر میں بھی روانہ ہوا۔ پھر وہ پھرا اور بڑے غصے سے ڈانٹا۔ اور مقرر ارادہ میرے قتل کا کیا۔ میں نے سر جھکا دیا اور سوگند دی کہ اے رستمِ وقت کے، ایسے ہی ایک سیف مار کہ صاف دو ٹکڑے ہو جاؤں، ایک تسمہ باقی نہ رہے، اور اس حیرانی اور تباہی سے چھوٹ جاؤں۔ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ وہ بولا کہ اے شیطان کی صورت! کیوں اپنا خونِ ناحق میری گردن پر چڑھاتا ہے اور مجھے گنہگار بناتا ہے؟ جا اپنی راہ لے، کیا جان بھاری پڑی ہے؟ میں نے اس کا کہا نہ مانا اور قدم آگے دھرا، پھر اس نے دیدہ و دانستہ آنا کانی دی، اور میں پیچھے لگ لیا۔ جاتے جاتے دو کوس وہ جھاڑ جنگل طے کیا۔ ایک چاردیواری نظر آئی۔ وہ جوان دروازے پر گیا اور نعرۂ مہیب مارا۔ وہ در آپ سے آپ کھل گیا۔ وہ اندر بیٹھا، میں باہر کا باہر کھڑا رہ گیا، الٰہی اب کیا کروں! حیران تھا، بارے ایک دم کے بعد غلام آیا اور پیغام لایا کہ چل تجھے روبرو بلایا ہے۔ شاید تیرے سر پہ

اجل کا فرشتہ آیا ہے۔ کیا تجھے کم بختی لگی تھی! میں نے کہا، زہے نصیب اور بے دھڑک اُس کے ساتھ اندر باغ کے گیا۔

آخر ایک مکان میں لے گیا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر فراشی سلام کیا۔ اس نے اشارت بیٹھنے کی کی، میں ادب سے دوزانو بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں، کہ وہ مرد اکیلا ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہتھیار زرگری کے آگے دھرے ہیں اور ایک جھاڑ زمرد کا تیار کر چکا ہے۔ جب اس کے اٹھنے کا وقت آیا، جتنے غلام اس شہ نشیں کے گرد و پیش حاضر تھے، حجروں میں چھپ گئے۔ میں بھی مارے وسواس کے ایک کوٹھری میں جا گھسا۔ وہ جوان اٹھ کر سب مکانوں کی کنڈیاں چڑھا کر باغ کے کونوں کی طرف چلا اور اپنی سواری کے بیل کو مارنے لگا۔ اُس کے چلانے کی آواز میرے کان میں آئی، کلیجا کانپنے لگا، لیکن اس ماجرے کی دریافت کرنے کی خاطر یہ سب آفتیں سہی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا۔ جوان نے وہ سونٹا جس سے مارتا تھا، ہاتھ سے ڈال دیا اور ایک مکان کا قفل کنجی سے کھولا اور اندر گیا۔ پھر وہیں باہر نکل کر نر گاؤ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور منہ چوما اور دانہ گھاس کھلا کر ادھر کو چلا۔ میں دیکھتے ہی جلد دوڑ کر پھر کوٹھری میں جا چھپا۔

اس جوان نے زنجیریں سب دروازوں کی کھول دیں، سارے غلام باہر نکلے۔ زیر انداز اور سلیچی آفتابہ لے کر حاضر ہوئے۔ وہ وضو کر کر نماز کی خاطر کھڑا ہوا۔ جب نماز ادا کر چکا، پکارا کہ وہ درویش

کہاں ہے؟! اپنا نام سنتے ہی میں دوڑ کر روبرو جا کھڑا ہوا۔ فرمایا بیٹھ، میں تسلیم کر کر بیٹھا۔ خاصہ آیا، اس نے تناول فرمایا، مجھے بھی عنایت کیا۔ میں نے بھی کھایا۔ جب دستر خوان بڑھایا اور ہاتھ دھوئے، غلاموں کو رخصت دی کہ جا کر سو رہو۔ جب کوئی اس مکان میں نہ رہا، تب مجھ سے ہم کلام ہوا اور پوچھا کہ اے عزیز! تجھ پر کیا ایسی آفت آئی ہے جو تو اپنی موت کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے؟ میں نے اپنا احوال آغاز سے انجام تک جو کچھ گذرا تھا تفصیل وار بیان کیا اور کہا، "آپ کی توجہ سے امید ہے کہ اپنی مراد کو پہنچوں"۔ اس نے یہ سنتے ہی ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بے ہوش ہوا اور کہنے لگا، بارے خدایا! عشق کے درد سے تیرے سوا کون واقف ہے، جس کی نہ پھٹی ہو بوائی، کیا جانے پیر پرائی۔ اس درد کی قدر جو دردمند ہو سو جانے۔

آفتوں کو عشق کی عاشق سے پوچھا چاہیے
کیا خبر فاسق کو ہے، صادق سے پوچھا چاہیے

بعد ایک لمحے کے ہوش میں آ کر ایک آہ جگر سوز بھری، سارا مکان گونج گیا۔ تب مجھے یقین ہوا کہ یہ بھی اسی عشق کی بلا میں گرفتار ہے اور اسی مرض کا بیمار ہے۔ تب تو میں نے دل چلا کر کہا کہ میں نے اپنا احوال سب عرض کیا، آپ توجہ فرما کر اپنی سرگزشت سے بندے کو مطلع فرمائیے تو بہ مقدور اپنے، پہلے تمھارے واسطے سعی کروں اور دل کا مطلب کوشش کر کر ہاتھ میں لاؤں۔ القصہ وہ عاشق صادق مجھ کو اپنا ہم راز اور ہمدرد جان کر اپنا ماجرا اس صورت سے بیان کرنے لگا کہ سن اے عزیز! میں پادشاہ زادہ جگر سوز اس اقلیم نیم روز کا ہوں۔ پادشاہ یعنی قبلہ گاہ نے میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رمال اور پنڈت جمع کئے اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو اور جانچو، اور جنم پتری درست کرو اور جو جو کچھ ہوتا ہے حقیقت پل پل گھڑی گھڑی

اور پہر پہر اور دن دن، جیسے مہینے اور برس برس کی مفصل حضور میں عرض کرو۔
بموجب حکم پادشاہ کے سب نے متفق ہو اپنے اپنے علم کی رو سے ٹھہرا اور
سادھ کر التماس کیا، کہ خدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور سبھ لگن میں
شہزادے کا تولد ہوا اور جنم ہوا ہے کہ چاہیے سکندر کی سی بادشاہت کرے
اور نوشیرواں سا عادل ہو اور جتنے علم اور ہنر ہیں، ان میں کامل ہو اور
جس کام کی طرف دل اس کا مائل ہو بخوبی حاصل ہو۔ سخاوت و شجاعت میں
ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رستم کو لوگ بھول جاویں، لیکن چودہ برس
تلک سورج اور چاند کے دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ نظر آتا ہے، بلکہ یہ وسواس
ہے کہ جنونی اور سودائی ہو کر بہت آدمیوں کا خون کرے اور بستی سے گھبراوے،
جنگل میں نکل جاوے اور چرند و پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔ اس کا تقید
رہے کہ رات دن آفتاب ماہتاب کو نہ دیکھے بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے
پاوے جو اتنی مدت خیر و عافیت سے کٹے تو پھر ساری عمر سکھ اور چین
سے سلطنت کرے۔

یہ سن کر پادشاہ نے اسی لیے اس باغ کی بنا ڈالی اور مکان متعدد ہر ایک
نقشے کے بنوائے۔ میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حکم کیا اور اوپر ایک برج
نمدے کا تیار کروایا کہ دھوپ اور چاندنی اس میں سے نہ چھنے۔ میں دائی،
دودھ پلائی اور انگا چھوچھو اور کئی خواصوں کے ساتھ اس محافظت سے
اس مکان عالی شان میں پرورش پانے لگا اور ایک استاد دانا کار آزمودہ
واسطے میری تربیت کے متعین کیا، تو تعلیم ہر علم و ہنر کی اور مشق ہفت قلم
لکھنے کی کرے اور جہاں پناہ ہمیشہ میرے خبر گیراں رہتے۔ دم بدم کی کیفیت
روز مرہ حضور میں عرض ہوتی، میں اس مکان کو عالم دنیا جان کر کھلونوں

اور رنگ برنگ پھولوں سے کھیلا کرتا اور تمام جہان کی نعمتیں کھانے کے واسطے موجود رہتیں۔ جو چاہتا سو کھاتا دس برس کی عمر تک جتنی صنعتیں اور قابلیتیں تھیں تحصیل کیں۔

ایک روز اس گنبد کے نیچے روشن دان سے ایک پھول اچنبھے کا نظر پڑا کہ دیکھتے دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ لوں جو میں ہاتھ لمبا کرتا تھا وہ اونچا ہوجاتا تھا۔ میں حیران ہوکر اسے تک رہا تھا، وونہیں ایک آواز قہقہے کی میرے کان میں آئی۔ میں نے اس کے دیکھنے کو گردن اٹھائی، دیکھا تو نمدا چیر کر ایک کھڑا چاند کا سا نکل رہا ہے دیکھتے ہی اس کے میرے عقل و ہوش بجا نہ رہے۔ پھر اپنے تئیں سنبھال کر دیکھا تو ایک مرصّع کار تخت پری زادوں کے کاندھے پر معلق کھڑا ہے اور ایک تخت نشیں تاج جواہر کا سر پر اور خلعت جھلا بور بدن میں پہنے ہاتھ میں یاقوت کا پیالہ لیے اور شراب پیے ہوئے بیٹھی ہے۔ وہ تخت بلندی سے آہستہ آہستہ نیچے اتر کر اس برج میں آیا۔ تب پری نے مجھے بلایا، اور اپنے نزدیک بٹھایا، باتیں پیار کی کرنے لگی، اور منہ سے منہ لگا کر ایک ایک جام شراب گل گلاب کا میرے تئیں پلایا اور کہا آدمی زاد بے وفا ہوتا ہے لیکن دل ہمارا تجھے چاہتا ہے۔ ایک دم میں ایسی انداز و ناز کی باتیں کیں کہ دل محو ہو گیا اور ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ زندگی کا مزا پایا اور یہ سمجھا کہ آج تو دنیا میں آیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ میں تو کیا کہوں؟ کسو نے یہ عالم نہ دیکھا ہوگا، نہ سنا ہوگا، اس مزے میں خاطر جمع سے ہم دونوں بیٹھے تھے، کہ کڑیال میں غلیلا لگا۔ اب اس حادثۂ ناگہانی کا ماجرا سن، کہ وونہیں چار پری زادنے آسمان پر سے اتر کر کچھ اس معشوقہ کے کان میں کہا، سنتے ہی اس کا چہرہ تغیر ہو گیا اور مجھ سے بولی

کہ اے پیارے! دل تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی دم تیرے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاؤں اور اسی طرح ہمیشہ آؤں یا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ پر یہ آسمان دو شخص کو ایک جگہ آرام سے اور خوشی سے رہنے نہیں دیتا۔ لے، جاناں، تیرا خدا نگہبان ہے۔ یہ سن کر میرے حواس جاتے رہے، اور طوطے ہاتھ کے اڑ گئے۔ میں نے کہا کہ اجی اب پھر کب ملاقات ہو گی؟ یہ کیا تم نے غضب کی بات سنائی؟ اگر جلد آؤ گی تو مجھے جیتا پاؤ گی، نہیں تو پچھتاؤ گی، یا اپنا ٹھکانا اور نام ونشان بتاؤ کہ میں ہی اس پتے پر ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اپنے تئیں تمہارے پاس پہنچاؤں۔ یہ سن کر بولی، دور پار شیطان کے کان بہرے تمہاری صد وبیست سال کی عمر ہووے، اگر زندگی ہے تو پھر ملاقات ہو رہے گی۔ میں جنوں کے پادشاہ کی بیٹی ہوں اور کوہ قاف میں رہتی ہوں۔ یہ کہہ کر تخت اٹھا اور جس طرح اترا تھا ویسی ہی بلند ہونے لگا۔

جب تلک سامنے تھا میری اور اس کی چار آنکھیں ہو رہی تھیں جب نظروں سے غائب ہو گیا یہ حالت ہو گئی جیسے پری کا سایہ ہوتا ہے۔ عجب طرح کی اداسی دل پر چھا گئی، عقل و ہوش رخصت ہوا، دنیا آنکھوں کے تلے اندھیری ہو گئی، حیران پریشان، زار زار رونا اور سر پہ خاک اڑانا، کپڑے پھاڑنا، نہ کھانے کی سدھ، نہ بھلے برے کی بدھ۔

کہ اے پیارے! دل تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی دم تیرے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاؤں اور اسی طرح ہمیشہ آؤں یا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ پر یہ آسمان دو شخص کو ایک جگہ آرام سے اور خوشی سے رہنے نہیں دیتا۔ لے، جاناں، تیرا خدا نگہبان ہے۔ یہ سن کر میرے حواس جاتے رہے، اور طوطے ہاتھ کے اڑ گئے۔ میں نے کہا کہ اجی اب پھر کب ملاقات ہوگی؟ یہ کیا تم نے غضب کی بات سنائی؟ اگر جلد آؤگی تو مجھے جیتا پاؤگی، نہیں تو پچھتاؤگی، یا اپنا ٹھکانا اور نام ونشان بتاؤ کہ میں ہی اس پتے پر ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اپنے تئیں تمھارے پاس پہنچاؤں۔ یہ سن کر بولی، دور پار شیطان کے کان بہرے تمھاری صد وبیست سال کی عمر ہووے، اگر زندگی ہے تو پھر ملاقات ہو رہے گی۔ میں جنوں کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور کوہ قاف میں رہتی ہوں۔ یہ کہہ کر تخت اٹھا اور جس طرح اترا تھا ووہیں بلند ہونے لگا۔

جب تلک سامنے تھا میری اور اس کی چار آنکھیں ہو رہی تھیں جب نظروں سے غائب ہوگیا یہ حالت ہوگئی جیسے پری کا سایہ ہوتا ہے۔ عجب طرح کی اداسی دل پر چھاگئی، عقل وہوش رخصت ہوا، دنیا آنکھوں کے تلے اندھیری ہوگئی، حیران پریشان، زار زار رونا اور سر پہ خاک اڑانا، کپڑے پھاڑنا، نہ کھانے کی سدھ، نہ بھلے برے کی بدھ۔

مزید مطالعہ کے لیے : قصہ چہار درویش (خلاصہ)
از کوثر چاند پوری

سوالات

۱۔ جواں مرد کون تھا اور کس نیت سے آیا کرتا تھا؟
۲۔ درویش نے جواں مرد کا حال معلوم کرنے کی کیا تدبیر نکالی؟
۳۔ درویش نے جواں مرد کے مکان پر کیا منظر دیکھا؟
۴۔ روشن دان سے اُترنے والا پھول کسے کہا ہے؟

مشقیں

۱۔ اس سبق سے متروک الفاظ اور فقروں کو چھانٹو اور ان کے مترادفات بتاؤ۔
۲۔ درویش اور جواں مرد کی بات چیت کو مکالمہ کی شکل میں پیش کرو جیسے:
جواں مرد۔ (تلوار چمکاتے ہوئے) خبردار جو تونے آگے قدم بڑھایا کیا تو اپنی زندگی سے بیزار ہے؟
درویش۔ (گردن جھکاتے ہوئے) اگر بیزار نہ ہوتا تو ایسی ہمت کیوں کرتا؟
۳۔ تم جانتے ہو کہ اسم کسی بھی نام کو کہتے ہیں۔ خاص نام کو اسم خاص یا معرفہ اور عام نام کو اسم عام یا نکرہ کہتے ہیں۔ اس سبق سے اسم معرفہ اور نکرہ کی مثالیں چھانٹو۔

نکرہ۔ برس۔ دن۔ عورت۔ مرد۔ . . . .

معرفہ۔ ماہ رمضان۔ رستم۔

ساحرہ کی عیاری

(یہ اقتباس فسانۂ عجائب، سے منتخب کیا گیا ہے۔ اس میں سرور کے طرز تحریر اور اس دور کی داستان گوئی کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔)

محرّرانِ جادو نگار، سحر ساز، راقمانِ فسانۂ ہوش ربا حیرت پرداز نے لکھا ہے کہ جانِ عالم ہر صبح مثلِ مہر درخشاں قطعِ منازل و مراحل و ہر شام مانند ماہِ تاباں مقام کرتا چند عرصے میں پھر اسی دشتِ ادبار صحرائے خارخار جہاں حوض میں کود پڑا تھا، وارد ہوا۔ حوض کے متصل سراپردۂ خاص نصب ہوئے۔ گرد لشکر نصرت اثر اترا۔ انجمن آرا اور ملکہ مہرنگار کو وہ چشمہ دکھایا۔ جب دن تمام ہوا نمازِ شام کے واسطے جدا خیمے میں تشریف لایا۔ نماز پڑھ کے کسل راہ سے، پلنگڑی جواہر نگار بچھی تھی، اس پر لیٹ رہا۔ سستی کے باعث غنودگی سی تھی کہ دفعتہً ایک خواص خاص انجمن آرا کی دوڑی آئی۔ کہا، شہزادہ جانِ عالم کی عمر دراز ہو، نصیب دشمناں شہزادی کی طبیعت ناساز ہے۔ شدّت سے کلیجے میں درد ہوتا ہے۔ وہ نقش سلیمانی اور لوح دیجیے، دھو کر پلادیں۔ عارضۂ مزاج مطلوب و بدمزگی طبیعت محبوب سن کے بے قرار ہوا کچھ نیند کا خمار، کچھ طبیعت کا انتشار، دیکھا نہ بھالا نقش و لوح حوالہ کیا۔ نقش دیتے ہی نقشہ بگڑ گیا۔ ایک آواز مہیب پیدا ہوائی، کہ اے جانِ عالم! بہت دنوں اڑتا پھرا۔ مدت کے بعد پھنسا، خبردار ہو جا۔ ایسی آواز ہول ناک تھی کہ سب لشکری ڈر گئے۔ شجاعوں کے

دل تھرا گئے۔ محل میں عورتوں کو غش آ گئے۔ گھبرا کر شہ زادہ نے اٹھنے کا قصد کیا۔ جگہ سے ہلا نہ گیا۔ غور جو کیا تو آدھا جسم پتھر کا ہو گیا تھا۔ پھر تو جو جہاں بیٹھا تھا بیٹھا رہ گیا، جو کھڑا تھا اینٹھا رہ گیا۔ ہر طرف غل و شور تھا، جو پڑا تھا زندہ درگور تھا۔ کچھ دکھ، کچھ ہنسی، تمام فوج آفت ناگہانی میں پھنسی۔ عجب کھلبلی مچی۔ کل لشکر انسان سے حیوان تک نیچے کا دھڑ پتھر کا اور اوپر کا جسم بدستور۔ آہ و نالہ، فریاد و بُکا، سب لشکر میں بپا تھا اور محل سرا میں بھی یہی ہنگامہ مچا تھا۔ ہر ایک گرفتار بلا تھا۔ وہ عورتوں کی زاری، انجمن آرا کی بے قراری، علی الخصوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسمان کا پنتا تھا۔

تمام لشکر میں از شام تا پگاہ ہر ایک کے لب سے نالۂ جاں کاہ بلند رہا۔ جس وقت ماہ دم سرد بھرتا نقاب سیاہ روئے تاباں پر ڈال کر غم کدۂ مغرب کی طرف روانہ ہوا اور آفتاب جگر سوختہ مشرق سے نکل کر خدنگ آہ بے کساں کا نشانہ ہوا، ایک ابر تیرہ و تار آیا آدمی خوف زدہ دیکھنے لگے۔ اس ابر سے اژدہائے خوں خوار شعلہ فشاں آتش وہاں نکلا۔ ایک عورت اس پر سوار، وہ آتش بار، شہ زادے کے خیمے میں اتری۔ جان عالم نے پہچانا کہ وہی جادوگرنی ہے۔ دل سے کہا، شہر اپنا دور رہا، موت قریب آئی۔ قسمت نے کس جگہ لا کر نیرنگی دکھلائی۔ وہ بولی "جان عالم! کہو، اب کیا قصد ہے"۔ شہ زادے نے کہا۔ "وہی جو تھا"۔ اس نے کہا، اب وہ نقش سلیمانی اور لوح پیر مرد کی نشانی کہاں ہے؟ جس کے بھروسے پر کودتے تھے۔ اگر زندگی مع لشکر درکار ہے، تو ملکہ اور انجمن آرا سے انکار کرو، ہماری اطاعت اور محبت مقدم جان کر ہم سے دارو مدار کرو۔ نہیں تو میں ایک دم میں سب کو بے گور و کفن طعمۂ زاغ و زغن کر دوں گی۔ دشت لاشوں سے بھر دوں گی۔ شہ زادے نے کہا، ہمارے

لوحِ دل پر نقشِ ارادت حافظِ حقیقی، کلکِ قدرت سے منقش ہے۔ عادت سے مجبور ہوں، بے وفائی سے دور ہوں۔ جو کہا سو کہا۔ جو کیا سو کیا۔ اگر قضا آئی ہے، مرنے سے کیا چارہ ہے۔ مگر جیتے جی بات جانی کب گوارا ہے۔ یہ سن کر وہ جل گئی۔ غصّے سے رنگت بدل گئی۔ کچھ بڑبڑا کر جان عالم پر پھونکا۔ نصف پتھر تھا اب حلق تک ہو گیا۔ حسرت و یاس سینے میں بھری تھی۔ تصویر آذری سی پلنگڑی پر بے حس و حرکت دھری تھی۔ وہ تو اژدہے پر چڑھ کر اڑی اور پکاری، اے اجل رسیدہ! آج کے دن اور رات مہلت کی ہے۔ اگر صبح کو بھی انکار کیا، تو یاد رکھنا، لشکر کا خون اپنی گردن پر لیا۔ یہ سنا کر وہ تو ہوا ہوئی۔ جب تک شہ زادہ آدھا پتھر تھا تو ملکہ اور انجمن آرا اپنے اپنے خیموں سے گھبرا کر پکارتی تھیں۔ جان عالم جواب دیتا تھا۔ یہی آواز کا سہارا ان کی زیست کا سبب تھا۔ اب تا حلق پتھر ہونے سے وہ جرس قافلۂ گم کردۂ راہ دشت غربت، بے صدا ہو گیا۔ وہاں صبر کا راہ بر جدا ہو گیا۔ ہر چند دونوں چلائیں، شہ زادے نے مطلق جواب نہ دیا۔ بولا ہی نہ گیا۔ پھر ملکہ مہر نگار، با دل فگار سر پیٹ کر کہنے لگی۔

"فلک تو نے اتنا ہنسایا نہ تھا، کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا۔ مژدہ، اے مرگ غریب الوطنی! خوب حیلہ ہاتھ لگا۔ تو بد نامی سے بچی ہم نے ناکامی میں جان دی۔ چرخ ستم شعار رنگ لایا۔" انجمن آرا بے چاری، مصیبت کی ماری، سب کا منہ حیرت سے تکتی تھی اور روتی تھی۔ نہ بین کرنے آتے تھے، نہ غل مچایا جاتا تھا۔ گھٹ گھٹ کر جان کھوتی تھی۔ خواصیں سر کھول کر کہتی تھیں۔ ہے۔ ہے! ہم اس جنگل ویران میں لٹ گئے۔ وارث سے چھٹ گئے۔

تو وہ کریم ہے ناشاد کو جو شاد کرے　　مراد مند کو ہر طرح بامُراد کرے

لوگو! ہم کدھر جائیں۔ کیوں کر اس بلا سے نجات پائیں۔ کوئی کہتی تھی، شیطان کے کان بہرے۔ خدا نخواستہ اگر جان عالم کے دشمنوں کا رونگٹا میلا ہوا، شہزادیاں خاک میں مل جائیں گی۔ غم جدائی سے جانیں گنوائیں گی۔ ہم اُن کے ماں باپ کو منہ کیا دکھائیں گے۔ اس دشت ادبار میں سر ٹکرا کر مر جائیں گے۔

ایک طرف مغلانیاں غم کی ماریاں، دم گرم، آہ سرد بھرتی تھیں۔ ایک سمت انیسیں، جلیسیں نجف کی طرف بال کھول کر التجا سے گریہ و بکا سے یہ عرض کرتی تھیں۔ شعر

تم نے مدد کی نوحؑ کی طوفاں سے کشتی پار کی
یا مرتضےٰؓ مشکل کشا کیوں دیر میری بار کی

کوئی کہتی تھی۔ ہمارا لشکر اس بلا سے جو نکلے گا تو مشکل کشا کا کھڑا دونا[1] دوں گی۔ کوئی بولی، میں سہ ماہی کے روزے رکھوں گی، کونڈے بھروں گی۔ صحنک[2] کھلاؤں گی۔ دودھ کے کوزے بچوں کو پلاؤں گی۔ کسی نے کہا۔ میں اگر جیتی چھٹی جناب عباس کی درگاہ جاؤں گی، سقائے سکینہؓ کا علم چڑھاؤں گی۔

چہل منبری[3] کر کے نذر حسینؓ سبیل پلاؤں گی، غرضیکہ لشکر سے زیادہ خیموں میں تلاطم پڑا تھا۔ صدائے حزیں نالۂ پرغم گیں سے ہنگامۂ محشر بپا تھا۔ اتفاقاً ایک شاگرد ملکہ کے باپ کا رشیدۂ فن سحر میں دید نہ شنید، اس مرد بزرگ

---

[1] پھول اور شیرینی کا دونا　[2] رکابی　[3] چالیسویں کو چالیس قسم کا کھانا غریبوں کو تقسیم کرنا۔

کی ملاقات کو بردے ہوا اڑا جاتا تھا۔ یہ نالۂ بلند، صدائے ہر درد مند اس کے کان میں جو پہنچی زمین کی طرف متوجہ ہوا۔ دیکھا، تو ایک لشکر عظیم بہ حال سقیم سحر کا مبتلا ہے۔ شور و غل ہو رہا ہے۔ جب قریب تر آیا، طرفہ ماجرا نظر آیا، کہ انسان سے تا جانور سب آدھے پتھر ہیں۔ سمجھا کہ سحر شہپال میں خراب حال ہیں۔ لوگوں سے پوچھا۔ یہ ستم رسیدہ لشکر کس کا ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ وہ ملکہ مہر نگار کے ملازم تھے۔ اپنا حال سب نے بیان کیا۔ جب اسے یہ امر معلوم ہوا کہ استاد زادی کی خانہ بربادی ہے، در خیمۂ ملکہ پر آیا۔ سر پیٹتا چلا آیا۔ ملکہ نے آواز پہچانی۔ کہا بھائی اس وقت پردہ کہاں کا۔ یہاں آ کے تم بالمشافہہ ہمارا عذاب اور خراب حال دیکھو۔ وہ اندر آیا ملکہ کو بھی اسی عالم میں پایا۔ ملکہ نے فرمایا، عداوت ساحرہ سے ہمارا قافلہ تباہ ہے۔ وہ عرض کرنے لگا۔ مجھے اس کی ہم سری کی طاقت نہیں اور وقفہ کم۔ صبح سب کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ بجز آپ کے والد بزرگوار کے تشریف لائے یہ بلا ٹلتی نہیں۔ لو خدا حافظ و ناصر ہے۔ یہ کہہ کر بہ حال خستہ و تباہ، لب پر نالہ و آہ، اس تیز قدم سے چلا کہ ادہم[1] صبا کی ڈپٹ، ہر قدم پر نثار تھی۔ ٹھوکروں میں صرصر بے قرار تھی۔ پھر بھر میں وارد باغ ہوا، گل سا چاک گریباں، غنچے کی طرح خموش، شبنم نمط[2] اشک رواں پیر مرد نے فرمایا، خیر ہے۔ اس نے شمہ[3] گرفتاری جان عالم، ملکہ کی بے قراری، انجمن آرا کا الم لشکر کا حال ابتر کہہ کر عرض کی۔ جلد چلیے۔ اگر شام تک نہ پہنچے، وہاں صبح ہی دم سحر ملک الموت کا بازار گرم ہو گا۔ ارمان سب دل میں رہے گا۔ کشتوں کو عالم بے والی وارث کہے گا۔ کوئی گور و کفن نہ پائے گا۔ خاتمہ بالخیر ہو جائے گا۔

---

[1] سیاہ گھوڑا [2] شبنم کی طرح [3] ذراسی

پیر مرد نے آہ سرد بھر کر فرمایا! افسوس! شہزادے کو سب کچھ سمجھایا تھا مگر عمل میں نہ لایا۔ شعر

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

اسی دم شاہین تیز پرواز پر سوار ہوا۔ مغرب کی نماز لشکر میں داخل ہو کر پڑھی۔ پہلے جان عالم کے خیمے میں آیا۔ حال دیکھ کر سخت گھبرایا۔ پھر انجمن آرا کی جا کر تسکین کی۔ وہ رونے لگی۔ وہاں سے ملکہ کے پاس آ کے کہا، تمھاری بدبختی نے ہماری وضع میں فرق ڈالا۔ برسوں کے بعد باغ سے نکالا۔ ملکہ نے رو کر عرض کی، یہ وقت تدبیر ہے، نہ ہنگامۂ تعزیر۔ بعد رہائی اس آفت سماوی کے جو چاہنا، فرمانا۔

القصہ مجبور و ناچار، وہ عارفِ باوقار شہزادے کے خیمے کے نزدیک دور تک حصار کھینچ کر بیٹھا۔ یہ مرد بزرگ نیک صفات، فن سحر کے سوا عامل اسم ذات کا تھا۔ کچھ پڑھنے لگا۔ کبھی مناجات بدرگاہِ مجیب[۱] الدعوات کرنا کہ اے یاورِ زیردستان و سرفروکنندۂ[۲] گردن کشاں! اس بوڑھے کی شرم تیرے ہاتھ ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ اخیر وقت کا تو حافظ و نگہبان ہے۔ مجھ پر جو مشکل ہے تیرے روبرو آسان ہے۔ سفید داڑھی کو بدنامی کے وسمہ سے نہ رنگنا۔ تیرہ بختی کا دھبّا بایں ریش سفید نہ لگانا۔ شعر

مشکل ز توجہ تو آسان | آسان ز تغافلِ تو مشکل

جب کہ سجادہ نشین[۳] چرخ اوّل، با مجمع مریدان[۴] کواکب حجرۂ مغرب میں روپوش

---

۱ دعاؤں کا قبول کرنے والا ۲ سرکشوں کو ذلیل کرنے والا
۳ پہلے آسمان کا گدی نشین مراد چاند ۴ ستاروں کے مریدان مراد ستارے

ہوا اور طلسم مشرق سے نمودار باجوش وخروش ہوا اور وہ عبادت گذار پیر
جواں مرد، شب زندہ دار وظائف صبح سے فرصت پاچکا تھا، یکایک وہ نابکار
شیطان صفت ناپاک عورت اژدہے پر سوار بہ چشم خوں خوار بہ عزم قتل جان عالم
لشکر میں تنہا آئی۔ پہلے ملکہ کے باپ کے پاس گئی۔ آنکھیں لال لال، طیش کمال،
اور بہ آواز کرخت پکاری۔ اے مرد پیر! سست تدبیر! تیری اجل بھی دامن گیر
ہو کر کشاں کشاں اس دشت جاں فشاں میں لائی ہے۔ مجھے شرم آتی ہے، کہ تو
پیر نود سالہ ہو چکا ہے۔ بے مارے مر رہا ہے۔ تیرے قتل میں بدنامی چھٹ
فائدہ کیا ہے۔ جدھر سے آیا ہے سیدھا چلا جا۔ میں بہ یک نگاہ کج نشان لشکر
اس صفحۂ زمین سے مثل حرف غلط کارد[۱] سحر سے مٹائے دیتی ہوں۔

---

[۱] جادو کی چھڑی

دوسرا دور (غالب، سرسید اور ان کے ادبی رفقا)

اس کی ابتدا سرسید اور ان کے رفقائے کار [illegible] ان کا ذکر کرنے سے [illegible] تذکرہ ضرو[illegible] ہے جنھیں [illegible] ایک عظیم الشان ادبی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ غالب نے مروجہ طرز تحریر کو خیرباد کہہ کے نثر میں بے تکلفی، بے ساختگی، سادگی، شوخی و ظرافت اور روانی پیدا کی۔ جدید نثر اردو کی بنیاد دراصل غالب کے خطوط سے پڑتی ہے۔

سرسید کی سرکردگی میں مفلوج قومی زندگی میں جان ڈالنے اور اس کے تمام پہلوؤں میں اصلاح اور ترقی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ سرسید نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور ۱۸۷۲ء میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، جس نے قدیم اسکول کی شدید مخالفت کے باوجود سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی طرح ڈالی۔ رسالہ تہذیب الاخلاق نے اردو زبان اور ادب کی کیا خدمات کیں اس کا کچھ اندازہ سرسید کے اس مضمون سے ہوگا جو اس مجموعے میں شامل ہے۔

سرسید کے ادبی رفقائے کار میں ڈاکٹر ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، وقار الملک، محسن الملک، مولانا شبلی اور حالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں ویسے تو اور بھی بہت سے مشہور نام ملتے ہیں مگر بلحاظ خدمت سرسید کے بعد جن حضرات کا نام آتا ہے انھیں اردو نثر کے عناصر اربعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ ہیں آزاد۔ شبلی۔ حالی اور نذیر احمد ان میں ہر ایک صاحب طرز ہے اور اپنے رنگ میں منفرد۔ اردو کے تمام اسالیب بیان پر ان بزرگوں کے اسالیب کی گہری چھاپ ہے۔

محمد حسین آزاد آزاد خوش فکر، خوش گو اور لطیفہ سنج تھے۔ ان کے تذکرہ آب حیات اور دربار اکبری

اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ لقب، پہلے اسدؔ اور پھر غالبؔ تخلص کیا۔ مرزا غالب ۱۷۹۷ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ یہ ایبک ترک تھے اور سلسلۂ نسب سلجوقی سلاطین اور فریدون کی نسل سے ملتا تھا۔ سب سے پہلے ان کے دادا ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں ملازم ہوئے۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ نے ایک متلون زندگی بسر کی اور لکھنؤ اور حیدرآباد میں قسمت آزمائی کے بعد ریاست الور میں فوجی ملازمت کی اور وہیں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ مرزا اس وقت صرف پانچ برس کے تھے مگر ان کے چچا نصراللہ بیگ نے جو انگریزی سرکار کے جاگیردار اور فوج کے رسالدار تھے، بڑی شفقت سے اُن کی پرورش کی۔ چار برس بعد جب اُن کا انتقال ہوگیا تو سرکار نے جاگیر کے عوض کچھ پنشن مقرر کردی اور یہ ننہال میں رہنے لگے۔ تیرہ برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ دہلوی کی صاحب زادی سے اُن کی شادی ہوئی اور بعد شادی دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

مرزا کا سارا بچپن آگرہ میں گزرا، جہاں انھوں نے پہلے شیخ معظم اور کچھ مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں [illegible]

مزید مطالعہ کے لیے :۔ اردو کے اسالیب بیان ۔ از محی الدین زور
اردو کی کہانی۔ از احتشام حسین

سوالات

۱۔ جان عالم کے لشکر نے کہاں پڑاؤ کیا؟
۲۔ جادوگرنی نے جان عالم کو کس طرح دھوکا دیا؟
۳۔ انجمن آرا کے باپ کو کیسے خبر ہوئی اور اس نے رد سحر کی کیا تدبیر کی؟

مشقیں

۱۔۔۔ اس سبق سے ان جملوں کو چھانٹو جن کی عبارت مقفیٰ ہے۔ مسجع عبارتوں کی بھی مثالیں تلاش کرو۔

۲۔۔۔ ان مرکبات کی تشریح کرو۔

سحرانِ جادو نگار۔ مہرِ درخشاں۔ دشتِ ادبار۔ نصرت اثر۔ طعمۂ زاغ و زغن۔ نقشِ ارادت، چرخِ ستم شعار، ہنگامِ تعزیہ۔

۳۔۔۔ میر امن اور رجب علی بیگ سرور کے اسلوب بیان کا تقابلی جائزہ لو۔

۴۔۔۔ سبق میں آئے ہوئے ان ناموں پر غور کرو۔

صبح ۔ صحرا ۔ لشکر ۔ پلنگڑی ۔ رونگٹا ۔ سستی ۔ کلک ۔ آہ ۔ دودھ ۔

یہ سب اسم نکرہ ہیں ۔ صبح، اسم ظرف زماں ۔ صحرا، اسم ظرف مکاں ۔ لشکر، اسم جمع ۔ پلنگڑی، اسم مصغر ۔ رونگٹا، اسم مکبر ۔ سستی، اسم کیفیت ۔ کلک، اسم آلہ ۔ آہ، اسم صوت اور دودھ، اسم مادہ کی مثالیں ہیں ۔ تم سبق سے اس طرح کی اور مثالیں چھانٹو اور ان کو نیچے دیے ہوئے خانوں میں بھرو۔

<table>
<tr><th colspan="10">اسم عام یا اسم نکرہ کی مثالیں</th></tr>
<tr><th colspan="2">اسم ظرف</th><th rowspan="2">اسم جمع</th><th rowspan="2">اسم مصغر</th><th rowspan="2">اسم مکبر</th><th rowspan="2">اسم کیفیت</th><th rowspan="2">اسم آلہ</th><th rowspan="2">اسم صوت</th><th rowspan="2">اسم مادہ</th></tr>
<tr><th>مکاں</th><th>زماں</th></tr>
<tr><td></td><td></td><td></td><td></td><td></td><td></td><td></td><td></td><td></td></tr>
</table>

چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی، "سدھارو، تمھیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔" میں نے فاتحہ خیر پڑھ کر کہا۔ "تمھارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا۔" وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسا کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس پہنچا۔ غرض جب شہر کے دروازے پر گیا تو بہت رات جا چکی تھی۔ دربان اور نگہبانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی، مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں، اگر کواڑا کھول دو تو شہر میں جا کر دانہ گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے لوگ گھڑک کر بولے "اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔ کیوں اتنی رات گئے تم آئے۔" جب میں نے صاف جواب ان سے سنا تو شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے کے اوپر سے اتر زین پوش بچھا جاگنے کی خاطر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

مرزا غالب

اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ لقب، پہلے اسدؔ پھر غالبؔ تخلص کیا۔ ۱۷۹۶ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ دلی کے ایک معزز خاندان میں شادی ہوئی اور وہیں کے ہو رہے۔ قوم کے ایبک ترک تھے، آبائی پیشہ سپہ گری تھا مگر غالبؔ نے بجائے تلوار کے قلم ہاتھ میں لیا۔ استادوں سے باقاعدہ کم پڑھا تھا مگر طبع رسا اور ذوق سلیم نے رہ نمائی کی اور وہ فارسی اور اردو کے مسلم الثبوت استاد قرار پائے۔

مرزا کی ساری زندگی پریشان حالی اور مالی دشواریوں میں بسر ہوئی۔ مختلف جگہوں سے جو وظائف مقرر ہو جاتے تھے ان سے کام چلتا تھا مگر یہ آمدنی بھی مستقل نہ تھی۔ غالبؔ کے اشعار اور خطوط میں اکثر جگہ اس تلخ حقیقت کا اظہار ملتا ہے۔

اس تنگ دستی اور پریشاں حالی کے باوجود ان کا اخلاق وسیع تھا اور طبیعت میں زندہ دلی اور شگفتگی تھی۔ حالیؔ نے اسی لیے ان کو حیوان ظریف کہا ہے۔ وہ آزاد خیال اور آزاد مشرب تھے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔

مرزا صاحب کو فارسی سے خاص شغف تھا اور فارسی کلام ہی پر ان کو ناز تھا۔ اپنی اردو شاعری کو بے رنگ کہا کرتے تھے لیکن اردو ہی شاعری اور اردو ہی انشا پردازی نے غالبؔ کو غالبؔ بنایا۔ ان کا رنگ سارے ہم عصروں سے جدا ہے۔ خیال کی بلند پروازی، معانی کی ندرت اور شوکت الفاظ کے ساتھ ساتھ طرز ادا کی جدت ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔

غالبؔ نے اردو نثر میں بھی ایک نئی ادا نکالی اور اس کی سادگی میں وہ شان پیدا کی

کہ آج تک کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ سلاست و متانت، جدت اور بے ساختگی، شوخی و ظرافت، زبان و بیان کی دل کشی اور دل چسپی، وہ کون سی خوبی ہے جو ان کے خطوط میں نہیں ملتی۔ پھر مزہ یہ ہے کہ تحریر میں نہ تکلّف معلوم ہوتا ہے نہ تصنّع حالاں کہ بہ قدر ضرورت تکلّف و تصنّع سب کچھ ہے۔ وہ لکھتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں۔

نثر میں غالبؔ کی عظمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس دور کے عام مذاق اور رجحان کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ میر امّنؔ کی نثر کا نمونہ موجود تھا مگر اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ عام مذاق، نہایت رچی ہوئی مسجّع اور مقفّٰی زبان لکھنے کا تھا۔ ایسی حالت میں طرز ادا کا سیدھا سادھا اور بے تکلّف طریقہ نکالنا بڑے کمال کی بات تھی۔ سر سید جو اردو نثر کے بانی مبانی سمجھے جاتے ہیں ان کے اسلوب بیان پر غالبؔ کے طرز بیان کا گہرا اثر پڑا ہے۔

غالبؔ کے بعد بہت سے مشاہیر ادب نے خطوط لکھے اور وہ شائع بھی ہوئے مگر غالبؔ کے کمال کو کوئی نہ پا سکا۔

(۱)

میر مہدی مجروحؔ کے نام

نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو، بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا۔ تپ کو کیوں چڑھنے دیا۔ بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو مانع نہ آئے۔ کیا تپ ابن بن کر آئی تھی جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے۔ حکیم اشرف علی

بھی آ گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چوں کہ یہ خط بھی آج روانہ ہوتا ہے، کیا عجب ہے کہ دونوں خط ایک دن بلکہ ایک وقت پہنچیں۔ دل تمھارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے اور تمھاری تن درستی کی خبر مجھ کو سنائے۔

سنو میاں سرفراز حسین! ہزار برس میں تم نے مجکو ایک خط لکھا، وہ بھی اس طرح کا کہ جیسا جلالؔ اسیر کہتا ہے۔ ع بہ غیر دل نگراں است و رو بہا دارد (منہ ہماری طرف ہے اور دل کسی اور طرف متوجہ ہے) پڑھتا ہوں اس خط کو، اور ڈھونڈھتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے۔ مجھ کو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں، شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا، آغاز تحریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا! یہ کیا سیر ہے۔ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں۔ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا اور ہاں میاں! پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سنا ہے کہ پچیا نے "اس"، کا مرنا سنا ہوگا۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچوں بھانجیاں جو پانی پت میں ہیں، کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری۔ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے، تا کہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے۔ اب میں کس کا نام لے کر روؤں

اور کس کی فاتحہ دلواؤں۔ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔
توضیح بہ قید نام لکھو۔

ایضاً

(۲)

سید خدا کی پناہ۔ عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سرپر اٹھایا ہے ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے تم کو سرمایہ آرائش گفتار بہم پہنچا ہے میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔ بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوئی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔ مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک دستنبو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین مہربانی کے کلمات کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنسن[1] کے ملنے کا بھی حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر

---

[1] غالب نے اپنے خطوط میں پنسن ہی لکھا ہے۔

کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین صاحب کو دعا کہہ دینا اور یہ خط دکھانا۔

غالب

(۳)

یوسف مرزا کے نام

کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔ میاں میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سن لو۔ تفضل حسین خاں اپنے ماموں موید الدین خاں کے پاس میرٹھ ہے، شاید دلی آیا ہو۔ مگر میرے پاس نہیں آیا والدان کے غلام علی خاں اکبر آباد میں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں، لڑکے پڑھاتے ہیں، روٹی کھاتے ہیں۔ تم لکھتے ہو کہ پچاس محل واجد علی شاہ کے کلکتے گئے۔ تمہارے ماموں محمد قلی خاں خط میں لکھتے ہیں کہ شاہ اودھ بنارس آگئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے۔ ادھر سے آپ بنارس کو چلے ہوں، ادھر سے بیگمات کو وہاں بلایا ہو مگر میری جان ہم کو کیا۔ مصرع

عالم پس مرگ ما چہ دریا چہ سراب

(۴)

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی اور کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ چو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہ آتے رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو۔ صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

غالب۔ سوموار، ۷ دسمبر ۱۸۵۷ء

(۵)

منشی تفضل حسین خاں صاحب کے نام

کیوں صاحب، یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے

تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو، تم کو مبارک رہے، مجھ کو مستعار دو میں اس کو دیکھ لوں جو میرے پاس نہیں ہے، اس کی نقل کر لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح پر طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں یا مجھ کو آزار دینا اور ستانا بہ دل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ واللہ باللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت۔ اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفریں۔

---

(۴)

نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام

کیوں کر کہوں میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ یہ کیا ہوش مندی ہے؟ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم۔ سُن غالبؔ ہم تجھ سے کہتے ہیں، بہت مصاحب نہ بن۔ "ایاز قدر خود بشناس" مانا کہ تو نے کئی برس بعد رات کو نوبت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کرتا ہے، مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے۔ پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر۔ پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ۔ پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکر ادا کر اور یہ کہ جو میں تصوّر کر رہا تھا وہ ہوا یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا، اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا۔ معلوم ہوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائے گی۔ موسم اچھا آگیا ہے۔ اگر صرف تبرید، تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا، ورنہ بہ حسب رائے طبیب تنقیہ کرائیے۔ مجھ کو بھی آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مُسہل ہو گا۔ شب کو ناگاہ ایک زمین نئی خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی۔ غزل تمام کی۔ اسی وقت یہ خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیج دوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں اور میرے قبلہ جناب میر امجد علی صاحب کو سنا دیں اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں صاحب اور اُن کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے فقط۔

(۵)

میر مہدی حسین مجروحؔ کے نام

مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال، جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے ؎

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر دردؔ کا ہے۔ کل سے مجھ کو یہ کش بہت یاد آتا ہے۔ سو صاحب! تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں۔ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو، اور تو کچھ بن نہیں آتی مجھ سے خط پر خط لکھاتے ہو، آنسوؤں پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ لکھتا ہوں، دیکھو کیسا لکھتا ہوں۔

سنو! پنسن[1] کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال نہیں معلوم۔ دیر آید، درست آید بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تن درستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت نہ مجھ کو تہنیت، بلکہ اس طرح لکھا ہے کہ گویا ان کا تن درست ہونا تم ناگوار ہے، لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے، اُچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے یہ کیا غضب ہوا کہ یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں تم نے میرؔ کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں ؎

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانو   اگلے لوگوں میں اک بچا ہے یہ

---

[1] انگریزی میں پنشن بولا جاتا ہے مگر غالب نے ہر جگہ پنسن لکھا ہے۔

میر مہدی کے بھائی میر سرفراز حسین کے نام

نورِ چشم راحت جان میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں یا توانا ہیں یا ناتوان۔ بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے۔ شعر

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ　　یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے اور وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوا۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔ سنو غالب رونا پیٹنا کیا کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میرا میر مہدی کو پڑھاؤ اور میرن صاحب

احتمال ہے کہ اسی ماہِ ذیحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا میں بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

شعر

فرّخ آں روز کہ از خانہ زنداں بروم سوئے شہر خود ازیں وادیِ ویراں بروم

(۵)

میر مہدی کے بھائی میر سرفراز حسین کے نام

نورِ چشم راحت جان میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں یا توانا ہیں یا ناتوان۔ بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے۔ شعر

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے اور وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوا۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔ سنو غالب رونا پیٹنا کیا کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میرا میر مہدی کو پڑھاؤ اور میرن صاحب

کو بلاؤ۔ کل شام کو، پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت جاؤں گا۔ میں نے اُن کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے۔ اگر بھول نہ جائیں گے پہنچائیں گے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے صاحب ابن نہیں ہے نہ ہو۔ غلام اشرف نہیں ہے نہ ہو۔ اگر منظور کیجئے تو میں صوفی ہوں، ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں بموجب مصرع کے مصرع

دل بدست آور کہ حج اکبر است

تم سے کب انکار کرتا ہوں۔ اگر مرزا گوہر کی جگہ مالو تو خوش۔ اگر غلام اشرف جانو تو راضی۔ رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ۔ دن کو مجھ سے جی بہلاؤ۔ قصہ مختصر آؤ اور جلد آؤ۔ بیدالنور کا جو حال لکھتے ہو وہ سچ ہے۔ راجپوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں۔ مگر یہاں راجہ مسلمانوں کا دم بھرتے ہیں۔ دن جاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر وہاں آتے ہیں۔ کیا مجمع برہم ہوا ہے۔ مجھ کو کیسا غم ہوا ہے تم اس جرگے سے جدا ہو۔ تم کو اندیشہ کیا ہے۔ میر قربان علی صاحب جیسا لکھیں ویسا کرو۔ میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے مجھ کو دعا بھی نہ لکھی بھائی میری دعا پہنچے۔ میر نصیر الدین ایک دن میرے یہاں آئے تھے۔ اب میں نہیں جانتا یہاں ہیں یا وہاں۔ ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے۔ دعا سلام کی کیا حاجت۔ دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے بھلا دیکھیں تو سہی تم جانتے ہو کہ خط کس کا ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے :۔ یادگار غالب از حالی
مکاتیب غالب ، از عرشی رام پوری
ذکر غالب ۔ از مالک رام

سوالات

۱۔ غالب کے اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں؟
۲۔ چھٹے خط میں لفظ دیوانہ اور ہوش سے غالب نے کیا لطف بیان پیدا کیا ہے؟
۳۔ غالب نے عیش کی کیا تعریف کی ہے؟

مشقیں

۱۔ حالی نے غالب کو حیوان ظریف کہا ہے۔ ان خطوط سے ظرافت کی مثالیں چھانٹو۔
۲۔ غالب نے مخصوص کیفیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے مصرعے اور اشعار استعمال کیے ہیں۔ تم بھی کچھ اشعار اور مصرعے چن کر خطوط اور مضامین میں لکھو۔
۳۔ ان الفاظ پر غور کرو۔ خط، دعائیں، حکم، اطراف، لڑکے
یہ سب اسم نکرہ ہیں۔ ان اسموں سے چیز کا ایک یا زیادہ ہونا ظاہر ہوتا ہے اسے اسم کی تعداد کہتے ہیں۔ ہندی قاعدے سے ے، یں، وں اور اں لگا کر جمع بناتے ہیں۔
اردو میں عربی الفاظ کی جمع زیادہ تر اَفعال کے وزن پر آتی ہے اور واحد میں اٰت لگا کر بھی جمع بناتے ہیں۔
جیسے۔ لقب سے القاب، حکم سے احکام، عمل سے اعمال وغیرہ
عنایت سے عنایات، کلمہ سے کلمات، خیال سے خیالات، وغیرہ
اس کے علاوہ فارسی اور عربی الفاظ میں جمع بنانے کے بہت سے طریقے ہیں جن کا ذکر اگلے اسباق میں آئے گا۔

سرسید احمد خاں

سرسید جو انیسویں صدی کے زندہ جاوید مسلم رہ نما، قوم کے سب سے بڑے غم گسار اور اصلاح وتعلیم کے شیدائی تھے ۱۸۱۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔

ایک قدیم اور معزز خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ دستور زمانہ کے مطابق طرز قدیم پر تعلیم پائی مگر مسلمانوں میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم کے زبردست حامی بنے۔ حصول تعلیم کے بعد سرکاری ملازمت کی اور ترقی کرتے کرتے جج ہو گئے۔ اپنی قابلیت، کارکردگی اور غدر میں سرکار سے وفاداری کے عوض گورنمنٹ میں بڑی عزت پیدا کی۔

غدر میں مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور علوم وفنون کی طرف سے ان کی عام بے توجہی دیکھ کر ان کے دردمند دل کو ٹھیس لگی اور انھوں نے مسلمانوں کی علمی، اخلاقی اور معاشری پستی دور کرنے اور ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

سرسید کی اصلاحی کوششیں ہمہ جہت تھیں۔ "سائنٹفک سوسائٹی"، "تہذیب الاخلاق" کا اجرا اور علی گڑھ مسلم اورینٹل کالج کا قیام ان میں خاص ہیں۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے انگریزی کی مستند کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں اور ان کے ذریعے مغربی افکار وخیالات کی اشاعت ہوئی۔ تہذیب الاخلاق نے مضامین کے ذریعے معاشری اصلاح کی اور علی گڑھ کالج نے جو اب ایک اعلیٰ درجہ کی یونی ورسٹی ہے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم سے مسلمانوں کو روشناس کیا۔

پنشن کے بعد سارا وقت قومی کاموں میں صرف کرتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں انتقال کیا اور کالج کی مسجد ہی میں دفن ہوئے۔

تصنیف وتالیف کا شوق انھیں جوانی ہی سے تھا۔ ہم دردی کے جذبے نے

اصلاح قوم پر ابھارا تو ضرورت نے اس شوق کو اور چمکایا۔ عام و خاص سب مخاطب تھے اس لیے پرانی پر تکلف اور رچی ہوئی انشا پردازی کو چھوڑا اور سادہ نویسی اختیار کی۔ مضامین میں وہی لکھا ہے جو وہ منہ سے بولتے یا تقریر میں زبان سے کہتے تھے۔ ان کی تقلید میں ان کے سب ادبی رفقا نے یہی روش اختیار کی اور اردو نثر تکلف و تصنع کی قید سے آزاد ہو کر مدعا نگار ہو گئی۔ غالب نے جو زبان صرف نجی خطوط میں استعمال کی تھی وہ علمی اور ادبی زبان بن گئی۔ حالیؔ نے سرسید کو اردو نثر کا مورث اعلیٰ کہا ہے۔

سرسید ایک ہمہ گیر شخصیت اور کردار کے مالک تھے۔ وہ ایک زبردست مصنف، بلند خیال مفکر، جلیل القدر مصلح اور ہوش مند مدبر تھے۔ دنیا کی برگزیدہ ہستیوں کی طرح ان میں بھی ایک مقناطیسی کشش تھی جو شدید مخالفتوں کے باوجود لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتی تھی۔

انیسویں صدی کے آخری نصف میں مسلمانوں نے انحطاط و پستی کے قعر مذلت سے نکلنے کی جو کوششیں کیں ہیں وہ سب سرسید کی رہبری کا نتیجہ تھیں۔

(۱)

نوروز

(یہ اقتباس سرسید کے طرز تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسی غرض سے اس کا انتخاب کیا گیا ہے۔ سرسید نے قومی اصلاح کے لئے "تہذیب الاخلاق" نام کا ایک اخبار نکالا تھا۔ اس پرچے کے ذریعے قوم میں بیداری کی علامت کیسے پیدا ہوئی اس کا بیان اس اقتباس میں ہے۔

سوا چار برس بخیریت گذر گئے۔ اب پھر نیا سال شروع ہوا۔ گذشتہ برسوں میں جو کچھ ہنگامے ہونے تھے ہو لیے۔ اب دُم باقی رہ گئی ہے۔ چاند کی بڑھیا کی کہانی ہے کہ ہاتھی نکل گیا پر دم باقی ہے۔ آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں تو بھی بجا ہے اور اگر اپنی قوم کے اقبال کی فصل کی آمد آمد کی خوشیاں منائیں تو بھی زیبا ہے۔ جو کچھ کہ اس سوا چار برس میں ہوا، کیا ایسے قلیل زمانے میں اس کے ہونے کی ہم کو توقع تھی۔ توبہ توبہ! کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں[1] سے اپنی قوم کے جگانے اور اٹھانے کی جو مدت دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی بے خبر سو رہی تھی، توقع تھی۔ استغفر اللہ!

وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۲۸۷ھ نبوی اور ۱۲۸۷ھ ہجری جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا، امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جاوے گا۔ ہماری قوم کی جو کچھ بداقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کی دارو بے ہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا۔ دل پتھر ہو گئے تھے۔ دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سست ہو گئے تھے۔ زندہ تھے پر مردوں سے بدتر تھے۔ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے تھے، پر کچھ نہ کرتے تھے۔ اسی تھوڑے عرصے میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔

---

[1] تہذیب الاخلاق کی طرف اشارہ ہے۔

کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے۔ لبوں پر جان ہے۔ پھر اگر جان نہیں تو جہان نہیں۔ کچھ لوگ ہوشیار ہوئے۔ پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں۔

بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑ جما ہوا ہے۔ کچھ کھلتی ہیں مگر روشنی سے چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ جب پھر جھنجھوڑو تو ہاں، اچھا کہہ کر دوسری کروٹ لیتے ہیں اور پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ ہوشیار ہوئے ہیں مگر بد مزاجی اور تند خوئی سے ضد میں آکر کمل تانے پڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں اٹھنے کے، تمھارا کیا اجارہ ہے، ہم یوں ہی پڑے رہیں گے۔ بعضے ان میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے رہو مت اٹھو۔ سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے؟ ہم اسی بات کو سن کر خوش ہوتے ہیں اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اٹھے، وہ کلبلائے، خدا نے چاہا تو اب سمجھ دار بھی ہو جاویں گے۔ یہی رست و خیز ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی، اب کسی نہ کسی طرف بہ نکلے گا۔ لوہا پگلا تو سہی، اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا۔ بند پانی سے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہیے۔ پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنالے گا۔ اس ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت اچھی نہیں۔

قوم کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں، جان نہیں ڈال دیتی ہے؟ سولزیشن جس کے نام سے لوگوں کو نفرت تھی کیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچے میں نہیں ہے۔ کیا نیچر کا قافیہ کیچڑ کہتے ہوئے اب لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے (معاف کیجیے ان ضدی سونے والوں کا ذکر نہیں ہے) کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے۔ کیا چار دانگ ہندوستان کے اخباروں میں تہذیب، تہذیب، سولزیشن، سولزیشن، قومی ہمدردی، پیٹریاٹزم، پیٹریاٹزم کا غلغلہ نہیں ہے۔ کوئی اخبار اٹھاؤ اس میں۔ ان میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل دیکھ لو۔ جس گلی کوچے میں جاؤ سید احمد کے تہذیب الاخلاق کا جھگڑا سن لو۔ مکہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ مدینہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ برا کہو خواہ بھلا کہو، مگر ہم دعا گوؤں کو مت بھولو ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ ولولہ اور غلغلہ اور ہر ایک بات کا چرچا دراصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے کہ کسی کی کیا رائے ہے اور کسی کی کیا۔ کیوں کہ جو بات ٹھیک نہیں ہے وہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں سب کو معلوم ہو جاوے گی اور سب اسی پر یقین کریں گے اور اسی پر متفق ہوں گے۔ ضرور ایک دن آوے گا جو قوم کہے گی کہ ہاں سید احمد بھی کوئی دیوانہ تھا، پر بات ٹھکانے کی کہتا تھا۔ اگر ہمارا یہ خیال

صحیح ہو اور درحقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آگئی ہو، تو ہمارے اس ناچیز پرچے نے اپنا کام پورا کر لیا اور اس کی مراد پوری ہو گئی۔

(۲)

بحث و تکرار

(سرسید اور ان کے رفقا اس پرچے میں مختلف قسم کے علمی، مذہبی اور معاشری موضوعات پر قلم اٹھایا کرتے تھے۔ خود سرسید نے بہت سے مضامین ایسے لکھے ہیں جن کا تعلق تہذیب کی ترقی اور اخلاق و معاشرت کی اصلاح سے تھا۔

اس مضمون سے اندازہ ہوگا کہ سرسید اخلاقی مضامین پر کتنے مدلل مگر دل نشین اور سادہ پیرائے میں اظہار خیال کرتے تھے)

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں، تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ پھر ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور "عنیف اعنیف!!

آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا، جو کم زور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اس طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے "واہ! یوں نہیں، یوں ہے"۔ وہ کہتا ہے، "واہ! تم کیا جانو"۔ وہ بولتا ہے، "تم کیا جانو"۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ، عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ "عنیف! عنیف!!" آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں، اور اس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں، لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا، تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ کرنے والا نہ ہوا، تو کم زور نے پٹ کر، کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے، اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے، اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔

کہیں عرفش ہوکر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے، اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذرتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔

پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث وتکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث ومباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثے اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب وشائستگی محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

پس، اے میرے عزیز ہم وطنو!

جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو، یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دوبدو بات چیت کرتے ہو، تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو، مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔

تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو مثلاً یہ کہ ”میری سمجھ میں نہیں آیا“، یا ”شاید مجھے دھوکا ہوا“، ”میں غلط سمجھا“۔

گو بات تو عجیب ہے، مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں"۔

جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے، تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ "میں بات کو پھر سوچوں گا"، یا اس پر پھر خیال کروں گا، جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کر دو۔

دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمھارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے، اور نہ تمھارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔

کیوں کہ جھگڑا یا شبہہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز جیسی کہ دوستی ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب تم مجلس میں ہو، جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں، تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو۔

کیوں کہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے، تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔

جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے، تو جس قدر جلد ممکن ہو، اس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کا مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے؟

مولانا محمد حسین آزاد

مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے، ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اورنیٹل کالج میں پڑھا اور استاد ذوقؔ کے سایۂ شفقت میں تربیت پائی۔

مولانا آزاد کے والد غدر میں شہید ہوئے اور انھیں تلاش معاش میں ادھر ادھر بھٹکنا پڑا۔ بالآخر لاہور پہنچے اور یہاں مختلف اداروں میں کام کرتے رہے۔ وہاں ان کے جوہر علمی کو نکھرنے کا موقع ملا اور انھوں نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔

مولانا کی کوشش سے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا جس کی بہ دولت پنجاب میں اردو کو بہت فروغ ملا۔ اس انجمن کی طرف سے کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ایک خاص طرز کے مشاعرے کی بنا ڈالی گئی جس کا ذکر مولانا حالیؔ کے سوانح حیات کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ مولانا آزادؔ اور حالیؔ اس مشاعرے کے لیے جو نظمیں کہتے تھے ان سے اردو شاعری کے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔

اس بیان سے اندازہ ہوگا کہ مولانا آزاد شاعری بھی کرتے تھے۔ مگر انھوں نے جو نام پایا وہ اپنی انشاپردازی سے پایا شعر و شاعری سے نہیں۔ کہنے کو ان کی نثر، نثر ہے مگر اس میں نظم کا لطف آتا ہے۔

مولانا آزادؔ اردو زبان اور السنۂ مشرقیہ کے بہت بڑے ماہر اور محقق تھے۔ عربی و فارسی کے متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی ادب کے محاسن اور نکات کو بھی سمجھ لیتے تھے، مگر ان کی شہرت کی بنیاد ان کی انشاپردازی پر ہے جس کا آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا۔

مزید مطالعہ کے لیے :۔ مضامین سرسید از عزیز الدین اختر
ارباب نثر اردو از محی الدین زور

سوالات

۱۔ پہلے سبق کا عنوان "نوروز" کس لحاظ سے رکھا گیا ہے؟
۲۔ تہذیب الاخلاق سے قوم میں کیسے بیداری پیدا ہوئی؟
۳۔ نامہذب آدمیوں میں تکرار کس طرح ہوتی ہے؟
۴۔ سرسید نے بحث کرنے کے کون سے مہذب طریقے بتائے ہیں؟

مشقیں

۱۔ سرسید کی انشا پردازی کی جن خصوصیات کا تذکرہ تبصرہ میں کیا گیا ہے ان کی مثالیں ان مضامین سے تلاش کرو۔
۲۔ "یہی رست وخیز ہماری قوم کے اقبال مندی کی نشانی ہے"۔ اس مقولہ کی وضاحت کرو
۳۔ سرسید کے دوسرے مضمون کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تیار کرو۔
۴۔ مندرجہ ذیل مرکب الفاظ اور محاورں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔
تندخوئی، رست خیز، شرم آنا، چاردانگ، باچھیں کھلنا، نامہذب، تیوری چڑھنا
۵۔ اسم کی قسمیں اور تعداد کے بارے میں تم پڑھ چکے ہو۔ جنس کے اعتبار سے اسم کی تین صورتیں مذکر، مونث، اور مشترک ہوتی ہیں۔
جان دار چیزوں میں نر کو مذکر اور مادہ کو مونث کہتے ہیں۔ بے جان چیزوں میں یہ دیکھتے ہیں کہ اہل زبان انھیں کس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے بر جیل، مکھی، تم ان مضامین میں سے تجنیس کی مثالیں دریافت کرو۔

گو بات تو عجیب ہے، مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔"

جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے، تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ "میں بات کو پھر سوچوں گا" یا اس پر پھر خیال کروں گا، جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کردو۔

دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے، اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔

کیوں کہ جھگڑا یا شبہہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز جیسی کہ دوستی ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب تم مجلس میں ہو، جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں، تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو۔

کیوں کہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے، تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔

جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے، تو جس قدر جلد ممکن ہو، اس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کا مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے؟

مولانا محمد حسین آزاد

مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے، ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اورنٹیل کالج میں پڑھا اور استاد ذوقؔ کے سایۂ شفقت میں تربیت پائی۔

مولانا آزاد کے والد غدر میں شہید ہوئے اور انھیں تلاشِ معاش میں ادھر ادھر بھٹکنا پڑا۔ بالآخر لاہور پہنچے اور یہاں مختلف اداروں میں کام کرتے رہے۔ وہاں ان کے جوہرِ علمی کو نکھرنے کا موقع ملا اور انھوں نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔

مولانا کی کوشش سے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا جس کی بہ دولت پنجاب میں اردو کو بہت فروغ ملا۔ اس انجمن کی طرف سے کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ایک خاص طرز کے مشاعرے کی بنا ڈالی گئی جس کا ذکر مولانا حالیؔ کے سوانح حیات کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد اور حالیؔ اس مشاعرے کے لیے جو نظمیں کہتے تھے ان سے اردو شاعری کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔

اس بیان سے اندازہ ہوگا کہ مولانا آزاد شاعری بھی کرتے تھے۔ مگر انھوں نے جو نام پایا وہ اپنی انشا پردازی سے پایا شعروشاعری سے نہیں۔ کہنے کو ان کی نثر، نثر ہے مگر اس میں نظم کا لطف آتا ہے۔

مولانا آزاد اردو زبان اور السنۂ مشرقیہ کے بہت بڑے ماہر اور محقق تھے۔ عربی و فارسی کے متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی ادب کے محاسن اور نکات کو بھی سمجھ لیتے تھے، مگر ان کی شہرت کی بنیاد ان کی انشا پردازی پر ہے جس کا آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا۔

انھوں نے اردو کے سادہ جامہ کو فارسی کے ہلکے سے خوش نما رنگ میں رنگ دیا ہے اور رہر الفاظ کی بندش، فقروں کی ساخت، زبان کی شیرینی اور طرزادا کی بوقلمونی سے ایک نگار خانہ ایسا سجایا ہے کہ اہل نظر دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔

مولانا کی تمام تصانیف میں یہی رنگ غالب ہے، خواہ ان کا تعلق تنقیدی اور تاریخی موضوع سے ہو یا تخئیلی اور تمثیلی مضامین سے۔

آپ کی تصانیف میں آب حیات، نیرنگ خیال، دربار اکبری اور سخن دان پارس بہت مشہور ہیں۔

(آب حیات' مولانا کا ادبی شاہ کار ہے اور تاریخ تنقید میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ نیرنگ خیال ان کے تمثیلی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مولانا نے اردو میں تمثیل نگاری کی بنیاد ڈالی "دربار اکبری" تاریخی کتاب ہے مگر اس میں ادب کا لطف آتا ہے۔

(۱)

اکبر کا دربار

(یہ اقتباس مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب دربار اکبری سے منقول ہے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ مولانا تاریخ کے خشک مضمون میں بھی اپنے اسلوب بیان سے کتنی دل کشی پیدا کر دیتے تھے)

اکبر اگرچہ ترک تھا، مگر اس نے ہندوستان میں آ کر ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے جو اپنایت پیدا کی، وہ ایک صنعت کیمیائی ہے

کہ کتابوں میں لکھنے کے قابل ہے اور یہ بھی ایک تمہید پر منحصر ہے۔ واضح ہو کہ جب ہمایوں ایران میں گیا اور شاہ طہماسپ سے ملاقات ہوئی تو ایک دن دونوں بادشاہ شکار کو نکلے۔ کسی مقام پر تھک کر اُتر پڑے۔ شاہی فراش نے اکڈّہ تہ غالیچہ ڈال دیا۔ شاہ بیٹھ گئے ہمایوں کے ایک زانو کے نیچے فرش نہ تھا، اس عرصے میں کہ شاہ اکڈّیں اور غالیچہ کھول کر بچھائیں، ہمایوں کے ایک جاں نثار نے جھٹ اپنے تیردان کا کارچوبی غلاف چھری سے چاک کیا اور اپنے بادشاہ کے نیچے بچھا دیا۔ شاہ طہماسپ کو اس کی یہ پھرتی اور ہوا خواہی پسند آئی اور کہا کہ برادر ہمایوں! تمھارے ساتھ ایسے ایسے جاں نثار نمک حلال تھے اور پھر ملک اس طرح ہاتھ سے نکل گیا، اس کا کیا سبب ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ بھائیوں کے حسد اور عداوت نے کام خراب کر دیا۔ نمک خوار نوکر ایک آقا کے بیٹے سمجھ کر کبھی ادھر ہو جاتے تھے کبھی ادھر۔ شاہ نے کہا۔ کیا ملک کے لوگوں نے رفاقت نہ کی؟ ہمایوں نے کہا کہ کل رعایا غیر قوم، غیر مذہب ہیں اور خود ملک کے اصلی مالک ہیں، ان سے رفاقت ممکن نہیں۔ شاہ نے کہا "ہندوستان میں دو فرقے کے لوگ بہت ہیں۔ ایک افغان، دوسرے راج پوت۔ خدا کی مدد شامل حال ہو، اب کی دفعہ وہاں پہنچو تو افغانوں کو تجارت میں ڈال دو اور راج پوتوں کو دلاسا اور محبت کے ساتھ شریک حال کرو"

ہمایوں جب ہندوستان میں آیا تو اسے اجل نے امان نہ دی اور اس تدبیر کو عمل میں نہ لاسکا۔ البتہ اکبر نے کیا اور خوب طور سے کیا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ گیا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے۔ مجھے اس ملک میں خدا نے بادشاہ کر کے بھیجا ہے۔ ملک گیری اور تسخیر کی حالت میں ممکن ہے کہ ملک کو تلوار کے زور سے زیر کیا اور اہل ملک کو ویران کر دیا، ملک والوں کو دبا لیا، لیکن جب کہ میں کسی گھر میں رہنا اختیار کروں تو یہ ممکن نہیں کہ ان کے ملک کے کل فوائد اور آرام، میں اور میرے امرا اٹھائیں اور ملک والے ویران اور پریشان رہیں اور پھر میں آرام سے بیٹھ سکوں اور یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ انھیں بالکل فنا کر کے نیست و نابود کر دوں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرے باپ پر چچاؤں کے ہاتھ سے کیا گزری۔ چچاؤں کی اولاد اور ان کے نمک خوار موجود ہیں اور جو ہم قوم ترک اس وقت میرے ساتھ ہیں یہ ہمیشہ دودھاری تلوار ہیں۔ جدھر فائدہ دیکھا ادھر پھر گئے۔ غرض جب اس نے ملک کو آپ سنبھالا تو ایسا ڈھنگ ڈالا، جس میں خاص و عام اہل ہند یہ نہ سمجھیں کہ غیر قوم ترک، غیر مذہب مسلمان، کہیں سے آ کر ہم پر حاکم ہو گیا ہے۔ اس لیے ملک کے فوائد و منافع پر کوئی بند نہ رکھا۔ اس کی سلطنت ایک دریا تھا کہ جس کا کنارہ ہر جگہ سے گھاٹ تھا۔ آؤ سیراب ہو جاؤ۔ دنیا میں کون ہے کہ جان رکھتا ہوا اور دریا کے کنارے پر نہ آئے۔

جب ملک گیری نے بہت سے معرکے طے کردیے اور رونق وزیبائی کو اس کا دربار سجانے کا موقع ملا، ہزاروں راجا، مہاراجا، ٹھاکر سردار حاضر ہونے لگے۔ درباران جواہر کی پتلیوں سے جگمگا اٹھا۔ عالی ہمت بادشاہ نے ان کے اعزاز اور مدارج کا بڑا لحاظ رکھا۔ وہ اخلاق کا پتلا تھا۔ ملنساری اس کی طبیعت میں داخل تھی۔ ان سے اس طرح پیش آیا کہ سب کو آیندہ کے لیے بڑی بڑی امیدیں ہوگئیں۔ بلکہ جو ان کا ساتھی ہوکر آیا اس سے اس طرح پیش آیا کہ ایک عالم ادھر کو جھک پڑا۔ پنڈت کبیشر، گنی گنوان ہندوستان کے جو آئے اس طرح خوش نکلے کہ شاید اپنے راجاؤں کے دربار سے بھی اس طرح نہ نکلتے ہوں گے۔ ساتھ ہی سب کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ برتاؤ اس کا ہمارے پھسلانے کے لیے نہیں بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم کو اپنا کرے اور ہمارا ہو رہے اور اس کی سخاوتیں اور دن رات کے کاربار اور اپنایت کے برتاؤ اس خیال کی ہر دم تصدیق کرتے تھے۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم قوم اور غیر قوم کا فرق اصلا نہ رہا۔ سپہ داری اور ملک داری کے جلیل القدر عہدے ترکوں کے برابر ہندوؤں کو ملنے لگے۔ دربار کی صف میں ایک ہندو ایک مسلمان، دو مسلمان ایک ہندو برابر نظر آنے لگے۔ راج پوتوں کی محبت، ان کی ہر بات کو بلکہ ریت رسوم اور لباس کو بھی اس کی آنکھوں میں خوش نما دکھانے لگی۔ چغے اور عمامے کو اتار کر جامہ اور کھڑکی دار پگڑی اختیار

کر لی۔ داڑھی کو رخصت کر دیا۔ تخت و دیہیم کو چھوڑ کر سنگھاسن پر بیٹھنے اور ہاتھی پر چڑھنے لگا۔ فرش و فروش سواریاں اور دربار کے سامان آرایش سب ہندوانی ہونے لگے۔ ہندو اور ہندوستانی لوگ ہر وقت خدمت گزاری میں حاضر۔ جب بادشاہ کا یہ رنگ ہوا تو اراکین و امرا ایرانی تورانی سب کا وہی لباس اور وہی دربار۔ پان کی گلوری اس کا لازمی سنسکار ہو گیا۔ ترکوں کا دربار اندر سبھا کا تماشا تھا۔

نوروز کا جشن ایران و توران کی رسم قدیم ہے مگر اس نے ہندوانی ریت رسوم کا رنگ دے کر اس کو بھی ہندو بنا یا۔ ہر سال گرہ پر جشن ہوتا تھا۔ شمسی بھی، قمری بھی۔ ان میں تلادان کرتے تھے، سات اناج، سات دھات وغیرہ میں تلتے تھے۔ برہمن بیٹھ کر ہون کرتے تھے اور اور سب کی نفریاں باندھا اسیسیں دیتے گھر کو لے جاتے۔ دسہرا کو آتے، آشیر بادیں دیتے، پوجا کرواتے۔ ماتھے پر ٹیکا لگاتے، جواہر اور مروارید سے مرصّع راکھی ہاتھ میں باندھتے۔ بادشاہ ہاتھ پر باز بٹھاتے، قلعے کے برجوں پر شراب رکھی جاتی۔ بادشاہ کے ساتھ اہل دربار بھی اس رنگ میں رنگے گئے اور پان کے بیڑوں نے سب کے منہ لال کر دیے۔ گائے کا گوشت، پیاز، لہسن اور بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال ہو گئیں۔ صبح کو روز جمنا کے کنارے شرق رویہ کھڑکیوں میں بیٹھتے تھے کہ پہلے آفتاب کے درشن ہوں۔ ہندوستان کے لوگ صبح کو بادشاہ کے دیدار کو بہت مبارک سمجھتے تھے۔ جو لوگ

دریا پر اشنان کو آتے تھے، مرد، عورتیں، بچے ہزار دو ہزار سامنے آتے تھے ڈنڈوتیں کرتے، مہابل بادشاہ سلامت کہتے اور خوش ہوتے وہ اپنے بچوں سے زیادہ انھیں دیکھ کر خوش ہوتا اور خوشی بھی بجا تھی۔ جس کے دادا (بابر) کو اپنی قوم (ترک) اس تباہی کے ساتھ اس کے موروثی ملک سے نکالے اور پانچ چھ پشت کی بندگی پر خاک ڈالے، یہ غیر قوم غیر جنس ہو کر اس محبت سے پیش آئیں، ان سے زیادہ عزیز کون ہوگا؟ اور وہ ان کے دیکھنے سے خوش نہ ہوگا تو کس سے ہوگا؟

اکبر نے سب کچھ کیا مگر راج پوتوں نے کبھی وفاداری کو حد سے گذار دیا۔ یہ سیکڑوں میں سے ایک بات ہے کہ جہاں گیر نے بھی تزک میں لکھی ہے۔

"اکبر نے رسوم ہند کو ابتدا میں فقط اس طرح اختیار کیا گویا غیر ملک کا تازہ میوہ ہے یا نئے ملک کا سنگار ہے، یا یہ کہ اپنے پیاروں اور پیار کرنے والوں کی ہر بات پیاری لگتی ہے۔

اردو شاعری کے پانچ دور

(جہاں تک خالص انشا پردازی اور الفاظ سے طلسم باندھنے کی بات ہے مولانا محمد حسین آزاد اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی انشا پردازی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کی مشہور تصانیف 'آب حیات' نیرنگ خیال اور دربار اکبری کا مطالعہ ضروری ہے۔)

پہلا دور۔ نظم اردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آکر ایسی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اثر اس کا دفعتہً حرارت برقی کی طرح دل میں دوڑ گیا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا ہے۔ جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے۔ ان بزرگوں کی باتیں تو ان کے شعروں سے بھی سن سکتے ہو مگر حیران ہوں کہ صورت کیوں کر دکھادوں۔ اول تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل۔ اس پر میں زبان کا اپاہج۔ اس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں جو ایسے لوگوں کی جیتی، جاگتی، بولتی چالتی تصویر کھینچ کر دکھاؤں، کہ ادب کی نگاہ ان کی متانت پر سے نظر نہیں اٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ ان کی پیاری حالت پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکتی۔

دیکھو! جلسہ مشاعرے کا امرا و شرفا سے آراستہ ہے۔ معقول معقول بڈھے اور جوان ___ لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں،

عہ اس دور کے مشہور شعرا حسب ذیل ہیں۔ ولی اللہ ولی۔ شاہ مبارک آبرو۔ شیخ شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی۔ محمد احسن احسن۔ غلام مصطفیٰ خاں یک رنگ

باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی کٹاری باندھے ہے، کوئی سیف لگائے ہے، بعض وہ کہن سال ہیں جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے، بعض ایسے ہیں کہ عالمِ جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا، اب کیوں کر رکھیں، کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔ ان شوخیوں سے انھیں کچھ اور مطلب نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں اور اوروں کو خوش کریں۔

اس دور میں ولیؔ تو مجلس کی شمع ہیں اور اہل مجلس، دلیؔ اور دکن کے شریف و نجیب، فصیح زبان ہیں کہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس روشنی سے دیکھتے ہیں۔ ان کی زبان ایک ہی سمجھنی چاہیے۔ مگر ولیؔ نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظِ ذو معنیین سے اتنا کام نہیں لیا۔ خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیوں کر ہو گیا۔ شاید دوہروں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سبزۂ خود رو تھا، اس نے اپنا رنگ دیا۔ اگرچہ ولیؔ کے بعد دلی میں سیکڑوں صاحب طبع دیوان بنانے پر کمر بستہ ہو گئے مگر میں اس مشاعرے میں چند ایسے بزرگوں کو لاتا ہوں جن کے ناموں پر اس وقت کے معرکوں میں استادی کا چتر شاہی سایہ کئے تھا اور غالباً اس زبان کا نمونہ، شعر کا انداز دکھانے کو اس قدر کافی ہوگا۔ ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں۔ جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں خیالات گزرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اینچ پینچ کے خیال، دور دور کی تشبیہیں، نازک استعارے نہیں بولتے اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں اور یہ دلیل

ہے اس بات کی کہ ہر ایک زبان اور اس کی شاعری، جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے تب تک بے تکلف، عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے۔ اسی واسطے لطف انگیز ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے محاورات قدیمی اور مضمون بھی اکثر سبک اور مبتذل ہوں گے۔ مگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگتی ہے جیسے ایک حسن خداداد ہو کہ اس کی قدرتی خوبی ہزاروں بناؤ سنگار کا کام کر رہی ہے۔ میں خود نہیں کہتا۔ فلاسفۂ سلف کا قول سنتا ہوں کہ ہر شے اپنی مختلف کیفیتوں میں خوب صورتی اور بدصورتی کا ایک عالم رکھتی ہے۔ پس انسان وہی ہے کہ جس پیرائے میں خوب صورتی، جوبن دکھائے یہ اس سے کیفیت اٹھائے، نہ کہ فقط حسینوں کے زلف و رخسار میں پریشان رہے۔ خوش نظر اسے نہیں کہتے کہ فقط حسینوں کے زلف و رخسار میں پریشان رہے۔ خوش نظر اسے نہیں کہتے کہ فقط گل و گلزار ہی پر دیوانہ پھرے۔ نہیں! ایک گھاس کی پتی، بلکہ سڈول کانٹا خوش نما ہو تو اس کی نوک جھونک پر بھی پھول ہی کی طرح لوٹ جائے۔

دوسرا دور[۱]

دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس فصل میں زبان کے حسن قدرتی کے لیے موسم بہار ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ مضامین کے پھول گلشن فصاحت میں، اپنے قدرتی جوبن دکھا رہے ہیں۔ حسن قدرتی کیا شے ہے؟ ایک لطف خداداد ہے جس میں بناؤ سنگار کا

۱؎ اس دور کے مشہور شعرا حسب ذیل ہیں:۔ شاہ حاتم۔ شاہ تسلیم۔ سعادت یار خاں رنگین۔ محمد امان نثار۔ میاں ہدایت۔ خان آرزو۔ اشرف علی خاں فغاں۔

نام آجائے تو تکلف کا داغ سمجھ کر سات سات پانی سے دھوئیں۔ ان کا گل زار نیچر کی گل کاری ہے۔ صنعت کی دست کاری یہاں آکر قلم لگائے تو ہاتھ کاٹے جائیں۔ اس میں تو کلام نہیں کہ یہ باکمال بھی ایک ہی شہد کی مکھی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے، جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں۔ خیالی رنگوں کے طوطے مینا نہیں بناتے۔ ہاں! طوطی و بلبل کی طرح زبان صاف اور قدرتی الحان لائے ہیں۔ انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری، اپج، پلٹی، تان کسی گویّے سے لے کر نہیں ڈالی۔ تم دیکھنا، بے تکلف بولی اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے اور جب تک سننے والے سنیں گے، کلیجے پکڑ کر رہ جائیں گے۔ اس کا سبب کیا؟ وہی بے ساختہ پن، جس کے سادہ پن پر ہزار ہا بانکپن قربان ہوتے ہیں۔

ع ہے حسن وہی جس میں بے ساختہ پن نکلے

ان کی اصلاح نے بہت سے لفظ ولیؔ کے عہد کے نکال ڈالے مگر پھر بھی، "بھلّا رے" اور "دھیرے دھیرے" اور "مرے ہے" (بجائے مرتا ہے) اور "دوانہ" (بجائے دیوانہ) اور "میاں"، اور فقط "جان" کا لفظ (بجائے معشوق) موجود ہے۔ متاخرین اس کی جگہ "جان جاں" یا "جاناں" یا "یار" یا "دوست" یا "دل بر" وغیرہ وغیرہ بولنے لگے مگر "موہن"، دَورِ دوم میں نہ رہا۔ "سجن" رہا اور "بل گیا" یعنی جل گیا اور "بل گیا"، یعنی صدقے گیا اور "من"، بجائے دل بھی ہے۔

سید انشا ایک جگہ بعض الفاظ مذکورہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ اس عہد کی گفتگو میں اس قسم کے الفاظ شرفا بولتے تھے، "پروڈھا"، بجائے "پراڑھا" اور "دھیرا" بجائے "آہستہ یا متوقف" "اُودھر" بمعنی طرف اور "بھیچک" بمعنی "حیران"

اور "تکوں" بجائے "کو" (یا اپنے تئیں کو) اور "جانے ہارا" بجائے "جانے والا"
اور فرمانتا ہے" بجائے "فرماتا ہے" اور "جاتنا ہے" بجائے "جاتا ہے"

تیسرا دور[۱] اس مشاعرے میں ان صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے۔ زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی، ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا ہے اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج وافسر تیار ہوتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے مرصع کار مینانگار، پیچھے آئے مگر اس فخر کا نولکھا ہار انھی بزرگوں کے گلے میں رہا۔ جب یہ باکمال چمن کلام میں آئے تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی۔ فصاحت کے پھول کو دیکھا کہ قدرتی بہار میں حسن خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے۔ چوں کہ انھیں بھی ناموری کا تمغا لینا تھا، اس لیے بڑوں سے بڑھ کر قدم مارنے چاہے۔ یہ گرد وپیش کے میدانوں میں بہت دوڑے۔ سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے۔ جب سامنے کچھ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا۔ تم دیکھنا، وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اتاریں گے۔ قدردانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دامن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف

---

[۱] اس دور کے مشہور شعرا حسب ذیل ہیں:۔ مرزا جان جاناں مظہر۔ میر عبدالحئی تاباں۔ سودا۔ میر ضاحک۔ میر درد۔ میر سوز۔ میر تقی میر۔

زیادہ کرے گا، اصل کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میرؔ صاحب اور خواجہ میر دردؔ کو دیکھوگے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے۔ سوداؔ کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔

اتنی بات کا افسوس ہے کہ اس ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف رخ کیا۔ کاش قدم آگے بڑھاتے! تاکہ حسن وعشق کے محدود صحن سے نکل جاتے اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے، نہ عجائب و لطائف کا شمار ہے۔ اس بات کو بھولنا نہ چاہیے کہ خان آرزوؔ کے فیض صحبت نے ان نوجوانوں کے کمال کو اس طرح پرورش کیا، جس طرح دایہ اپنے دامن میں ہونہار بچوں کو پالتی ہے۔ میں نے طبقۂ دوم اور سوم کے اکثر استادوں کے حال مجمل طور پہ حواشی میں لکھ دیے ہیں اور اکثروں کے نام و کلام سے یہ جام خالی ہے۔ حقیقت میں ان سب کو زبان اردو کی اصلاح کا حق حاصل ہے لیکن اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ میرزا جان جاناں، سوداؔ، میرؔ، خواجہ میر دردؔ چار شخص تھے جنھوں نے زبان اردو کو خراد اتارا ہے۔

ہمارے زبان دانوں کا قول ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ طبقۂ سوم کے اشخاص جو حقیقت میں عمارت اردو کے معمار ہیں، انھوں نے بہت سے الفاظ پرانے سمجھ کر چھوڑ دیے اور بہت سی فارسی کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں انھیں گھلایا، پھر بھی بہ نسبت حال کے، بہت سی باتیں ان کے کلام میں ایسی تھیں کہ اب متروک ہیں۔

قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں، دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہنچے۔

چوتھا دور [1] یہ کچھ اور لوگ ہیں! ع۔ ان کا آنا غضب کا آنا ہے۔
ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ منہ تھک جائیں گے۔ مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے، نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ انھی کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے۔ کبھی طُرّے سجائیں گے۔ کبھی انھی پھولوں کی گیندیں بنالائیں گے اور وہ گل بازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھالے گا۔ ایسے قدرداں ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول اُن کا چمن زعفران کے مول بکے گا۔

اس دور میں میاں رنگینؔ سب سے نئے گل دستے بنا کر لائے اور جلسے کے سامنے سجائے۔ یعنی ریختے میں سے ریختی نکالی۔ ہم ضرور کہتے کہ ہندستان کی عاشقانہ شاعری نے اپنی اصل پر رجوع کی لیکن چوں کہ پہلے کلام کی بنیاد اصلیت پر تھی اور اس کی بنیاد فقط یاروں کے ہنسنے ہنسانے پر ہے اس لیے سوائے تمسخر کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اگر لکھنؤ کے قیصر باغ اور وہاں کے معاملات کی تخم ریزی دیوان رنگینؔ اور دیوان سید انشاؔ کو لکھیں تو کچھ بدگمانی یا تہمت میں داخل نہیں۔ اگرچہ اصل ایجاد میاں رنگینؔ کا ہے مگر سید انشاؔ نے بھی ان سے کچھ زیادہ ہی سگھڑاپا دکھایا ہے۔

---

[1] اس دور کے مشہور شعرا جراتؔ۔ میر غلام حسن حسنؔ۔ سید انشاؔ۔ مصحفیؔ۔ میاں رنگینؔ ہیں۔

ان صاحب کمالوں کے عہد میں صدہا باتیں، بزرگوں کی متروک ہوگئیں۔ البتہ شیخ مصحفی کے بعض الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بزرگوں کی میراث سے محبت زیادہ ہے۔ سید انشا اور جرأت نے ان میں سے بہت کچھ چھوڑ دیا مگر نت، ٹک، انکھڑیاں، زدر (بمعنی بہت) بے تکلف بولتے ہیں اور واچھڑے، بھلا رے، جھمکڑا، اجی، سید موصوف کا انداز خاص ہے۔ ہاں انھوں نے کلام کا انداز ایسا رکھا ہے کہ جو چاہتے ہیں سو کہہ جاتے ہیں۔ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا روزمرہ یہی ہے یا مسخرہ پن کرتے ہیں۔

پانچواں دور[1]

دیکھنا! وہ لالٹینیں جگ مگانے لگیں۔ اٹھو، اٹھو! استقبال کر کے لاؤ۔ اس مشاعرے میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سرمہ ہوں گے۔ اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے۔ ایک وہ کہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا۔ یہ ان کے باغوں میں پھریں گے۔ پرانی شاخیں زرد پتے کاٹیں چھاٹیں گے اور نئے ڈھنگ کے گل دستے بنا بنا کر گل دانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائیں گے اور برج آتش بازی کی طرح اس سے رتبۂ عالی پائیں گے۔ انھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لیے مگر یہ غضب کیا کہ گرد و پیش جو وسعت بے انتہا پڑی تھی اس میں سے کسی جانب میں نہ گئے۔ بالاخانوں میں سے بالا بالا اڑ گئے چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا اور بعض ایسے اڑیں گے کہ اڑ ہی جائیں گے۔ وہ اپنے آئین کا نام

[1] اس دور کے شعرا کے دو طبقے ہیں۔ طبقہ اول شاہ نصیر۔ ناسخ۔ خلیق۔ آتش۔ مومن۔ ذوق۔ دیا شنکر نسیم غالب۔ انیس۔ دبیر۔ طبقہ دوم۔ منیر شکوہ آبادی۔ امیر مینائی۔ داغ۔ جلال۔ امیر اللہ تسلیم وغیرہ۔

خیال بندی اور نازک خیالی رکھیں گے، مگر حق یہ ہے کہ شاعری ان کی ساحری (جادوگری) اور خود اپنے وقت کے سامری ہوں گے۔ ساتھ اس کے صاحب اقبال ایسے ہوں گے کہ انھیں پرستش کرنے والے بھی ویسے ہی ہاتھ آئیں گے۔ ان بزرگوں کی نازک خیالی میں کچھ کلام نہیں لیکن اتنا ہے کہ اب تک مضمون کا پھول اپنے حسن خداداد کے جوبن سے فصاحت کے چمن میں لہلہاتا تھا۔ یہ اس کی پنکھڑیاں لیں گے اور ان پر موقلم سے ایسی نقّاشی کریں گے کہ بے عینک کے نہ دکھائی دے گی۔ اس خیال بندی میں یہ صاحب کمال اس قدرتی لطافت کی بھی پروا نہ کریں گے جسے تم حسن خداداد سمجھتے ہو، کیوں کہ ان کی صنعت بے اس کے اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی۔

پہلے بزرگ گرد وپیش کے باغوں کا پتّا پتّا کام میں لا چکے تھے۔ اب نئے پھول کہاں سے لاتے۔ آگے جانے کی سڑک نہ تھی اور سڑک نکالنے کے لیے سامان نہ تھے۔ ناچار اس طرح استادی کا نقّارہ بجایا اور ہم عصروں میں تاج افتخار پایا۔ یہ آخری دور کی مصیبت کچھ ہماری زبان پر نہیں پڑی، فارسی کے متقدمین کو اس کے متاخرین سے مطابق کرلو، شعراے جاہلیت کا متاخرین عرب سے مقابلہ کرو۔ انگریزی اگرچہ میں نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ اس کے متاخرین بھی اس درد سے نالاں ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ زبان جب تک عالم طفولیت میں رہتی ہے تب ہی تک شیر وشربت کے پیالے لنڈھاتی ہے۔ جب پختہ سالی ہوتی ہے تو خوش بو عرق اس میں ملاتی ہے۔ تکلف کے عطر ڈھونڈھ کر لاتی ہے، پھر سادگی اور شیریں ادائی تو خاک میں مل جاتی ہے۔ ہاں داؤں کے پیالے ہوتے ہیں جس کا جی چاہے پیا کرے۔

مزید مطالعہ کے لیے :۔ اردو کی چند مشہور ہستیاں ۔ کتاب گھر علی گڑھ
مطالعۂ آب حیات از مسعود حسین ادیب

سوالات

۱۔ آزاد نے صنعت کیمیائی کسے کہا ہے؟
۲۔ اکبر نوروز کا جشن کیسے مناتا تھا؟
۳۔ "بعض ایسے اڑیں گے کہ اڑ ہی جائیں گے"، یہ اشارہ کیسے شاعروں کے متعلق ہے؟

مشقیں

۱۔ پہلے مضمون میں اکبر کی شخصیت کے جو پہلو ابھرتے ہیں ان کو بیان کرو؟
۲۔ آزاد نے ہر دور کی شاعری کی جو خصوصیات بتائی ہیں ان کی وضاحت کرو۔
۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں واحد کی جمع اور جمع کے واحد لکھو؟
روح ۔ امیر ۔ شعر ۔ دور ۔ حواشی ۔ حروف ۔ کمال ۔ لطائف
مضمون ۔ عرق ۔ عجائب ۔
۴۔ "ہمایوں نے بادشاہ سے کہا کہ کل رعایا غیر قوم غیر مذہب ہیں اور خود ملک کے مالک ہیں"۔

اس جملہ میں ہمایوں، بادشاہ، ملک اور مالک ایسے اسم ہیں جن کے استعمال کی حالتیں مختلف ہیں۔ ہمایوں کہہ رہا یعنی کہنے کا فعل کر رہا ہے لہذا وہ فاعلی حالت میں ہے۔ اور بادشاہ مفعولی حالت میں ہے، کیونکہ اس سے کہا جا رہا ہے۔ مالک کی نسبت ملک سے ہے یعنی یہ اضافی حالت میں ہے۔ تم اپنے سبق سے اسم کی فاعلی مفعولی اور اضافی حالتوں کو چھانٹ کر لکھو۔

متاخرین عرب سے مقابلہ کرو۔ انگریزی اگرچہ میں نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ اس کے متاخرین بھی اس درد سے نالاں ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ زبان جب تک عالم طفولیت میں رہتی ہے تب ہی تک شیر و شربت کے پیالے لنڈھاتی ہے۔ جب پختہ سال ہوتی ہے تو خوشبو عرق اس میں ملاتی ہے۔ تکلف کے عطر ڈھونڈھ کر لاتی ہے، پھر سادگی اور شیریں ادائی تو خاک میں مل جاتی ہے، ہاں دواؤں کے پیالے ہوتے ہیں، جس کا جی چاہے پیا کرے۔

اس موقع پر یہ کہنا واجب ہے کہ ان سے پہلے جو صاحب کمال لکھنؤ میں تھے وہ دلی کے خانہ برباد تھے۔ وہ یا ان کی اولاد اس وقت تک دلی کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اہل لکھنؤ ان کی تقلید کو فخر سمجھتے تھے نہ کہ عیب۔ کیوں کہ وہاں اب تک کوئی صاحب کمال اس درجے کا پیدا نہ ہوا تھا۔ اب وہ زمانہ آتا ہے کہ انھیں خود صاحب زبانی کا دعویٰ ہوگا اور زیبا ہوگا اور جب ان کے اور دلی کے محاورے میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورے کی فصاحت اور دلی کی عدم فصاحت پر دلائل قائم کریں گے۔ بلکہ انھی کے بعض بعض نکتوں کو دلی کے اہل انصاف بھی تسلیم کریں گے۔ ان بزرگوں نے بہت قدیمی الفاظ چھوڑ دیے اور اب جو زبان دلی اور لکھنؤ میں بولی جاتی ہے وہ گویا انھی کی زبان ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد

۱۸۳۶ء میں موضع ریڑ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو ایک جیّد عالم تھے اور پھر عربی و فارسی کی درسیات کی تکمیل مشہور علما سے کی۔ مرحوم نے دلی کالج میں بھی کچھ دن تعلیم حاصل کی۔ شروع میں کئی ملازمتیں کی اور بالآخر ان کی قابلیت اور ہنگامۂ غدر میں ان کے خاندان کی کارگزاری کے صلے میں گورنمنٹ نے ان کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا۔ بعد پنشن حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہاں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ آخری ایام دہلی میں گزارے۔ مولوی صاحب کو ان کی تصانیف پر گورنمنٹ سے کئی انعامات ملے اور ۱۸۹۷ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ ایڈنبرا یونی ورسٹی اور پنجاب یونی ورسٹی نے اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

مولانا نے باوجود ملازمت ساری عمر تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ قانونی کتابوں کا ترجمہ کیا جن سے آپ کی بڑی شہرت ہوئی۔ ان کی علمیت مسلم تھی جس کا اظہار ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ مولانا ہمیشہ عام روش سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے، اس کے لیے وہ عبارت میں شوخی اور محاورات کی کثرت کا التزام کرتے ہیں ہر چند کہ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے اور اس میں روزمرہ کی پرلطف چاشنی ہے مگر کہیں کہیں عبارت میں ابتذال اور بھونڈا پن آجاتا ہے۔ ان کی انشا پردازی کا یہی نقص ہے کہ وہ کبھی کبھی موضوع کا لحاظ کر کے زبان استعمال نہیں کرتے۔

مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ یہ ناول طویل افسانے ہیں جو انھوں نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے لکھے تھے۔ ان میں کردار نگاری اور پلاٹ کا فقدان ہے مگر مکالے

بہت اچھے ہیں

انھوں نے سر سید کی طرح سنجیدہ علمی اور مذہبی مباحث پر قلم اٹھایا ہے اور عقلی اور منطقی طرز استدلال سے اردو زبان کو آشنا کیا ہے۔

مولانا اصلاح معاشرت اور تحفظ حقوق نسواں کے زبردست حامی تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ مقاصد ہر جگہ نمایاں ہیں۔ ان کے ناول مستورات میں بہت مقبول ہوئے اور ان کا اچھا اخلاقی اثر پڑا۔

جو کتابیں خاص طور پر طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہیں وہ یہ ہیں۔ توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، بنات النعش، مراۃ العروس اور رویائے صادقہ۔

مشقت کی زندگی

(یہ اقتباس مولانا نذیر احمد کی مشہور کتاب بنات النعش سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں کے لیے لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک امیر گھرانے کی لڑکی حسن آرا جو مغرور، کاہل اور ان پڑھ ہے مکتب میں جاکر استانی اور سہیلیوں کے اثر سے اپنی بری عادات چھوڑ کر ایک کام کاجی اور پڑھی لکھی لڑکی بن جاتی ہے۔ محمودہ اس کی بڑی سہیلی ہے جو اس کو سمجھایا بجھایا کرتی ہے۔ اس زمانے کی معاشرتی زندگی نصف صدی پہلے کی زندگی سے کافی مختلف ہو گئی ہے مگر مولانا کی تصانیف میں بہت سی باتیں جو اس وقت کے لیے

موزوں اور مفید تھیں آج موزوں اور مفید ہیں)

محمودہ۔ "دولت سے ہرگز ہرگز آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔ استانی جی اسی ہم سائی کا حال دکھا دکھا کر مجھ کو سمجھایا کرتی ہیں کہ دیکھو، کیا آزاد، آسودہ زندگی اس کی ہے۔ ایک آپ ہے، ایک میاں ہے اور چار پانچ بچے ہیں جو بہت چھوٹے چھوٹے ہیں، کچھ کام کاج کرنے کا جوگ نہیں۔ میاں کہیں نہر پر مٹی ڈھویا کرتا ہے، آپ پسائی کا پیستی ہے۔ مکان پہ جا کر دیکھو نہ تخت ہے، نہ فرش، شائد ٹوٹی پھوٹی تین چار پاؤں کی چار پائیاں ہیں۔ بے تکلف کھری چارپائیوں پہ سب سوتے ہیں۔ برتنوں میں مٹی کے گھڑے، مٹی کی ہنڈیاں، مٹی کے پیالے اور رکابیاں اور لکڑی کی ڈوئی۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔"

حسن آرا۔ "یہی آزاد اور آسودہ زندگی ہے؟ خدا دشمن کو بھی یہ عیش نہ دکھائے؟ دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہوگی۔ وہ اپنی جان سے ہلاک ہے۔ آپ کو اور استانی جی کو اس کی آسودگی پر رشک ہے۔"

محمودہ۔ "پہلے مجھ کو بھی استانی جی کے کہنے پر اچنبھا ہوا تھا مگر مدتوں میں ہم سائی اور اس کے بچوں کی حالت میں غور کرتی رہی۔ آخر میں نے بھی سمجھا کہ استانی جی سچ کہتی ہیں۔ سوچنے سے یہ معلوم ہوا کہ جسمانی آرام اور جسمانی تکلیفیں سب عادت پر موقوف ہیں۔

جس کو محنت کی عادت ہے وہ اسی میں ایسا خوش رہتا ہے کہ ہم نکمے پڑے رہنے میں ہرگز وہ خوشی حاصل نہیں کر سکتے یہی ہم سائی ہیں نے دیکھا ہے کہ برسات کی چپچی گرمی پڑ رہی ہے اور ہوا بند ہے کہ پتّا تک نہیں ہلتا، میں باہر کے صحن میں کھڑی برابر پنکھا اپنے تئیں ہلائے جاتی ہوں اور ندیوں پسینہ نکلا جاتا ہے۔ دم بولا بولا اٹھتا ہے اور خدا سلامت رکھے، بی ہم سائی ہیں کہ دالان کے اندر اکیلی چکی پیس رہی ہیں اور میں نے کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا کہ آپ خیر سے ایسی خوش ہیں کہ مزے میں کچھ گا بھی رہی ہیں۔ مجھ کو پہلے تو شبہہ ہوا کہ اس حالت میں اس کو کیا خاک گانا سوجھا ہوگا۔ لیکن جب میں نے کھڑکی میں سے آواز دی تو بہت ہشاش بشاش ہو کر بولی، کیا ہے بیٹا؟ استانی جی سے کہو دو چار گلے اور رہ گئے ہیں، آٹا میں اب لائی کی لائی۔ ایسی کراری آواز سے جواب دیا کہ کوئی بات تکلیف کی نہ معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتی کیا ہوں کہ آپ آٹا لیے ہنستی چلی آتی ہیں۔ آٹے کے ساتھ ترازو لے، آٹا تولا، چھانا، مٹکے میں بھرا۔

استانی جی نے کہا۔ "ہم سائی آٹے کا مٹکا خوب اچھی طرح ڈھک دیا یا نہیں۔" ہم سائی "ہاں بی، بڑا طباق ڈھک اوپر سے پنسیری رکھ دی ہے۔" استانی جی۔ "اچھا رخصت۔" ہم سائی۔ "کیا اور پیسنی نہ دو گی۔" استانی جی نے کتاب دیکھ کر کہا، نہیں ابھی ضرورت

نہیں چار پانچ دن کا آٹا ہے۔ برسات کے دن ہیں، جہاں ذرا دیر ہوئی آٹے میں سر سریاں پیدا ہو جاتی ہیں، تلخانے لگتا ہے۔

ہم سائی۔ "نہ بی بی پیسنے تو دے ہی دو۔ استانی جی۔ "کم بخت ایک دن تو آرام کیا کر۔ یہ بلا کی گرمی پڑ رہی ہے، تیرا جی نہیں گھبراتا۔"

ہم سائی۔ "کیا کہوں کچھ ایسی عادت ہے جس دن پیسنا نہیں ہوتا تمام بدن دکھا کرتا ہے اور کھانا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھاتی پر دھرا ہے۔ خالی بیٹھے کچھ الکسی سی معلوم ہوتی ہے کہ جی نہیں لگتا۔"

محمودہ۔ "میں نے اپنے جی میں کہا کہ یہ دیکھو، مصیبت کی کیا کیا کچھ شکائتیں ہو رہی ہیں۔

استانی جی۔ "پیسنے کو تو دوں مگر ہم سائی گیہوں جھکتے ہوئے دیتی ہوں، آٹا اڑتا ہوا کیوں ہوتا ہے۔"

ہم سائی۔ "گیہوں سیلے ہوئے تھے۔ پہلے ہی گلے میں دلیا نکلنے لگا تو میں نے ذرا آنچ دکھا دی تھی۔ نہیں تو میں باہر ہوا میں بھی نہیں پیستی۔ دالان کے اندر پیسا کرتی ہوں جہاں ہوا کا گذر نہیں۔"

استانی جی۔ "کیا کہوں، کئی دن سے راہ دیکھتی ہوں کوئی گدھے والا گلی میں بولے تو بورے مٹی لے لوں۔ دالان بھی لپ جائے اور چولھے بھی لوٹ گئے ہیں پھر سے لیس پوت ہو جائے۔ مٹی ہوتی تو میں تم سے چولھے بنوا لیتی۔"

ہم سائی۔ "مٹی کا ملنا کیا مشکل ہے۔ ہمت، باپ کے پاس تھوڑی

دیر میں روٹی پڑے کر جائے گا ادھر سے ایک ڈگرا مٹی بھی بھر لائے گا،
نہر کی مٹی چکنی اور پائدار بھی ہوتی ہے"۔

استانی جی۔ "اگر مٹی آ جائے تو کل پسائی کے بدلے یہی کام کرو"
ہم سائی دعائیں دینے لگیں تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتی ہوں کہ
ہمت کی چھوٹی بہن کوئی دس برس کی، ایک بڑا ٹوکرا سر پہ رکھے
آگے آگے اور بی ہمسائی پیچھے پیچھے چلی آتی ہیں۔ نگوڑی لڑکی کو دیکھ کر
تو مجھے بہت ہی ترس آیا۔ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ یہ کیا لائی ہے،
لیکن میں نے جلدی سے دوڑ دروازے سے ٹوکرا اتروالیا، دیکھوں
تو نہر کی گیلی مٹی ہے۔

میں نے کہا۔ "اری تجھ کو خدا کی سنوار، یہ تو نے کیا غضب کیا!
نگوڑی اتنا بوجھ! اتنے میں ہم سائی بھی آ پہنچی اور میں اس سے
لڑنے لگی کہ ہم سائی، ذرا تمھارے دل میں رحم نہیں۔ اس لڑکی کی
بساط دیکھو اور اتنے بوجھ کا گھر سے یہاں تک لانا دیکھو۔ لڑکی
ایسی ہی دو بھر ہے تو بلا سے نگوڑی کو ایک دن زہر دے کر سلا رکھو۔
واہ کوئی سوتیلی ماں بھی ایسا نہ کرتی ہوگی۔ ٹوکرا میں نے اُتروایا تھا۔
ایسا بھاری بوجھل پتھر تھا کہ آدھی ہی دور پہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔
نہر کی گیلی مٹی خدا کی پناہ، لوہا بھی ہلکا ہوتا ہے۔ میرا تو اتنی ہی دیر
میں دم پھول گیا۔ میں نے تو کس شد و مد سے ہم سائی کو الزام دینا
چاہا تھا لیکن ہم سائی نے سرسری طور پہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بیوی

ہم غریب آدمی ہیں اور یہ غریب گھر کی بیٹی ہے۔ ہم کو تو رات دن بوجھ اٹھاتے گذرتی ہے۔ مٹی کی ٹوکری کی کیا حقیقت ہے۔ یہ تو اکیلی چارپائیاں اٹھالاتی ہے۔ پرسوں رہانے کے لیے چکی کا پاٹ دروازے پر خمرے کو دے آئی تھی۔ ہمارے بچے امیرزادیوں کی طرح باریک جان اور نازک بیگم اور مہین خانم ہوں تو ایک دن بھی کام نہ چلے۔ ہم سائی کی یہ بات سن کر مجھ کو ایسی ندامت ہوئی کہ پسینے پسینے ہو گئی اور جی میں سوچی کہ الٰہی کیا بات ہے۔ ان لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا تو نصیب نہیں ہوتا پھر اتنے قوی اور مضبوط کیوں ہیں۔ ایک دن میں نے استانی جی سے پوچھا تو انھوں نے کہا، "یہ سب زور اور سب بوتا اور سارا بل محنت کا ہے۔ ہم لوگ دن رات احدیوں کی طرح نکمے پڑے رہتے ہیں۔ کھانا جیسا کھایا ویسا ہی پیٹ میں رکھا رہا۔ نہ ہاضمہ درست ہے نہ کھل کر بھوک لگتی ہے۔ سدا کے روگی، ہمیشہ کے دکھیا۔ کبھی قبض، کبھی پیچش۔ آئے دن آدمی حکیم کے یہاں موجود، علاج کی عادت، دوا کا معمول۔ ہم لوگوں کے مزاج ہیں کہ چھوئی موئی کے درخت ہیں۔ ذرا ٹھیس لگی اور کمھلا کر رہ گیا۔ کوئی موسم ہو ہم کو کچھ نہ کچھ شکایت ضرور رہتی ہے۔ گرمی ہے تو کہیں درد کے مارے سر پھٹا پڑتا ہے، آنکھیں جلتی ہیں، ہتھیلیوں اور تلووں سے آگ نکلتی ہے۔ یوں ہی عمر بھر بھوک کو روتے رہے۔ گرمیوں میں رہی سہی اور بھی گئی گذری ہوئی۔ نہ برف

اور شورے کے پانی سے تسکین ہوتی ہے، نہ انار اور فالسے اور عناب اور نیلوفر کے شربتوں سے تسلی۔ برسات آئی تو مکھیوں اور مچھروں کے واسطے وہ وہ اہتمام ہو رہے ہیں کہ گویا کسی بادشاہ کے ملک پر غنیم چڑھ آیا۔ پروا ہوا کے سبب قوت ہاضمہ بالکل معطّل۔ ریح کا درد، صبح کو شانوں میں تھا تو دوپہر کو کمر میں اور شام کو پنڈلیوں میں۔ جاڑا آیا تو زکام اور کھانسی اور نزلے کو ساتھ لایا۔ اب سر ہے کہ کہیں میں نہیں۔ ایک آرام طلبی نے ہم کو سب نعمتوں کے مزے اور سب آسائشوں کی لذت سے بے نصیب کر رکھا ہے۔ کھانے میں لاکھ لاکھ تکلف کیے مگر وہ ذائقہ نہ ملا جو غریب آدمیوں کو سوکھی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی میں ہر روز میسر ہے۔ نیند سدا اچاٹ رہی۔ دن اور رات کوشش کرتے ہیں کہ گھڑی دو گھڑی کو آرام سے سو رہیں مگر نیند ہے کہ ذرا کھٹکا ہوا اور کوسوں دور۔ مجھ کو اس ہم سائی کا حال دیکھ کر بڑی حیرت ہوا کرتی ہے۔ ایک دن کا مذکور ہے کہ میں گرمی کے مارے رات کے وقت کوٹھے پر گھبرائی گھبرائی پھر رہی تھی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ ہم سائی کے پانچوں بچے ایک کے اوپر ایک، نہ بچھونا ہے، نہ تکیہ، نہ پنکھا، کھری چارپائی پر مزے میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ چھ برس میرے بیاہ کو ہوئے میرے منہ میں خاک، میں نے تو کسی دکھ یا بیماری کی شکایت ہم سائی سے نہیں سنی۔ فصل بدلنے کو ہوتی ہے تو قاعدہ ہے کہ

اچھے اچھے آدمی کو بھی بخار ہی آجاتا ہے، مگر ماشاء اللہ نہیں آتا تو ہم سائی اور ہم سائی کے بچوں کو۔ کہنے کو غریبی ہے کہ چولھا کبھی دو وقت نہیں سلگتا مگر بچوں کو دیکھو، چول چال، توانا۔" بھلا یہ چھوٹی لڑکی تمھارے عندیے میں کے برس کی ہوگی؟"

میں۔ "کوئی دس برس کی۔"

استانی جی۔ "میرا چوتھا چالا تھا، میرے آئے پر ہوئی ہے۔ خیر سے چھ برس پورے ہو چکے، ساتویں بیں لگی ہے۔ ماشاء اللہ کیا اچھا اٹھان ہے۔ محمودہ دیکھو تم سے بھی نکلتی ہوئی ہے۔"

حسن آرا۔ "یہ بات بہت ٹھیک ہے۔ ہمارے گھر بھی لونڈیاں اور نوکروں کا یہی حال ہے۔ کھا کھا کر ایسے موٹے ہوئے ہیں کہ پہچان نہیں پڑتے۔"

محمودہ۔ "بھلا کیا سبب ہے کہ آپ لوگ گھر کے مالک مختار، خدا کا دیا سب کچھ موجود، سب کچھ میسر اور بدن پر دیکھو تو بوٹی نہیں۔ لونڈیاں لاکھ چوری کریں، پھر بھی گھر والیوں کی برابری نہیں کر سکتیں۔"

حسن آرا۔ "البتہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ محنت کا ہی سبب ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے، جو کام لونڈیوں کے کرنے کے ہیں ہم کیوں کر کرنے لگیں۔ اول تو ہو نہیں سکتے اور جو جان مار کر ایک آدھ کام کیا بھی تو اپنے ہی کنبے والے حقیر سمجھنے لگیں۔"

محمودہ۔ "ہو سکنے اور نہ ہو سکنے کی کچھ نہ پوچھیے۔ آدمی کے برابر سخت نہیں اور آدمی کے برابر کوئی چیز نرم بھی نہیں ہم ہی جیسی عورتیں ہیں جو چکی پیستی ہیں اور وہ وہ کام کرتی ہیں جو شہر کے بعضے مردوں سے نہ ہو سکیں اور یہی عورتیں ہیں جن کو اپنی ہی جان دو بھر ہے۔ کام کا کیا ذکر اور محنت کا کیا مذکور۔ جیسی عادت ڈالو ویسی ہی پڑ جاتی ہے اور کنبے والوں کو حقیر سمجھنے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ نوکر چاکر ہوتے ساتے اپنے ہاتھوں کام کرنے سے تو میرے نزدیک لوگوں کی نظروں میں اور عزت زیادہ ہونی چاہیے۔ کتنی خوبی کی بات ہے کہ ٹہل کو نوکر، خدمت کو لونڈیاں ہوں اور اپنے ہاتھوں کام کرنا آدمی عار نہ سمجھے استانی جی کو دیکھو، ماما بھی ہے اوپر کے کام کو بھی ایک عورت نوکر ہے، اتنی لڑکیاں مکتب میں بیٹھتی ہیں۔ جھوٹوں کہیں تو سچوں کام کو دوڑیں مگر پانی تک آپ اٹھ کر پیتی ہیں۔ یہ بات خدا کو کیسی بھلی لگتی ہوگی کہ دیکھو ہم نے اس بندے کو کیسا بڑھایا اور ایسا نوازا کہ اسی کے ہم جنس اس کی خدمت اور تابع داری کو دیے مگر یہ کیسا نیک بندہ ہے کہ اس کو غرور چھو نہیں گیا۔ یہ اپنے تئیں اسی طرح ناچیز سمجھتا ہے۔

حسن آرا۔ بھلا جو کام اپنے سے ہو ہی نہ سکے تو آدمی کیا کرے"؟

محمودہ۔ "اس کا جواب میں ابھی دے چکی ہوں کہ جو کام

آدمی کرتے ہیں ہر ایک کر سکتا ہے۔ مگر خیر دنیا میں خدا جس کو دولت و ثروت دے اور بڑی محنت کے کام اگر وہ نہ بھی کرے تاہم ہزاروں چھوٹے چھوٹے کام ایسے ہیں کہ بے زحمت ان کو کر لے سکتا ہے۔ ایسے کاموں میں آپ نہ ہلنا اور ہمیشہ نوکروں اور خدمت گاروں کا محتاج رہنا، بڑی بری بات ہے۔ ایک تو انسان آلکسی ہو جاتا ہے۔ آرام طلبی کی عادت چپکے چپکے بڑھتی جاتی ہے۔ دوسرے کیسا ہی چھوٹا کام ہو آدمی اپنی مرضی کے موافق جیسا اپنے ہاتھ سے کر سکتا ہے نوکر کتنا ہی سلیقہ مند اور مزاج شناس کیوں نہ ہو کبھی نہیں کر سکتا۔ میں نے تو اپنا یہی قاعدہ رکھا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے جتنا وقت بچتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ کام کیا کرتی ہوں۔ دو برس ہوئے کہ میں اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے سیتی اور قطع کر لیتی ہوں۔ پکانے میں بہت ربط ہو گیا تھا، اب تین چار مہینے سے ذرا کم ہو گیا ہے، پھر بھی گوشت میں ہی بگھارتی ہوں اور گھر میں جو کوئی نئی چیز پکے تو میں ہی پکاتی ہوں۔"

حسن آرا۔ "آپا تم کو پکانا بھی آتا ہے؟"

محمودہ۔ "آتا کیا ہے خیر غریبا مؤ، بھون بھلس لیا۔ استانی جی کی مہربانی سے ایک آدھ چیز ذرا اچھی بننے لگی ہے اور مجھ پر کیا منحصر ہے، مکتب کی سب لڑکیاں جانتی ہیں۔ سب لڑکیوں نے

ساجھا ملایا ہے۔ کل کڑھائی چڑھے گی۔ سامان آیا رکھا ہے۔ تلی تو ابھی جاتی، استانی جی نے کہا دن کے وقت گرمی بہت ہوتی ہے سویرے تڑکے دھوپ نکلتے نکلتے تل تلا کر فراغت ہو جاؤ۔ سو کل آپ بھی سیر دیکھئے گا۔"

حسن آرا۔ "سموسے بھی تلنے آتے ہیں؟"

محمودہ۔ "انشاء اللہ ایسے سموسے تل کر کھلاؤں نرم اور خستہ پتلے پرت کہ آپ بھی پسند کریں مگر یہ فرمائیے کہ میٹھے سلونے، سادے یا قیمہ بھرے ہوئے؟"

حسن آرا۔ "میٹھے۔"

محمودہ۔ "میٹھے سموسے شہر بانو ایسے بناتی ہیں کہ سبحان اللہ۔"

ایک انگریز حاکم سے ملاقات

(اگر دہلی کی ٹکسالی زبان اور روزمرہ کی پر لطف چاشنی کا ذائقہ لینا ہو تو مولانا نذیر احمد کی تصانیف پڑھنا چاہیے جن میں انیسویں صدی کے نصف آخر کی تہذیب و تمدن کے دل کش اور موثر مرقعے ملیں گے۔

ویسے تو مولانا کی تصانیف بہت سی ہیں لیکن توبۃ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ، فسانۂ مبتلا، مراۃ العروس اور بنات النعش خاص طور سے طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہیں۔)

میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی ہیل کر ڈھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی، بے عزتی۔ جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو، لوئیں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑوں کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو۔ کلکٹر، جنٹ، اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں اگر یورشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا اور احاطے بھی شیطان کی آنتڑی کہ ہم جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے نوکری نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ

ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا، گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہر کارے کی طرح ایک چوکی تک پوٹیا نہیں تو دُلکی، ہیٹشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکوتیاں کرا دی ہیں تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا، ہاتھ سے داڑھی مونچھ کو سنوارا۔ آہستہ سے عمامہ کو ذرا اور جما لیا۔ چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مودب، مقطع بن کر ہاتھ باندھے، نیچے نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔ خدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر سے تاڑ لیا تھا، کوٹھی کے پاس آتے دیکھ قصداً ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ برابر چلی آتی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں۔ کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں، لوٹ چلیں، پھر خیال آتا ہے ایسا نہ ہو لوٹنے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کی اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا، وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے کے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی

نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لیے ہوئے نمودار ہوا، کیا کریں اپنی غرض کے لیے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور غیرت بالائے طاق، آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا، کیوں جمع دار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟ بس اس ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے خدا جانے کب موقع آپڑے چار و ناچار اچٹتا ہوا سا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے ملاقات تو شاید ہی ہو، لیکن آپ بیٹھیے۔ ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں، یہ کہہ کر پھر وہ اندر کو جانے لگا تو آخر نہ رہا گیا زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں اپنے سر پر۔ تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی تکیہ اور ایک بازو ندارد، گویا بید کی تپائی لاکر ڈال دی۔ اس کے بعد جب کوئی چپراسی یا خدمت گار باہر آتا، یہی معلوم ہوتا کہ صاحب ابھی غسل خانے سے نہیں نکلے (الٰہی کیا غسل میت ہے) اب کپڑے بدل رہے ہیں، اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں، اب چٹھی لکھ رہے ہیں یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں پھر خیال آیا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا ہی پڑے گا دوسرے دن کا کیا بھروسا، اتنی محنت کیوں ضائع کی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو۔ بڑی دیر بعد چپراسی حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لیے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گزری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ

کہتے ہوئے اٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں صاحب سے میری اطلاع کی خبر کر دینا۔
تب خدا جانے کہ چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا۔ دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں۔ خفا ہوں گے تو آپ میری آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا۔ غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پیپ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطمئن ملاقات نہیں ہو سکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں کہ ان کو خبر کروں کہ میں آیا کھڑا ہوں اور کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔ بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی، چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔ عین سامنے سے دروازے کے آیا، درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا، پھر بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا، کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی۔ ضرور پڑی ہوگی۔ خیر آخر آپ ہی سر اٹھایا اور "ڈپٹی صاحب!" حاکم بالادست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسیوں پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ تم خدا کے بندے ہو تو یقین ماننا بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈے پر گل دم۔ کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کم بخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خداوند، سررشتہ دار حاضر ہیں۔ صاحب ہیں کہ میری طرف دیکھے جاتے ہیں اور چپراسی سے فرما رہے ہیں

"اچا آنے بولو" یعنی اچھا سررشتہ دار سے کہو چلے آئیں۔ سبحان اللہ!
سات برس اسسٹنٹ رہے، نو برس کے قریب جنٹ اور اس سولہ برس
میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لیے فرلو پر ولایت گئے تھے، بارہ برس
دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا۔ چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کیا کمال
حاصل کیا ہے "اچا آنے بولو"۔ اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب
دوں اور سررشتہ دار مردود آگے آگے آپ پیچھے بستہ قلم دان لیے ہوئے
چپراسی آہی گھسا۔ سررشتہ دار مردود کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں تو کیا
پوچھتے ہیں "ول صاحب گرمی ہوت" میں گردن جھکا کر، ہاں حضور، گرمی کے
تو دن ہی ہیں، میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ
لو سے بھی کئی آدمی مرے۔ صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں
یہ کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا ارے ظالم تجھ کو یہ بھی ذرا ترس نہ آیا کہ
ایک بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملتی ہے، ناظر اپنی بدذاتی
سے تین برس کے پرانے خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان
اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور واقع میں گرمی بھر اپنے گھر
ٹٹی میں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا اُبل رہا ہے۔ لاؤ سلام لے کر
اس کو آزاد کر دوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آدمیوں کا لُو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا
اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی۔ کتنے آدمی مرے، کب
مرے، لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب
کے ملاحظے کو بھی آئی یا نہیں۔ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو
چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی ہی گئے نہیں معلوم
دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں یا کالے آدمیوں کے مرنے کی پروا نہیں کی۔

اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ۔ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا چکا، لگا صاحب کا منہ دیکھنے، تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں۔ "آپ کچھ کچھ" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے، جی ملنے کو چاہتا تھا پھر حاضر ہوں گا۔ میری اس اخیر بات میں اور باتیں ہی ایسی کون سی ہوئی تھیں کہ اس کو اخیر کہوں، بلکہ دوسری بات میں "جی ملنے کو چاہتا تھا" بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے، ملاقات کے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے، دیر تک ملاقات رہی تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں، ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھلّو چو لھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہوا۔ اپنے حساب سے کون ایسا نیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے صرف متھا پھوڑّول، وہ بھی اپنے سر کا چھنّدا اتارنے کے لیے۔ صاحب مجھ سے چاہے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سررشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا الٹے پاؤں آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہ تھی مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظر میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔ باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی کا ہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے، گھنٹوں میں برآمدے میں سوکھا کیا، ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی۔ اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے۔ اہا میں اتنی جاں فشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہ گار ہوں۔

یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لیے مجھ پر تعینات ہوئے ہیں۔ ہر چند کہتا ہوں مکان پر آنا، تنخواہ پر دیکھا جائے گا، عید قریب ہے، اس میں سمجھ لینا۔ بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ آخر میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا کہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے، ہوتا تو دینے کا نام دینا، کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی ہی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے، اتنے میں جمع دار نے پنسل اور پرچہ کاغذ نکال میرے ہاتھ دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں۔ جب میں قلم اٹھاتا تھا بے ادب ہاتھ پکڑ لیتے تھے، پہلے فرما دیجئے کہ "آپ کیا لکھتے ہیں" اسی کش مکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو اپنی بگھی تک جا پہنچا، سائیس پٹ کھولے کھڑا ہی تھا، لپک کر پائدان پر پاؤں رکھ کر غڑپ بگھی کے اندر۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچ بان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ، پڑیا بنا، اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پڑیا اٹھائی بھی، ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت بگڑے ہوں گے۔ مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر جا چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے ہوا، بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی، اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت امر اضافی ہے مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہیے

ان کے ساتھ بھی تو انیس بیس کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے، تو جس مجلس میں سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی کیا شرم۔ اسی حیص بیص میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر وہ نہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کہ بر آمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں، آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیے کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے، گھر میں سے پان آ گئے۔ آدمیوں نے حقّے بھر دیے، جوں مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے "اللہ اکبر، ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی، کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوں۔" دوسرے صاحب "آج بندہ کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا، معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بس آج کسی کی دال نہیں گلتی۔" تیسرے صاحب:۔ "مدت سے جدید تحصیل داری قائم ہونے کی خبر تھی یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آ چکی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے صلاح و مشورے میں اتنی دیر لگی۔" لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے، خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

مزید مطالعہ کے لیے :- نذیر احمد کا حلیہ از فرحت اللہ بیگ

سوالات

۱۔ مضمون نگار کے اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ایک آرام طلبی نے ہم سب کو نعمتوں کے مزے سے محروم کر دیا ہے؟

۲۔ "الٰہی کیا غسل میت ہے"، اس جملہ میں کیا لطف بیان ہے؟

۳۔ مضمون میں انگریز حاکم سے ملاقات کا کیا نقشہ کھینچا گیا ہے؟

مشقیں

۱۔ نذیر احمد کی زبان میں محاوروں کا بہت استعمال ہوتا ہے. تم ان اسباق سے محاورے جمع کرو اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

۲۔ دوسرے مضمون میں آئے ہوئے ان فقروں اور جملوں پر غور کرو جن سے مضمون نگار نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ وہ اپنی جان سے ہلاک ہے۔ یہ غریب گھر کی بیٹی ہے، ہم غریب آدمی ہیں

دیکھو ان جملوں میں، وہ، یہ، ہم، ضمیریں ہیں جو مختلف لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

شخصی ۔ وہ، تم، میں، ہم، جو شخص، یا اسم معین کی جگہ لائی جائے۔

اشاریہ ۔ یہ، وہ، اس۔ جو اشارے کے لیے آئے۔

استفہامیہ ۔ کس. کب، کتنے. جس کے ذریعہ کوئی بات پوچھی جائے۔

موصولہ ۔ جو ۔ جون سا ۔ جو کسی اسم کے بجائے ایک جملہ کے ساتھ استعمال ہو۔

تنکیریہ ۔ کوئی ، کچھ ۔ جو غیر معین اسم کی جگہ آئے۔

یہ ضمیریں اسم کی حالت کے اعتبار سے استعمال ہوتی ہیں ۔ اپنے پڑھے ہوئے اسباق سے ضمیریں چھانٹ کر نیچے دیئے ہوئے خانوں میں بھرو:۔

اقسام ضمیر	حالت	فاعلی		مفعولی		اضافی	
	تعداد	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع

خواجہ الطاف حسین حالؔی

پانی پت محلہ انصار میں پیدا ہوئے۔ وہیں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ذہانت اور مطالعے نے اس کو جلا دی۔ شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور غالب کی صحبت و شاگردی نے اس شوق کو پروان چڑھایا۔

غدر میں بیس بائیس سال کی عمر تھی۔ پرانی تہذیب کی بساط الٹتی اور نئی مجلس جمتی دیکھی تھی۔ دل میں قومی درد تھا۔ سرسید کے کہنے پر قوم کی بے کسی اور بربادی سے متاثر ہو کر اپنا مشہور مسدس (مد و جزر اسلام) لکھا جس کی بڑی شہرت ہوئی۔

حالؔی نے تلاش معاش کے سلسلے میں مختلف جگہوں کا رخ کیا۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں مولانا محمد حسین کی معیت میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں روایتی اور مبالغہ آمیز شاعری کو ترک کر کے اخلاقی اور نیچرل عنوانات پر مختلف نظمیں لکھی اور پڑھی جانے لگیں۔ ان نظموں سے جدید اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

سرسید کے ادبی رفقا میں حالؔی ایک بلند اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں صاحب طرز ہیں۔ شاعری میں اصلاحی اور مصلحانہ رنگ غالب ہے۔ مگر ان کی غزلیں اور نظموں کے بعض بعض ٹکڑے رنگ تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ ایک بلند مرتبہ نقاد اور بے مثل سوانح نگار تھے۔ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری اب تک اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ نثر نہایت جچی تلی اور پر مغز لکھتے ہیں۔ انداز بیان واضح، سلجھا ہوا اور مدلل ہوتا ہے۔ حالؔی نے کام کی باتیں کام کی زبان میں لکھنا سکھائیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا طرز تحریر سب سے زیادہ مقبول ہوا۔

حیات سعدی، حیات جاوید (سر سید کی سوانح عمری) اور یادگار غالب
مولانا کی مشہور اور مایۂ ناز تصانیف ہیں۔ نظم میں مسدس حالی اور مجموعۂ نظم حالی مشہور ہیں۔

تخیُّل اور اس کا تصرُّف

(تخیل، شاعری کا ایک اہم جزو ہے مگر اس کا تصرف کیسے ہو اور اس کے حدود کیا ہوں۔ ہر طالب علم کو اس کا علم ہونا ضروری ہے۔ تخیل کا غلط استعمال شاعری کو چیستاں بنا دیتا ہے۔ حالؔی نے اس موضوع پر نہایت عمدہ بحث کی ہے۔ اس بحث کا ایک مختصر اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ طلبہ کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اس اقتباس سے بھی کچھ مشکل حصے حذف کر دیے گئے ہیں)

تخیل یا امیجنیشن ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ و مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیل کا عمل اور تصرف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقۂ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن

کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصورات اور خیالات میں تصرف کرتی ہے اور کبھی الفاظ اور عبارات میں۔ اگرچہ اس قوت کا ہر ایک شاعر کی ذات میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا، بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے، کہیں کم ہوتا ہے اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں۔ یہاں چند مثالیں بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ ''غالب دہلوی'' سے

جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتا ہے اور جام جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جام سفال کی کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جام جم جیسی چیز سے فائق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جام جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزے میں بھی شراب پی جا سکتی ہے۔ اب قوت متخیلہ نے ان تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام سفال کے آگے جام جم کی حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک دل فریب پیرایہ دے کر اس قابل کر دیا کہ زبان اس کو پڑھ کر متلذذ اور

کان اس کو سن کر محظوظ اور دل اس کو سن کر متاثر ہو سکے۔ اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل ہے اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے تو اس کا نام شعر ہوا ہے۔ نیز اس مثال میں تخیل کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بہ مرتبۂ غایت اعلیٰ درجے میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب خیز ہے۔

اگرچہ قوت متخیلہ اس حالت میں بھی جب کہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اسی معمولی ذخیرے سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے۔ لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخۂ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں (جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں) ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا، جو امور مشاہدے میں آئیں ان کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی، کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اس سرمائے کو اپنی یاد کے

خزانے میں محفوظ رکھے۔

مختلف چیزوں سے متحدد خاصیت اخذ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مرزا غالب کہتے ہیں ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

اور متحد اشیا سے مختلف خاصیتیں استنباط کرنے کی مثال میر ممنون کا یہ شعر ہے ؎

تفاوت، قامتِ یار و قیامت میں ہے یہ ممنوں
وہی فتنہ ہے لیکن ہاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

یعنی قامت معشوق اور قیامت فتنہ ہونے میں تو دونوں متحد ہیں مگر فرق یہ ہے کہ فتنۂ قیامت سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں ہے اور قامت معشوق سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

غرض یہ تمام باتیں جو اوپر ذکر کی گئیں ایسی ضروری ہیں کہ کوئی شاعر ان سے استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اگر قوت متخیلہ کو اپنی اصلی غذا جس سے وہ نشو و نما پاتی ہے، نہیں پہنچتی تو اس کی قوت آدھی بلکہ آدھی سے بھی کم رہ جاتی ہے۔

قوت متخیلہ، کوئی شے بغیر مادے کے پیدا نہیں کر سکتی۔ بلکہ جو مصالحہ اس کو خارج سے ملتا ہے اس میں وہ اپنا تصرف کرکے ایک نئی شکل تراش کر لیتی ہے۔ جتنے نام ور شاعر دنیا میں گزرے ہیں وہ کائنات یا فطرت انسانی کے مطالعے میں ضرور مستغرق رہے

ہیں۔ جب رفتہ رفتہ طبیعت اس مطالعے کی عادی ہو جاتی ہے تو ہر ایک چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ ہو جاتا ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینۂ خیال میں خود بہ خود جمع ہونے لگتے ہیں۔

سر والٹر سکوٹ جو انگلستان میں ایک مشہور شاعر ہے اس کی نسبت لکھا ہے کہ اس کی خاص نظموں میں دو خاصیتیں ایسی ہیں جن کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ ایک اصلیت سے تجاوز نہ کرنا، دوسرے ایک ایک مطلب کو نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ جہاں کہیں اس نے کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا کا بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع کی روح میں جو جو خاصیتیں تھیں سر والٹر نے وہ سب انتخاب کر لی تھیں۔ سر والٹر کی نظم پڑھ کر آنکھوں کے سامنے بالکل وہی سماں بندھ جاتا ہے جو پہلے خود اس موقعے کے دیکھنے سے معلوم ہوا تھا اور اب دھیان سے اتر گیا تھا۔ ظاہراً اس نے ان بیانات میں قوت متخیلہ پر ایسا بھروسا نہیں کیا کہ اصلیت کو چھوڑ کر محض تخیل ہی پر قناعت کر لیتا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ روکبی کا قصہ لکھ رہا تھا، ایک شخص نے اس کو دیکھا کہ پاکٹ بک میں چھوٹے چھوٹے خودرو پھول پتے اور میوے جو وہاں اگ رہے تھے ان کو نوٹ کر رہا ہے۔ ایک دوست نے اس سے کہا کہ اس دردسر سے کیا فائدہ؟ کیا عام پھول کافی نہ تھے جو چھوٹے چھوٹے پھولوں کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ سر والٹر نے کہا "تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں جو

بالکل یک ساں ہوں۔"

پس جو شخص محض اپنے تخیل پر بھروسا کرکے مذکورۂ بالا مطالعے سے چشم پوشی یا غفلت کرے گا اس کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس کے دماغ میں چند معمولی تشبیہوں یا تمثیلوں کا ایک محدود ذخیرہ ہے جس کو برتتے برتتے خود اس کا جی اکتا جائے گا اور سامعین کو سنتے سنتے نفرت ہو جائے گی۔ جو شخص شعر کی ترتیب میں اصلیت کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور محض ہوا پر اپنی بنیاد کو نہیں رکھتا وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک مطلب کو جتنے اسلوبوں میں چاہے بیان کرے۔ اس کا تخیل اسی قدر وسیع ہو گا جس قدر کہ اس کا مطالعہ وسیع ہے۔

اب تخیل کی نسبت اتنا جان لینا اور ضرور ہے کہ اس کو جہاں تک ممکن ہو اعتدال پر رکھنا اور طبیعت پر غالب نہ ہونے دینا چاہیے کیوں کہ جب اس کا غلبہ طبیعت پر زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ قوت ممیزہ سے جو کہ اس کی روک ٹوک کرنے والی ہے، باہر ہو جاتا ہے تو اس کی یہ حالت شاعر کے حق میں زیادہ خطرناک ہے۔ قوت متخیلہ ہمیشہ خلاقی اور بلند پروازی کی طرف مائل رہتی ہے مگر قوت ممیزہ اس کے پرواز کو محدود کرتی ہے۔ اس کی خلاقی کی مزاحم ہوتی ہے اور اس کو ایک قدم بے قاعدہ نہیں چلنے دیتی۔ قوت متخیلہ کیسی ہی دلیر اور بلند پرواز ہو، مگر جب تک وہ قوت ممیزہ کی محکوم ہے شاعر کو

اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ جس قدر اس کی پرواز بلند ہوگی اسی قدر شاعری اعلیٰ درجے کو پہنچے گی۔ دنیا میں جس قدر بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں ان میں قوت متخیلہ کی بلند پروازی اور قوت ممیزہ کی حکومت دونوں ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ان کا تخیل نہ خیالات میں بے اعتدالی کرنے پاتا ہے نہ الفاظ میں کج روی۔ مگر دوسری صورت میں جب کہ تخیل، قوت ممیزہ پر غالب آجائے، شاعر کے لیے اس کی پرواز ایسی ہی خطرناک ہے جیسے سوار کے لیے نہایت چالاک گھوڑا جس کے منہ میں لگام نہ ہو۔ ہزاروں ہونہار شاعروں کو اس قوت کی آزادی اور مطلق العنانی نے گم راہ کردیا ہے اور بعض جو گم راہ ہوکر راہ راست پر آئے ہیں وہ اس وقت تک نہیں آئے جب تک کہ قوت ممیزہ کو اس پر حاکم نہیں بنایا۔

قوت متخیلہ کی دلیری اور بلند پروازی زیادہ تر اس وقت بڑھتی ہے جب شاعر کے ذہن میں اس کو اپنی غذا یعنی حقائق و واقعات کا ذخیرہ جس میں وہ تصرف کرے، نہیں ملتا۔ جس طرح انسان بھوک کی شدت میں جب معمولی غذا نہیں پاتا تو مجبور ہوکر گھاس پتی سے اپنا دوزخ بھر کر صحت کو خراب کرلیتا اور اکثر ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح جب قوت متخیلہ کو اس کی معتاد غذا نہیں ملتی تو وہ غیر معتاد غذا پر ہاتھ ڈالتی ہے خیالات دور از کار جن میں اصلیت کا نام و نشان تک نہیں ہوتا، تراش کر بہ تکلف ان کو شعر کا لباس پہناتی ہے اور قوت ممیزہ

کو اپنے کام میں خلل انداز سمجھ کر اس کی اطاعت سے باہر ہو جاتی ہے اور شاعر کو مہمل گو، اور "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق بنا دیتی ہے۔

شاعر کے لیے نیچر کا خزانہ ہر وقت کھلا ہوا ہے اور قوت متخیلہ کے لیے اس کی اصلی غذا کی کچھ کمی نہیں ہے۔ پس بجائے اس کے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کاغذ کے پھول پنکھڑیاں بنائے، اس کو چاہیے کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اور خود اپنی ذات میں قدرت حق کا تماشا دیکھے، جہاں بھانت بھانت کے اصلی پھول اور پنکھڑیوں کے لازوال خزانے موجود ہیں، ورنہ اس کی نسبت کہا جائے گا ؎

جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تو   کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

غالب کی ظرافت

(یہ انتخاب 'یادگار غالب' سے لیا گیا ہے، اس سے مرزا غالب کی ظرافت مزاج اور حفظ وضع پر روشنی پڑتی ہے۔ انداز بیان میں وہ سلاست روانی اور بے ساختگی ہے جو حالی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے)

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے، مگر جو کچھ اُن کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔ عرض کیا پیرو مرشد ایک نہیں رکھا۔

ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا۔ "آبِ چشمۂ حیواں درونِ تاریکیست" جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کے دالان میں بہ سبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا۔ "ایں خانہ تمام آفتاب است۔" ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا "میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔"

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر اٹھتے بیٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت

مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔" مرزا نے کہا "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔"

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی تیار ہو جاتی۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر خود داری اور حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امرا اور عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے وہ بھی کبھی اُن کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آئے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا نے کہا "مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا۔" اس لیے اوّل اوّل وہاں گیا تھا وہاں سے

یہاں آیا ہوں۔" ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چرٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا، مضمون یہ کہ "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف کو گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔" جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے آئے۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شوربا نہیں کھایا۔ اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لیے گھر میں سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالہ میں بوٹیاں اور دوسرے میں لعاب یا شوربا، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔ ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی، ایک اور پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب۔ بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت

پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔"

فواکہ میں آم ان کو نہایت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں ان کے دوست دُور دُور سے ان کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔ ان کے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں اُنھوں نے امام باڑہ ہگلی بندر کے متوفی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں "سختی شکم بندہ ام و قدرے ناتواں ہم آرائش خوان جویم و ہم آسایش جان خرد وراں دانند کہ ایں دو صفت بہ انبہ اندرست و اہل کلکتہ بر آنند کہ قلمرو انبہ ہگلی بندر است، آرے انبہ از ہگلی، و گل از گلشن، ایثار از جناب و سپاس از من، شوق می سگالد کہ تا پایان موسم دو سہ بار بخاطر دلی نعمت خواہم گزشت، و آزی نالد کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نہ خواہم گشت۔"

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ، جن میں مرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا، مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا، مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "پیر و مرشد

یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے ؎

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں   کاین فلاں ابن فلاں ابن فلاں

اسے دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔



حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے۔ ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے

اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بے شک گدھا نہیں کھاتا۔

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفۃً بھیجتے تھے خود بازار سے منگواتے تھے۔ باہر اور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل الحق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل الحق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونا چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی جھانجھ

میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ بہت خیرخواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے، جس سے اس کی حدّت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں :-

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوئے اوست آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط کے اس کافر نشے کی عادت نے آخر مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے ان کے تمام اردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے۔ ایک دن میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے، میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا۔ بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہ گار کرتا ہے؟ انھوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دے دیجیے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے، انھوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا بھئی کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔

ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کو کھانا کھا

رہے تھے اور کھانے میں صرف خامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ" نواب عبدالاحد خاں کے دستر خوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے، مگر خاص اُن کے لیے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اس کے سوا کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز ان کے لیے مزعفر پکا تھا وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا جو اس وقت دستر خوان پر موجود تھا۔ نواب نے اس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی۔ اس کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا" حضور اور رکابی کیا کیجیے گا اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔" نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے" جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو۔ کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؟ نہ تناسب ہے،

نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے، نہ بوٹا، مگر بادشاہ خود مختار ہے۔ کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے تھے جب تھوڑی دیر ٹھہر کر آپ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھوں میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے، تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔ مرزا نے کہا۔"میں آپ کو جوتا دکھانے کے لیے شمع دان نہیں لایا بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

مزید مطالعہ کے لیے: حیات جاوید کے اقتباسات

یادگار حالی — صالحہ عابد حسین

مطالعۂ حالی — شجاعت علی سندیلوی

مشقیں

۱۔ حالی کا جی پرانی شاعری سے کیوں سیر ہو گیا تھا؟ انھوں نے پرانی شاعری کا جو خاکہ اُڑایا ہے اُس کی وضاحت کرو اور مثال کے لیے پڑھی ہوئی شاعری سے اشعار تلاش کرو۔

۲۔ حالی نے اپنے مسدّس کو اُبالی کھچڑی اور بے نمک مرچ کا سالن کہا ہے۔

حلقہ نظم میں مسدس کا انتخاب پڑھ کر اس رائے پر اپنے خیالات ظاہر کرو۔

۳۔ مرزا غالب کی شخصیت کے کن پہلوؤں کو حالی نے اپنے مضمون میں اُبھارا ہے۔ تم اپنے کسی دوست کا حال اسی طرح بیان کرو۔

۴۔ دلِ زندہ۔ خوش نما پودا۔ جھوٹا عاشق۔ حسن یوسفی۔ بیس برس۔ پاؤسیر گوشت وغیرہ مرکب الفاظ پر غور کرو۔ ان سے صفت کی قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔

اَ۔ ذاتی، جس سے اسم کی ذات کی اچھائی یا برائی معلوم ہو جیسے زندہ، خوش نما، جھوٹا۔

ب۔ نسبتی، جس سے کسی چیز سے لگاؤ یا تعلق معلوم ہو جیسے یوسفی، جاپانی، کشمیری وغیرہ۔

ج۔ عددی، جس سے اسم کی تعداد معلوم ہو جیسے بیس، پانچ، دسواں وغیرہ

د۔ مقداری، جس سے موصوف کی مقدار معلوم ہو جیسے پاؤسیر، چار ماشہ وغیرہ

ان قسموں کی اور مثالیں پڑھے ہوئے اسباق سے چھانٹو۔

مزید مطالعہ کے لیے :- یادگار حالی از صالحہ عابد حسین
مطالعہ حالی - از شجاعت علی سندیلوی

سوالات

۱- مضمون نگار نے تخیل کی کیا تعریف کی ہے؟
۲- سر والٹر اسکاٹ نے اچھی نظموں کی کیا خصوصیات بتائی ہیں؟
۳- مرزا کی شخصیت کے کس پہلو کو حالی نے اس مضمون میں ابھارا ہے؟

مشقیں

۱- حالی نے تخیل کی جو مثالیں دی ہیں ان کی وضاحت کے لیے تم اپنی یادداشت سے چند اشعار پیش کرو۔

۲ ارزاں چیز، جام سفال، حسن یوسفی، لازوال خزانے، حیوان ظریف، بیس برس، پاؤ سیر گوشت۔ تین پیسے بھر دہی وغیرہ مرکب الفاظ پر غور کرو، ان سے صفت کی قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔

ا - **ذاتی**، جس سے اسم کی ذات کی اچھائی یا برائی یا کوئی اور خصوصیت معلوم ہو، ارزاں، سفال، ظریف وغیرہ

ب- **نسبتی**، جس سے کسی چیز سے لگاؤ یا تعلق ہو جیسے، یوسفی، کشمیری اور جاپانی وغیرہ

ج- **عددی**، جس سے اسم کی تعداد معلوم ہو جیسے، دس، بیس اور دسواں وغیرہ

د- **مقداری**، جس سے موصوف کی مقدار کا پتہ چلے، جیسے، پاؤ سیر۔ چار ماشہ، اور تین روپیہ بھر وغیرہ

ان قسموں کی اور مثالیں پڑھے ہوئے اسباق سے چھانٹو،

پنڈت رتن ناتھ سرشار

سنہ ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، کشمیری پنڈت تھے۔ زمانے کے رواج کے مطابق پہلے فارسی و عربی پڑھی بعد میں کیننگ کالج میں داخل ہوئے لیکن کوئی سند حاصل نہ کر سکے۔ فارسی سے خاندانی لگاؤ تھا۔ بلا کے طباع، حاضر جواب اور ہنسوڑ تھے۔ ذہانت خداداد تھی، اہل علم کی صحبت نے اس کو چار چاند لگا دیے۔ کچھ دن معلمی اور ہائی کورٹ میں ملازمت کی آخر اردو کے انشا پرداز بنے۔ اخبار و رسائل کے مضامین سے ان کی ادبی زندگی شروع ہوئی۔ منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" کی ایڈیٹری ان کے سپرد کی۔ اسی اخبار میں ان کا ادبی شاہکار "فسانۂ آزاد" قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ اتنا مقبول ہوا کہ ساری عمر سرشار کو افسانہ نویسی کے سوا کسی اور قسم کی تحریر کا خیال بھی نہ آیا۔ اودھ اخبار سے علاحدہ ہو کر سنہ ۱۸۹۵ء میں سرشار نے حیدر آباد کا رخ کیا اور بقیہ زندگی وہیں گزاری۔ شراب نوشی کی کثرت موت کا سبب ہو گئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

سرشار، قدیم و جدید افسانہ نگاری کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کے افسانے جو داستان اور ناول کے بین بین ہیں سب کشمیر کے زعفران زار ہیں۔ انھیں پڑھ کر کوئی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکتا۔ روتوں کو ہنسا دیتے ہیں مگر موقع پا کر نصیحت کی چٹکیاں بھی لیتے جاتے ہیں۔

وسعت زبان کے لحاظ سے انھیں اردو پر وہ قدرت حاصل تھی جو اردو کے کم انشا پردازوں کو نصیب ہوئی ہے۔ وہ قدیم و جدید ہر رنگ کی زبان لکھنے پر عبور رکھتے تھے۔ پوربی بولیوں پر بھی عبور تھا۔ ان سے بھی حسب دل خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔

جام سرشار، سیر کہسار (دو جلدیں) خدائی فوج دار اور فسانۂ آزاد (چار جلدیں) ان کی خاص تصانیف ہیں۔ ان میں فسانۂ آزاد کو مقبولیت عام اور شہرت دوام حاصل ہوئی ہے۔ اس طویل افسانے میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی دل کش اور جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔

نیچریہ شاعری

میاں آزاد ایک دفعہ سیر کرتے ہوئے ایک شہر میں داخل اور ہوٹل میں فروکش ہوئے۔ جھٹپٹے وقت ہوا کھانے چلے، تو کیا دیکھا کہ سرائے کی ایک کوٹھری کے برانڈے میں چار پانچ سفید پوش مکلف فرش پر بیٹھے عظیم اللہ خانی حقے مشک بو دھواں دھار اُڑا رہے ہیں اور گلوریاں چبا رہے ہیں، مگر سب موزوں طبع شعرائے نازک خیال و شیریں مقال۔ حامیؔ، علامیؔ، فہامیؔ، وفّادؔ اور جوّادؔ۔ ایک شاعر نے کہا کہ بھئی ہم تینوں کے تخلص کا وزن ایک ہے۔ علامیؔ، فہامیؔ اور حامیؔ مگر تم دو ہی ہو وفاد اور جواد، ایک اور شاعر آجائے تو چھ کا کورم خوب ٹھہرے۔ اتنے میں میاں آزاد تڑ سے پہنچ گئے۔ ایں، آپ کون؟ شاعر غرّا۔ آپ تخلص کیا کرتے ہیں؟ "آزاد"

ان سب کی باچھیں کھل گئیں کہ اچھا قافیہ ملا۔ لو صاحب! اب جواد، وقاد اور آزاد یہ تین شعرا بھی ہم قافیہ تخلص والے جمع

ہو گئے۔ بھئی خوب آئے۔ واللہ آپ ہی کی کسر تھی۔ اب شعر خوانی ہونے لگی۔ ایک شعر پڑھتا ہے، باقی داد دیتے ہیں۔

سبحان اللہ! واہ میر صاحب! یہ حضور ہی کا حصہ تھا۔ بارک اللہ کیا خداداد طبیعت پائی ہے۔ واللہ کیا ذہن کی رسائی ہے۔ پھر فرمایئے گا۔ حضرت، خدا کی قسم قلم توڑ دیے۔ کیا روزمرہ ہے! ہائے اس بول چال کے صدقے۔ واللہ کیا خوب تقسیم ہے۔ ٹوپیاں اچھل رہی ہیں۔ کوئی جھومتا ہے، کوئی وجد کرتا ہے۔

آزاد۔ میاں سنو! ایں جانب اس شاعری کے قائل نہیں ہیں۔ ہمیں تو نیچریہ کلام پسند ہے۔ یہاں اس شاعری کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ لوگ تو زبان پر مرتے ہیں اور وہم خیالات پر جان دیتے ہیں۔ شاعری تو انگریزی پر ختم ہے۔

نیچر! نیچر! ہائے نیچر، واے نیچر! نیچر کہاں پایئے۔ گل و بلبل کا عشق، معشوق کے قد کو تاڑ بنایا اور در پردہ کُلُّ طَوِیلٍ الخ کی پھبتی سنائی۔

فہامی۔ اخاہ! آپ نیچریے ہیں۔ انیسیے اور دبیریے تو سنتے تھے، آپ نیچریے پیدا ہوئے۔ غضب خدا کا، ایسا کلام دل کش پسند نہیں۔ یہ ان شعرا کا کلام فصاحت[۱] التیام ہے جو پیغمبر شعر گوئی تھے، جن کا سب کلمہ پڑھتے ہیں، بلکہ خدائے سخن تھے۔

آزاد۔ بندہ صاف گو، صاف باطن آدمی ہے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا۔

---

[۱] خوش بیانی سے بھرا ہوا۔

یہ شاعری نہیں، خبط ہے۔ بے تکا پن ہے۔ مبالغہ بھی تو کتنا، کچھ ٹھکانا ہے۔ جھوٹ کے چھپر اڑا دیے۔ تو اب کان کھول کر نیچر یہ کلام سنو۔ اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ سرائے بھر گونج اٹھی۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ بڑی دیر تک ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔

فہامی۔ واہ قبلہ واہ۔ آپ کی نیچریت کے صدقے، اچھی گٹ پٹ ہے۔

آزاد۔ حضرت شیخ کیا جانیں صابون کا بھاؤ۔ اندھے کے آگے رونا اپنی آنکھوں کا کھونا۔ بھینس کے آگے بین بجائے، بھینس کھڑی پگرائے۔ میاں آزاد نے اپنی نیچر یہ شاعری کی تعریف کے وہ پل باندھے کہ بحر ظلمات پٹ جائے۔ تعریف کیا تھی ایک سمندر تھا جس کی اور نہ چھور۔ ممکن کیا کہ کوئی تھاہ پائے۔ ادھر یہ پانچوں اردو کی شاعری پر غش۔ آتش و میر کے روزمرہ پر غش غش کرتے تھے۔ ناسخ کی بلاغت، انیس کی فصاحت، ذوق کی تشبیہ، غالب کے کلام ادق و خیالات نفیس، مومن کی زبان سلیس، امیر کے استادانہ کلام کی بڑھ بڑھ کر تعریف کرتے تھے۔ اب فرمایئے فیصلہ کون کرے۔ بھٹیاری جھگڑا چکانے سے رہی۔ بھٹیارا گھاس چھیلنا جانے، شاعری علم دریا ہے۔ آخر فریقین کی یہ رائے قرار پائی کہ شہر چلیے جو پڑھا لکھا آدمی پہلے ملے وہی حکم جو کہہ دے آمنا و صدقنا منظور۔

سب نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ چلنے ہی کو تھے کہ بھٹیاری نے ان کو للکارا اور جھک کر میاں جواد کا دامن لیا۔ میاں! یہ ٹیتے کسی اور کو

بتانا۔ ہم بھی اس شہر میں اتنے بڑے ہوئے ہیں۔ ہوں تو ابھی آپ کی لڑکی کے برابر میں[1] مگر سیکڑوں ہی کنوؤں کا پانی پی ڈالا۔ پہلے کوڑی کوڑی بائیں ہاتھ سے رکھ جائیے پھر اسباب اٹھائیے اور تشریف کھسکائیے۔

علامی۔ نیک بخت، یہ شریف بھلے مانس ہیں۔ کہیں دو پیسے کے لیے شرفا ایمان بیچا کرتے ہیں؟ چلو دامن چھوڑ دو۔ ابھی دم کے دم میں آئے۔

بھٹیاری۔ اس دم میں بندی نہ آئے گی۔ ایسی باتوں میں نہ آنے کی۔ ایسے بڑے ساہوکار کھرے آدمی ہو تو ایک گنڈا چپکے سے نکال دو نہ۔ اے واہ میاں، بڑا اکھراپن دکھاتے ہیں۔ یہاں اس ۱۹ برس کی عمر میں ہزاروں ہی چرا ڈالے ہوں گے۔

وقاد۔ یہ منڈچری[2] ہے یا بھٹیاری۔ عورت ہے یا ڈائن۔ آڑی سواری۔ صاحب، اللہ اس سے پیچھا چھڑاؤ ورنہ ریش مبارک پر ہاتھ ڈالا ہی چاہتی ہے۔ بھئی۔ ایسی بھٹیاری دیکھی نہ سنی۔

بھٹیاری۔ میاں کچھ بیدھے تو نہیں ہو یا بلی نانگھ کر گھر سے چلے تھے؟ یہ لام کاف[3] ذری زبان سے نہ نکالو۔ ہوں چھوٹی تو کیا ہوا، پر بس کی گانٹھ ہوں۔ میرے کاٹے کا منتر نہیں۔

میاں جواد آدمی تھے صلح کل۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مفت میں دھرے گئے تو کہا بھئی تم پانچوں جاؤ۔ ہم یہاں بی مہترانی کی تشفی

---

[1] لیکن [2] منڈن [3] واہی تباہی۔

کے لیے بیٹھے ہیں۔ تم لوگ ہٹ آؤ۔ خیر وہ سب تو ادھر چلے اور جواد سرائے ہی میں زیر حراست بی بھٹیاری رہے۔ دو چار منٹ بعد پکارتے ہیں کہ بی مہترانی! میں لیٹا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو، پیٹ میں چوہے دوڑیں کہ رفو چکر ہوئے۔ پھر تین منٹ کے بعد گلا پھاڑ کر چلانے لگے بھٹیاری! بھٹیاری! ہم بھاگنے والی آسامی نہیں۔ تم بے فکری سے دال بگھارو۔ جب بار بار انھوں نے چھیڑنا شروع کیا تو وہ آگ بھبوکا ہو گئی۔

بھٹیاری۔ میاں! میں ایسے دو پیسے سے درگذری۔ بلی بخشے، چوہا لنڈورا ہی جیے گا۔ تم نے تو غل مچا مچا کر میرا کلیجا پکا دیا، ناکوں میں دم آگیا۔

آپ جائیں بلکہ کھٹیا سمیت دفان ہوں، تو میں خوش میرا اللہ خوش۔ یہ بات وہ بات ٹکا لا میرے ہاتھ۔ اے واہ دیکھی تیری کالپی اور باون پورے۔ اجاڑ میاں، ہوں تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، مجھے تو نگوڑی گنتی بھی نہیں آتی، مُل ناک پر تو مکھی بیٹھنے دیتی نہیں۔

آٹھوں کا میلہ

(اس اقتباس میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کا نہایت اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے
زبان و بیان میں سرشار کے طرز بیان کی تمام خوبیاں موجود ہیں)

آٹھوں کا میلہ

وہاں سے جو میاں آزاد تیر کی طرح رواں ہوئے تو راہ میں دیکھا کہ کئی مسافر لدے پھندے جا رہے ہیں۔ کیوں بھئی اس وقت کہاں؟ لکھنؤ! لکھنؤ؟ یہ کیوں؟ کیوں کیا۔ آٹھوں کا میلہ ہے یا نہیں۔ اس دھوم دھڑکے کا میلہ دیکھا نہ سُنا۔ ہاں تو اب ہم بھی چلتے ہیں۔ محرم الحرام اور بہار بسنت کے تو خوب مزے اڑائے۔ اب چلیے یہ میلہ بھی دیکھ لیں۔ کیا جانیں پھر ہاتھی چھوٹے گھوڑا چھوٹے۔ یہ کہہ کر میاں آزاد بھی لکھنؤ چلے۔ نور کے تڑکے داخل۔ سبحان اللہ کیا صبح ہے عارفانِ حق پرست کے دل کی طرح نورانی اور باطن میں اہل تصوف کے مثل مہبط فیض ربانی۔ جدھر دیکھو تجلیّ اور نور۔ جدھر جاؤ لطف اور سرور۔ سلطان خاوری کے تاج زرّیں کی چمک اشعۂ زرنگار سے ذروں کی جھلک نمودار در و دیوار سے آیۂ وَجَعَلْنَا الشَّمْسَ ضِیَاءً آشکار۔ شنبہ کا دن جس کی شان میں فصحانے کہا ہے (کہ مکتب خانہ ہا را رونہ بازار از دست واطفال دبستاں سبق آموز او الف ابجد زبانان ست ونقطۂ اولین پرکار دوراں) دیکھتے کیا ہیں کہ صبح ہی سے میلے کا رنگ جما ہے۔ نخل بہار کی نشو ونما ہے۔ غٹ کے غٹ، ٹھٹ کے ٹھٹ،



شہدے لچے۔ لوڑے بچے۔ گرہ کٹ جیب کترے۔ چرسیے۔ مدکیے۔ گنجڑے بھنگیڑے۔ شریف ونجیب۔ زیرک ولبیب، سب جوق جوق اُمنڈے آتے ہیں۔ تامدان۔ ہوادار۔ رہوار باد رفتار۔ فینس زرنگار۔ ٹٹو گھوڑا اسب خراماں خراماں یوقدمے آتے ہیں۔ بگھی پر بگھی ٹوٹی پڑتی ہے، رنگیلوں چھیل چھبیلوں کی بن آئی۔ گاڑی بوٹی چڑھائی۔ بن ٹھن کے چھیلا بن کے میلا دیکھنے چلے۔ بالوں میں حنا کا تیل چھوڑے، کیچل لپیٹ کا دھانی رومال اوڑھے، دو انگل مانگ کھولے، بانڈی سے ٹپی جمائے گھڑی لگائے۔ ڈاڑھی چڑھائے گلے میں گلوبند دل فریب۔ شربتی کا انگرکھا تن کا زیب۔ پاؤں میں مخملی جوتی، کاشانی یا سوتی قہقہے اڑاتے آنکھیں لڑاتے جارہے ہیں۔ ادھر اُدھر نظارہ بازی کر کے مسکرا رہے ہیں فینس پر ماہ رو ٹھسے سے بیٹھی ہیں مگر بند۔ ہٹو بچو کا شور بلند۔ ساقیوں کا بازار گرم۔ کسی نے دو کش پیے ٹکا ہتھیایا۔ ساقیوں کی دکانیں دھواں دھار۔ تنبولیوں کے بڑے مزے دار۔ کان میلے کی سرگوشی۔ حجام کی رونمائی، برف والے کی سرد مہری۔ سنکرنوں کی ہانک، آنب کے مجے کی کمر کھ ہیں۔ کابل کا میوہ۔ رس بھری۔ تاج گلابیاں شہتوت۔ بوٹ لوہرے بھرے بوٹ۔ کسی طرف سرمہ مسی شیشہ کنگھی دیا سلائی کی ڈبیا ہے۔ بخشی بھولا ناتھ کا باغ میلے کا چشم و چراغ ہے۔ ٹکیٹ رائے کا تالاب ہزار دل میں انتخاب لاکھوں میں لاجواب ہے جو سلسبیل کوثر کو شرمائے، تسنیم دیکھے تو پانی پانی ہو جائے۔ عجیب لطف وسماں ہے۔ ہزار ہا تماشائی تالاب کے

اردگرد بستر جمائے کوئی دری کوئی زین پوش بچھائے بیٹھا میلہ دیکھ رہا ہے۔ کوئی جہانیاں جہاں گشت چکر لگا رہا ہے۔ کوئی ہوا کھاتا ہے، کوئی فینس پر ایک جوان رعنا ڈھوہ کا ڈھوہ پچیس برس کا سن، چلنے پھرنے کے دن لدا ہوا جا رہا ہے۔ کوئی ٹٹو کو تخ تخ کرتا آ رہا ہے۔ امرا کے لڑکے زیور سے گوندنی کی طرح لدے مٹھائی خریدنے میں مصروف ہیں، مگر خدمت گار دیکھ بھال رہا ہے کہ کوئی دست چالاک ہاتھوں ہاتھ بالوں کے گھونگھرو نہ اڑا لے۔ عورتیں الگ زیور سے متجلی گھونگھٹ کاڑھے دبکی چلی جاتی ہیں کہ کوئی چوہے دتیاں نہ موس لے جائے۔ تخت رواں آتے ہیں۔ شعبدہ باز سوانگ لاتے ہیں۔ کوئی دہکتا انگارا کھا گیا۔ کوئی لوہے کے چنے کر کرکر کے چبا گیا۔ برہمن ڈول لیے گشت لگاتے ہیں۔ سقے اور بھشتی کٹورے کھنکھناتے ہیں۔ سہ پہر تک خوب جمگھٹا رہا۔ چراغ روشن ہوئے اور یار لوگ کھسکے۔ کسی نے مٹی کا ہوا لیا۔ کسی نے روئی کا لنگور۔ اتنے میں ایک ریلا آیا کھلونے چکنا چور۔ ایک نے غل مچایا کہ وہ ہاتھی آیا۔ بھیڑ چھٹ گئی اور ورلاتے ہوئے چلے مگر بگڑے دل اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ شرتی کا انگرکھا چاہے ان گاؤ زوریوں میں چر سے نکل جائے مگر ممکن کیا کہ ہل جائے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں پولیس کا انتظام خوب رہا۔ چوٹے اچکے جاکر نہ پچھتائے بھلے مانس مزے سے گھر آئے۔

مزید مطالعہ کے لیے :- خوجی از ۔ ڈاکٹر محمد حسن
تنقیدی اشارے از ۔ آل احمد سرور

سوالات

۱۔ میاں آزاد نے نیچریہ شاعری کی کیا تعریف کی؟
۲۔ بھٹیاری کس مزاج اور طبیعت کی تھی؟
۳۔ مضمون نگار نے میلے کا کیا نقشہ کھینچا ہے؟

مشقیں

۱۔ ان مضامین میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی جو جھلک ملتی ہے اس کی تصریح کرو اور اس کا مقابلہ اس زندگی سے کرو جس کی جھلک فسانۂ عجائب میں ملتی ہے۔

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ میں واحد کی جمع اور جمع کے واحد لکھو۔
شعرا، نور، اشعہ، عارفان، شے، زیور۔ اطفال۔ فصحا۔

۳۔ ان جملوں پر غور کرو اور ایسے ہی اور جملے سبق سے چھانٹو۔ سب جوق جوق امڈے چلے آتے ہیں، سب خراماں خراماں پو قدمے آتے ہیں، ساقیوں کی دکانیں دھواں دھار تنبولیوں کے بیڑے مزے دار، تسنیم دیکھے تو پانی پانی ہو جائے، کوئی جہانیاں جہاں گشت چکر لگا رہا ہے، کوئی فینس پر ایک جوان رعنا ڈھوکا ڈھوہ پچیس برس کا سن چلنے پھرنے کے دن لدا ہوا جا رہا ہے۔

۴۔ پچھلے سبق میں تم صفت کی قسمیں پڑھ چکے ہو، اب ان الفاظ پر غور کرو۔
مکمّل، مکمّل تر اور مکمّل ترین، ان سے صفت کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں، انھیں تفضیل نفسی، تفضیل بعض اور تفضیل کل کہتے ہیں۔

صفت کے درجے	مثالیں
۱ تفضیل نفسی	مکمل، اچھا، بڑا، وغیرہ
۲ تفضیل بعض	مکمل تر، بہت اچھا، بہت بڑا، وغیرہ
۳ تفضیل کل	مکمل ترین، سب سے اچھا، سب سے بڑا

علامہ شبلی نعمانی

موضع بند دل ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے مستند اور مشہور علما سے عربی و فارسی پڑھی اور دیگر مشرقی علوم و فنون میں فیض حاصل کیا۔ پھر سرسید کے انتخاب پر ۱۸۸۳ء میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو کر علی گڑھ پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات مشہور عالم پروفیسر آرنالڈ سے ہوئی۔ پروفیسر آرنالڈ کی صحبت کا ان پر گہرا اثر پڑا اور انھیں انگریزی ادب اور تنقید سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں پروفیسر آرنالڈ کے ہم راہ بلاد اسلامیہ کی سیر بھی کی۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد علامہ شبلی نے علی گڑھ کو خیرباد کہا۔ کچھ دن حیدرآباد میں محکمۂ تعلیمات کے ناظم کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ندوۃ العلما لکھنؤ کی خدمت اپنے ذمہ لی اور بالآخر ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ واپس آکر دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔

یہ ادارہ آج تک اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ یہاں سے ایک معیاری ماہانہ رسالہ "معارف" نکلتا ہے۔

مولانا شبلی کی ذات ہمہ گیر اور جامع صفات تھی اور ان کا شمار اردو کے خاص محسنوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ، ادب اور اسلامی علوم پر انھوں نے انتہائی کامیابی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کی حیثیت ایک صاحب کمال فن کار کی ہے۔ انھوں نے جس موضوع کو لیا اس میں تحقیق و تنقید کا حق ادا کر کے ایک نئی شان پیدا کر دی۔

وہ اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ تحریر میں عالمانہ سنجیدگی اور منطقی طرز استدلال کے ساتھ ساتھ شوکت و رعنائی ملتی ہے۔ عبارت میں کہیں خشکی نہیں آنے پاتی۔ متفرق مضامین کے

مجموعوں کے علاوہ شبلی کی مشہور تصانیف یہ ہیں:۔

سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان، الغزالی سوانح مولانا روم، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، سفر نامۂ روم، مصر و شام۔ اردو نظم میں مثنوی صبح امید اور قطعات بہت مشہور ہیں۔

زیب النسا بیگم

(علامہ شبلی کے اس مضمون سے اندازہ ہوگا کہ مغل بادشاہوں میں بیگمات کی تعلیم و تربیت کس طریقے سے ہوتی تھی اور اس پر کتنا زور دیا جاتا تھا)

زیب النسا اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی۔ اس کی ماں جس کا نام "دل رس بانو بیگم" تھا، شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی تھی۔ شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں ہے۔ جہاں گیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہو کر شاہ نواز خاں کے خطاب سے ملقب ہوا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں بھی کارہائے نمایاں کیے۔ چوں کہ لیاقت ذاتی کے ساتھ عالی خاندان بھی تھا، شاہ جہاں نے سنہ ۱۰۴۷ھ میں کہ اس کی سلطنت کا دسواں سال تھا، اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی سے کر دی۔

زیب النسا شادی کے دوسرے سال شوال سنہ ۱۰۴۸ھ میں پیدا ہوئی۔ عالم گیری امرا میں عنایت اللہ خاں نہایت معزز عہدہ دار تھا۔

اس کی ماں حافظہ مریم قابل اور تعلیم یافتہ تھی۔ زیب النسا جب پڑھنے کے قابل ہوئی، تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لیے حافظہ مریم کو مقرر کیا، جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ زیب النسا نے قرآن مجید حفظ یاد کیا۔ جس کے صلے میں اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفی انعام میں دیں۔

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النسا نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی حاصل کی تھی اور بڑے بڑے علما وفضلا اس کی خدمت میں رہتے تھے۔ لیکن اس کے اساتذہ میں سے زیادہ مقرب اور بار یاب ملا سعید اشرف مازندرانی تھے۔ ملا سعید، تقی مجلسی کے نواسے تھے۔ عالم گیر کے آغاز جلوس میں ایران سے آئے اور عالم گیر نے ان کو زیب النسا کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔ اس وقت زیب النسا کی عمر تقریباً اکیس برس کی تھی۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ تیموریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر رائج ہوتا تھا۔ زیب النسا نظم ونثر میں ملا سعید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔

زیب النسا نے جس قسم کی تعلیم پائی تھی اور خود اس کا مذاق طبیعت جس قسم کا واقع ہوا تھا اس کے لحاظ سے وہ پالیٹکس سے بالکل ناآشنا تھی۔ تاہم عالم گیر کے پر پیچ عہد حکومت میں وہ بھی اس بدنامی سے نہ بچ سکی۔ سنہ ۱۰۹۱ھ میں راج پوتوں نے جب عام بغاوت کی اور عالم گیر نے اس کے دبانے کے لیے شاہ زادہ اکبر کو فوج گراں دے کر جودھ پور کی طرف

روانہ کیا تو راج پوتوں کے بہکانے سے شہزادہ خود باغی ہو گیا اور عالم گیر کے مقابلے کو بڑھا۔ زیب النسا اور شہزادہ اکبر حقیقی بھائی بہن تھے۔ دونوں میں خط وکتابت بھی تھی۔ یہ خطوط پکڑے گئے اور عالم گیر نے اس کے انتقام میں زیب النسا کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی، بند کردی۔ اس کے ساتھ تمام مال ومتاع ضبط کر لیا گیا اور قلعہ سلیم گڈھ میں رہنے کا حکم ہوا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد اس کی بے گناہی ثابت ہوئی اور عفو قصور کر دیا گیا۔ کیوں کہ ۱۰۹۴ھ میں جب حمیدہ بانو بیگم (والدۂ روح اللہ خاں) نے انتقال کیا، تو رسم تعزیت ادا کرنے کے لئے عالم گیر نے زیب النسا کو روح اللہ خاں کے گھر بھیجا۔ اسی سنہ میں جب شہزادہ کام بخش (عالم گیر کا سب سے چھوٹا بیٹا) کی شادی ہوئی، تو تقریب کی رسمیں زیب النسا ہی کے محل میں ہوئیں اور عالم گیر کے حکم سے تمام ارکان دربار زیب النسا کی ڈیوڑھی تک پا پیادہ گئے۔

زیب النسا نے شادی نہیں کی۔ عام طور سے مشہور ہے کہ سلاطین تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یوروپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے۔ لیکن یہ قصہ ہی ایک سرے سے بے بنیاد ہے۔ خود عالم گیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النسا بیگم اور زینت النسا بیگم سپہر شکوہ وایزد بخش (پسران شہزادۂ مراد) سے بیاہی تھیں۔ چناں چہ مآثر عالم گیری میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمہ کتاب میں بھی

اس کا ذکر کیا ہے۔ عالم گیر زیب النسا کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ جب وہ کبھی باہر سے آتی تھی، تو اس کے استقبال کے لیے شہزادوں کو بھیجتا تھا۔ سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا۔ کشمیر کے دشوار سفر میں بھی وہ ساتھ تھی۔ لیکن جب عالم گیر دکن گیا، تو اس نے غالباً اپنی علمی زندگی کی وجہ سے پایۂ تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی چھوٹی بہن زینت النسا عالم گیر کے ساتھ گئی چناں چہ اس کا نام بار بار واقعات میں آتا ہے۔ زیب النسا نے دلی میں قیام کیا اور وہیں پیوند زمیں ہو گئی۔ زیب النسا نے ۱۱۱۳ھ میں جو عالم گیر کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا، دلی میں انتقال کیا۔

عالم گیر اس زمانے میں دکن کے فتوحات میں مصروف تھا۔ یہ خبر سن کر سخت غم زدہ ہوا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے اور باوجود انتہا درجے کے استقلال مزاج کے صبر کی تاب نہ لا سکا۔ سید امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ خاں کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصال ثواب کے لیے زکوٰۃ و خیرات دیں اور مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔

تمام مورخین نے بہ تصریح لکھا ہے کہ زیب النسا علوم عربیہ اور فارسی زبان دانی میں کمال رکھتی تھی۔ نستعلیق، نسخ اور شکست خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، لیکن اس کی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی اور دیوان مخفی جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اسی کا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کے تخلص یا دیوان کا ذکر نہیں۔

زیب النسا کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈیمی (بیت العلوم) تھی۔ ہر فن کے علما اور فضلا نوکر تھے جو ہمیشہ تصنیف اور تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں۔ یعنی ان کتابوں کا پہلا جز "زیب" کا لفظ ہوتا تھا۔ اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے وہ کتابیں زیب النسا کی تصنیفات میں شمار کیں۔

زیب النسا نے جو کتابیں تصنیف کرائیں، ان میں زیادہ قابل ذکر تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے۔ یہ مسلم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں، اس لیے زیب النسا نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے، حکم دیا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنان چہ اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا ہے کہ وہ زیب النسا کی مستقل تصنیف ہے۔

زیب النسا نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانے کا ہونا بھی ضرور تھا جس سے مصنفین فائدہ اٹھا سکیں۔ چنان چہ بیگم موصوف نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا۔ مصنف مآثر عالم گیری کا بیان ہے کہ اس کتب خانے کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی۔

میر انیس کی شاعری کے چند محاسن

(یہ اقتباس علامہ شبلی کی مشہور تصنیف "موازنۂ انیس و دبیر" سے منتخب کیا گیا ہے جس میں میر انیس کی شاعری کی فنی خصوصیات سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اردو تنقید میں اس کتاب کا ایک خاص درجہ ہے۔
علامہ شبلی کی چند اور مشہور تصانیف میں "شعر العجم"، "سیرۃ النبی"، "المامون"، "الفاروق" اور "النعمان" وغیرہ)

تشبیہات و استعارات

یہ چیزیں حسن کلام کا زیور ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم و نثر اور تقریر و تحریر میں جو کچھ جادوگری ہے بہت کچھ انھی کی بدولت ہے، لیکن جس طرح ہر چیز جب تک نیچرل حالت میں رہتی ہے اس کا اصلی حسن قائم رہتا ہے، جب تکلف اور تصنع شروع ہوتا ہے تو اثر میں کمی آجاتی ہے اسی طرح تشبیہ اور استعارے میں بھی جب بہ قصد و تکلف غرابت اور غیر معتدل ندرت پیدا کی جاتی ہے تو اصلی اثر جاتا رہتا ہے۔

انسان میں فطرۃً یہ بات پیدا کی گئی ہے کہ وہ اشیا کی تصویر سے لطف اٹھاتا ہے۔ ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہوگی۔ لیکن اگر کوئی ہو بہو اس کی تصویر کھینچ دے تو ہم کو لطف آئے گا اور جس قدر زیادہ اصل کے مطابق ہوگی اسی قدر طبیعت پر لطف اور استعجاب کا زیادہ اثر ہوگا۔ چوں کہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے اس لیے طبیعت کا اس سے محظوظ اور متلذذ ہونا ایک فطری امر ہے۔

تشبیہ کی دو قسمیں ہیں۔ مفرد، مرکب۔ مفرد جس طرح چہرے کو

پھول سے تشبیہ دی جائے۔ مرکب جس طرح کہا جائے میدان جنگ میں گرد اٹھی تو اس میں تلواریں اس طرح چمکتی تھیں جس طرح شب میں ستارے ٹوٹتے ہیں۔
مفرد تشبیہ میں چنداں جدت نہیں ہو سکتی۔ اولاً تو اس وجہ سے کہ مفرد چیزوں کی طرف ہر شخص کا خیال منتقل ہو سکتا ہے۔ ثانیاً مدت سے شعرا اور اہل قلم اس قسم کی تشبیہ سے کام لے رہے ہیں، اس لیے عالم قدرت میں جو چیزیں تشبیہ کے قابل تھیں اکثر کام میں آ چکیں۔ مثلاً چہرے کو پھول، آفتاب، مہتاب اور آئینے سے تشبیہ دے سکتے تھے۔ سو سو دفعہ دے چکے۔ اب عالم فطرت میں کوئی نئی چیز پیدا ہو تو چہرے کی تشبیہ میں بھی جدت پیدا ہو۔ البتہ مرکب تشبیہ میں ہر وقت جدت پیدا ہو سکتی ہے کیوں کہ اول تو ترکیب کی ہزاروں صورتیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ چند اشیا کی ترکیب سے جو مجموعی ہیئت پیدا ہوتی ہے اس کی طرف ہر شخص کا خیال نہیں منتقل ہو سکتا۔

ایک اور نکتہ سمجھ لینے کے قابل ہے۔ تشبیہ کی اصلی خوبی یہ ہے کہ مشبہٌ کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور نیچرل شاعری میں جیسا کہ قدمائے عرب کی شاعری تھی تمام تشبیہیں اس قسم کی ہوتی تھیں۔ لیکن ایک مدت سے ایشیائی شاعری، نیچرل حالت سے دور پڑ گئی ہے۔ اس لیے آج کل اس قسم کی تشبیہات کا ڈھونڈھنا بے فائدہ ہے۔ تاہم تشبیہ کی خوبیاں جس قدر میر انیس کے کلام میں پائی جاتی ہیں اردو زبان میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ان کی تشبیہات میں جو خصوصیات ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اکثر تشبیہات مرکب ہیں۔

۲۔ اکثر تشبیہات قریب الفہم ہیں۔

۳۔ علمائے معانی نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کبھی مشبہ کی رفعت اور

حسن اور کبھی تحقیر و ذلت اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہے۔ یہ باتیں میر انیسؔ کی تشبیہات میں کمال کے درجے پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت عبّاس پر جب ہر طرف سے برچھیاں چلنے لگی ہیں تو اس حالت کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے　　　جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

برچھیوں سے زخمی ہونا (ظاہری نظر میں) شکست اور مغلوبیت کی حالت ہے، اس لیے اس کے بیان کرنے سے ذلت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس تشبیہ نے حالت بدل دی۔

یا مثلاً جب حضرت عباس کے دونوں ہاتھ تلوار سے کٹ کر گر پڑے اور انھوں نے مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا تو اس حالت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

"مشکیزہ تھا کہ شیر کے منہ میں شکار تھا"

مشکیزے کا منہ میں لینا ایک بدنما صورت ہے۔ لیکن اس تشبیہ نے بدنمائی کے بجائے شان پیدا کر دی ہے۔

یا مثلاً جب تمام اہل بیت ایک ہی رسن میں قید کئے گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن　　　جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

رسّی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسن میں، بظاہر نہایت ذلت نما حالت تھی، لیکن تشبیہ نے بدنمائی کو حسن سے بدل دیا۔

۴۔ محسوسات سے جو تشبیہ دی جاتی ہے نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہے کیوں کہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں، اس لیے ان کے ذکر کے ساتھ فوراً ان کی صورت ذہن میں آجاتی ہے اور اس لیے مشبّہٖ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اس قسم کی تشبیہات میر انیسؔ کے ہاں کثرت سے ہیں۔ مثلاً

بھگدڑ اور اضطراب کا بیان ؎

یوں روح کے طائر تن وسر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

یا مثلاً دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پہ وار کر رہے ہیں اور برچھیوں کی انیاں باہم ٹکراتی ہیں ع

"دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے"

ــــ حضرت علی اکبرؓ[1] کا چھوٹا سا نیزہ دشمن کے بھالے سے ٹکراتا ہے۔ ع

"غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا"

ڈھال پر تلوار کو آسانی سے روک لینا ؎

یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جھول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

۵۔ بعض جگہ تشبیہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہے۔ اس قسم کی تشبیہیں میر صاحب کے یہاں نہایت اعلیٰ درجے کی پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ فی الحقیقت ان سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیوں کہ مبالغہ خود ایسی چیز ہے جو اصلیت سے دور کر دیتی ہے۔

گرمی کی شدت کا بیان ؎

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں

منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ، گرمی روزِ حساب تھی

ماہی جو سیخِ موج تک آئی، کباب تھی

صنائع و بدائع اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض صنائع ایسے بھی ہیں کہ اگر بے تکلفی سے آجائیں تو کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن عام حالت یہ ہے کہ اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا

---

[1] امام حسینؓ کے نوجوان فرزند

دیباچہ زوال ہیں۔

میرانیسؔ جس زمانے میں تھے، شاعری کا مدار صنائع وبدائع پر رہ گیا تھا۔ مبالغہ، ایہام اور مناسبت لفظی، یہی چیزیں شاعری کا کمال خیال کی جاتی تھیں۔ میرانیسؔ کو انھی لوگوں میں رہنا سہنا تھا۔ انھی سے داد سخن لینا تھی۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن تھا کہ وہ زمانے کی حکومت سے آزاد رہتے۔ وہ جانتے تھے کہ جس شاعری کو وہ زندہ کرنا چاہتے ہیں، صنائع و بدائع اس کے چہرے کے داغ ہیں۔ لیکن انھوں نے مجبوراً اس کو گوارا کیا۔ یہ صرف قیاس نہیں بلکہ مستند اور صحیح روایت سے ثابت ہے۔ میرے ایک معزز دوست نے خود میرانیسؔ سے پوچھا کہ "آپ لفظی رعایتوں اور صنائع و بدائع کو پسند کرتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں، لیکن آخر لکھنؤ میں رہنا ہے"، تاہم میرانیسؔ نے یہ کیا کہ جو صنعتیں محض لغو تھیں وہ نہایت کم برتیں اور جس قدر برتیں ان سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اس جولاں گاہ میں بھی وہ حریفوں سے پیچھے نہیں۔ باقی صنعتوں کو انھوں نے اس طرح برتا کہ کلام کی اصلی خوبی یعنی برجستگی، صفائی اور سادگی میں فرق نہ آنے پائے۔ ہم ان تمام صنعتوں کی کچھ کچھ مثالیں نقل کرتے ہیں، جو میر صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ **ایہام** کے یہ معنی ہیں کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی مراد ہوں اور دوسرے مراد نہ ہوں۔ لیکن مقدم و موخر الفاظ سے ان کو مناسبت ہو مثلاً ع

"اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں"

رنگ کے دو معنی ہیں۔ ایک تو وہی معمولی رنگ۔ دوسرے، طرح، قسم، طرز۔ یہاں پچھلے معنی مراد ہیں۔ یعنی پھول کے مضمونوں کو میں سو طرح باندھ سکتا

ہوں۔ پہلے معنی مراد نہیں۔ لیکن گل کو ان سے مناسبت ہے۔ یہ صنعت اگر بے ساختگی اور بے تکلفی سے برتی جائے تو کلام میں نہایت حسن پیدا ہوجاتا ہے۔

قدما میں یہ صنعت بالکل متروک تھی۔ سلمان ساوجی نے اس کی ابتدا کی اور اس میں نہایت غلو کیا۔ تاہم اکثر جگہ نہایت بے تکلفی سے استعمال کیا۔ سلمان کے بعد خواجہ حافظؔ کے کلام میں کہیں کہیں اس کا پتا لگتا ہے پھر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اردو میں ابتدا ہی سے اس کی طرف میلان رہا۔ میر انیسؔ کے زمانے تک اس کا رواج عام ہوچکا تھا اور یہ صنعت مضمون بندی کی ایک بڑی صفت خیال کی جاتی تھی۔ میر انیسؔ نے بھی عوام پسندی کی بنا پر یہ صنعت نہایت کثرت سے برتی ہے۔ لیکن اکثر جگہ نہایت بے تکلف ادا ہوئی ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج ہیں (جن الفاظ کے استعمال سے صنعت ایہام پیدا ہوئی ہے وہ مثالوں میں جلی لکھے گئے ہیں)

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے　　اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

ع۔ چلاتی تھیں پریاں کہ خدا جان بچائے۔　(جان جن کو بھی کہتے ہیں)

ع۔ سب فوج کی تیغیں تھیں اور اک شاہ کا دم تھا (دم تلوار کی، باڑھ کو بھی کہتے ہیں)

ع۔ دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے　(دم خون کو بھی کہتے ہیں)

ع۔ ایسا گنہ کیا ہے کہ کچھ جس کی حد نہیں　(حد، گناہ کی سزا کو بھی کہتے ہیں)

۲۔ مبالغہ۔ قدما کے نزدیک مبالغہ اس حد تک ممدوح تھا کہ کسی وصف کو ایک لطیف پیرائے میں معمولی حالت سے کچھ بڑھ کر بیان کیا جائے لیکن جب حد سے بڑھا تو عیب اور نقص ہوگیا۔ فن بلاغت کے امام ابن قدامہ نے نقد الشعر میں اس کی مثال میں ابونواس (شاعرِ عربی) کا جو مصرع نقل کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"اے خدا کے امین! تو ہمیشہ زندہ رہ!"

امام موصوف نے لکھا ہے کہ کسی شخص کا ہمیشہ زندہ رہنا ناممکن ہے اس لیے یہ مبالغہ معیوب اور قبیح ہے۔ شعرائے عرب اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہتے تھے تو پہلے امکان کی شرط لگا دیتے تھے۔ جیسے ابو تمام کہتا ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے)

"اگر کوئی مشتاق اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کر سکتا تو منبر خود تیرے پاس چلا آتا ہے۔"

لیکن عرب میں بھی جب تکلف اور تصنع زیادہ بڑھا اور صحیح مذاق مفقود ہو گیا تو مبالغے کی یہی خوبی رہ گئی کہ جتنا مستبعد اور ناممکن ہو اسی قدر زیادہ اس کا کمال ہے۔ اب یہ حالت پہنچ گئی کہ سودا گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

رو بروسے اگر آئینے کے اس گلگوں[1] کو — پھینک دے لے کے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصے میں پھر آئے تو اسے باور کر — عکس بھی آئینے سے ہونے نہ پائے منفک[2]

میر انیس کے زمانے میں مبالغہ، کمال کی حد کو پہنچ چکا تھا اور یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب تک مبالغے میں انتہا درجے کا استبعاد نہیں ہوتا تھا سامعین کو مزہ نہیں آتا تھا۔ مجبوراً میر صاحب نے وہی روش اختیار کی۔ لیکن چوں کہ ان کی اصلی فطرت میں سلامت روی اور اعتدال تھا اس لیے اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے بہت پیچھے رہ گئے اور یہی بات ہے جس کی بنا پر ان کے حریف کہتے ہیں کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی میں مرزا دبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہر حال ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

---

[1] گھوڑا [2] جدا

گرمی کی شدت کے بیان میں لکھتے ہیں ؎

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گھوڑے کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

دوڑے بروے آب تو پتلی بھی تر نہ ہو آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

۳۔ حسن تعلیل۔ یہ ایک لطیف صنعت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایک ایسی بات کو کسی چیز کی علت فرض کرتا ہے جو درحقیقت اس کی علت نہیں مثلاً ؎

بھلائی جو کرے دنیا میں ہوئے وہ پامال بسانِ جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

——— جادہ یعنی راستہ پامال ہوتا ہے۔ شاعر اس کی یہ وجہ قرار دیتا ہے کہ راستہ لوگوں سے بھلائی کرتا ہے، اس لیے پامال ہے۔ یہ ایک قسم کی تخئیل ہے اور اس لحاظ سے یہ صنعت شاعری ہے، کیوں کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے۔ اس صنعت میں اس وقت زیادہ لطافت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ وصف بھی جس کی علت بیان کرنی ہے تخئیل پر مبنی ہو مثلاً میر انیس کہتے ہیں ؎

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

——— موجوں کے اضطراب اور حباب کے پانی میں سر چھپانے کی علت ڈر اور خوف کو قرار دیا ہے۔ لیکن موج کا اضطراب اور پانی میں حباب کا سر چھپانا خود کوئی واقعی چیز نہیں۔ بلکہ شاعر نے موج کی حرکت کو اضطراب قرار دیا ہے اور حباب جو ٹوٹ جاتا ہے تو اس کو فرض کیا ہے کہ اس نے پانی میں منہ چھپا لیا۔ اس صنعت کو میر انیس نے اکثر جگہ نہایت خوبی سے برتا ہے ؎

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

ع "ڈھالوں کا یہ عالم تھا کہ چھپتی تھیں پس پشت"

خاک اڑتی تھی منہ پہ حرم شیرِ خدا[1] کے
تھا چین بہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

۴۔ صنعت **طباق**۔ یعنی دو متضاد یا مقابل چیزوں کو یک جا جمع کرنا۔ میر انیس نے اس صنعت کو اکثر برتا ہے اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ برتا ہے ع

"کھلتا نہیں کچھ آپ نے کیوں باندھے ہیں ہتھیار"

مری قدر کر اے زمینِ سخن! کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

ع "گرمی یہ تھی کہ زلیست سے دل سب کے سرد تھے"

استاد آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

۵ **مراعات النظیر**۔ یعنی الفاظ کی مناسبت۔ وہی صنعت ہے جو آج عوام شعرا کا سرمایۂ کمال ہے اور جس کو مہذب ضلع جگت کہہ سکتے ہیں۔ امانت لکھنوی اس شریعت کا پیغمبر ہے۔ اس کے مصحف کمال کی ایک آیت یہ ہے ع

"بھیڑیے[2] ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر"

چوں کہ عوام کی تسخیر کا سب سے چلتا جادو یہی صنعت ہے اور چوں کہ لکھنؤ کی شاعری کے رگ و پے میں یہ صنعت سرایت کر گئی تھی

---

[1] حضرت علی کا لقب [2] "گرگ" فارسی میں بھیڑیے کو کہتے ہیں۔

اس لیے میر انیس کے ہاں بھی اس کی بہتات ہے۔ لیکن اتنی احتیاط ہے کہ ابتذال نہیں آنے پاتا اور بعض جگہ تو واقعی اس سے لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی صنّاعی کے نمونے یہ ہیں ؎

ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

یا جیسے ع

آتی ہوں میں سروں پہ ذرا فرق فرق سے

یا جیسے ؎

اب تک یہ لڑائی کے نہیں ڈھنگ سے واقف دونوں میں نہیں ایک بھی چو رنگ سے واقف

مزید مطالعہ کے لیے :- مولانا شبلی (اردو کے بہترین انشا پرداز)
از سعید انصاری

سوالات

۱- پہلے مضمون میں مغل بادشاہوں کی لڑکیوں کی شادی کے متعلق مضمون نگار نے کسی غلط روایت کی تردید کی ہے ؟
۲- یہ کیسے معلوم ہوا کہ عالمگیر زیب النسا کو بہت عزیز رکھتا تھا ؟
۳- میر انیس کے دور میں اردو شاعری کا عام رنگ کیا تھا ؟

مشقیں

۱- زیب النسا کی علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لو ؟
۲- انیس کی شاعری کے جو محاسن دوسرے مضمون میں بتائے گئے ہیں ان کی مثالیں انیس کے کلام سے چھانٹو۔
۳- ان مرکب الفاظوں پر غور کرو ،

بے بنیاد ، بے اختیار ، بے تکان ، یہ سب "بے" کے پہلے لانے سے بنتے ہیں۔ ان الفاظ میں بے سابقہ ہے کیوں کہ پہلے لایا گیا ہے۔
اسی طرح ، عہدہ دار ، اور شان دار ، میں ، دار کو بطور لاحقہ بعد میں استعمال کیا گیا ہے۔ سابقہ اور لاحقہ کی مدد سے بہت سے الفاظ بنتے ہیں ، بے ، اور ، دار کو سابقہ اور لاحقہ کے طور پر استعمال کر کے تم پانچ پانچ الفاظ اور بنا ؤ۔

مولانا عبدالحلیم شرر

۱۸۶۰ء بمقام لکھنؤ ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم تفضل حسین، نواب واجد علی شاہ کے ساتھ گرفتار ہو کر مٹیا برج کلکتہ گئے۔ وہیں شرر نے عربی و فارسی کی درسیات کی ابتدا کی جس کی تکمیل لکھنؤ اور دہلی میں ہوئی۔ طب بھی پڑھی اور کچھ دن مطب بھی کیا مگر ادبی ذوق جلد ہی انشا پردازی کی طرف کھینچ لایا۔

کچھ دن اودھ اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے، ہفتہ وار رسالہ "محشر" جاری کیا، پھر "دل گداز" نکالا جو بند ہو ہو کر ان کی آخر عمر تک جاری رہا۔ اس اخبار نے ان کی انشا پردازی کی شہرت بہت بڑھا دی۔

رسالہ میں خیالی مضامین کا آغاز ان کی ایجاد ہے ان کا رنگ اور طرز بھی جدا ہوتا تھا۔ یہ مضامین بہت پسند ہوئے اور اس سے زیادہ ان کے تاریخی ناول مقبول ہوئے۔

شرر ایک کثیر التصانیف ادیب ہیں انھوں نے تواریخ اور سوانح عمریاں بہت لکھی ہیں۔ ان کا انداز تحریر انگریزی انشا پردازی سے بہت متاثر ہوا ہے۔

جس چیز کی بدولت وہ اردو ادب میں زندہ جاوید ہوئے وہ ان کے تاریخی ناول ہیں۔ دراصل وہ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جس نے فن کا لحاظ کر کے انگریزی اصول پر ناول لکھے۔

شرر کم و بیش پچاس ناولوں کے مصنف ہیں۔ ان میں زوال بغداد،

ایام عرب، فردوس بریں، فلورا فلورنڈا اور ملک العزیز ورجنا بہت مشہور ہیں۔ ان کے مضامین کئی جلدوں میں "مضامین شرر" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

جھلملاتا ہوا تارا

(شرر کا یہ مضمون ان کے طرز ادا کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کی انشا پردازی کا اپنا ایک الگ رنگ ہے۔ اس میں زور بیان اور رنگینی کے ساتھ ساتھ خیال آفرینی بھی ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت اس مضمون میں بھی ملے گی)

دنیا میں سب سے زیادہ موثر سین وہ ہے، جب رات کے پچھلے پہر آسمان پر جھلملاتے ہوئے تارے دیکھ پڑتے ہیں اور ان تاروں نے اپنی حسرت بھری صورت دکھانے کے لیے وقت کتنا معقول تجویز کیا ہے۔ دن بھر دنیا والے اپنے کام میں پھنسے رہتے ہیں اور اس بات کی بھی خبر نہیں ہوتی ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، آفتاب کہاں تک پہنچا اور وہ تمام چیزیں جن سے فطرت کی بزم زیب و زینت پاتی ہے، کس وضع پر ہیں اور کیا بہار دکھا رہی ہیں۔ رات سارے عالم کو وہ کالی اور بے روپ کملی اڑھا کر سلا دیتی ہے جسے امیر و غریب بادشاہ و فقیر سب ہی اوڑھتے ہیں۔ اس غفلت سے کبھی آنکھ کھل جاتی ہے اور اکتا اکتا کے چاہتے ہیں کہ

منہ کھول دیں اور قدرت کی بہار سے کچھ لطف اٹھائیں۔ مگر نیرنگ ساز زمانے نے کچھ اس حکمت اور پیچیدگی سے وہ کملی اڑھائی ہے کہ لاکھ پریشان ہو ہو کے اور اس سے گھبرا گھبرا کے کوشش کرتے ہیں، مگر نہیں کھلتی۔ الغرض چار پہر تک ساری دنیا باغ عالم کی دل چسپیوں سے محروم رہتی ہے اور اس عرصے تک کی بے کاری ہیں چوں کہ بہت ترس ترس کے وقت کاٹنے کا اتفاق ہوتا ہے، اس وجہ سے لوگ تڑکے ہی اٹھ بیٹھتے ہیں اور دنیا کا وسیع منظر جسے رات بھر نہیں دیکھنے پائے تھے، اس کو اس وقت اس ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں کہ قدرت کی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ کاری گری کا مزہ آ جاتا ہے اور پھر اس وقت ادھر متوجہ ہونے کی مہلت کبھی ہوتی ہے۔

نیند بھر کے سو چکے اور اپنے روزانہ کاروبار میں مشغول ہونے کا وقت نہیں آیا۔ کس قیامت کی گھڑی ہے۔ رات کی بے رونق سیاہی میں ہلکا ہلکا نور پیدا ہو گیا ہے۔ پھول کھلتے جاتے ہیں اور آسمان صاف و شفاف پانی سے انھیں نہلاتا جاتا ہے۔ قدرت کو بھی اس وقت جوانان چمن کا حسن دل فریب دکھانا منظور ہے۔ کیوں کہ ان کی دھانی پوشاک پر ایسی مرصع کاری کر دی ہے کہ جدھر نظر اٹھائیے، نظر بھا دینے والے جواہر کا جلوہ آنکھوں کے سامنے ہو جاتا ہے۔ طیور کی خوش الحانی ہوا میں گونج رہی ہے، جس پر گویا اسی وقت کے انتظار میں کامل چار پہر تک سناٹا طاری رہا ہے۔ ان سب چیزوں کو

دیکھتے دیکھتے دنیا والوں کی نظر نماز سے فراغت کر کے دعا مانگنے والوں کی طرح آسمان پر جاتی ہے اور وہاں یہ تارا نظر پڑتا ہے جو باغ عالم کی ساری دل چسپیوں کو نظر کے سامنے آتے ہی خاک میں ملا دیتا ہے۔

جھلملاتے ہوئے تارے میں کچھ ایسی حسرت کی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اس کی غم یاد دلانے والی شکل دیکھتے ہی خدا جانے کن کن باتوں کا خیال آجاتا ہے اور کون کون باتیں نظر کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ اصل میں یہ تارا کسی خاص شخص کی نہیں، مجسم حسرت کی تصویر ہے، مگر کچھ ایسی سچی تصویر ہے کہ دنیا کا کوئی اندوہ ناک چہرہ نہیں جو اس کو دیکھ کے یاد نہ آجاتا ہو۔

قدرت کی کاری گری کی قدر کرنے والو! ذرا دم بھر بیٹھ کے جھلملاتے ہوئے تارے کو غور سے دیکھو! دیکھو کس کمال کی تصویر کھینچی ہے، کہ ہے تو عام خیال کی یاد دلانے والی مگر جس حسرت نصیب کی صورت سے چاہو منطبق کر لو۔ بس یہی بات ہے جو انسانی کاری گری میں نہیں پیدا ہو سکتی۔ یہ حسرت ناک منظر دیکھنے کے قابل ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے والا تارا آسمان پر جھلملا رہا ہے اور ہمارا ساتھ چھوڑنے والی شمع دنیا کی روشنی ملی ہوئی تاریکی میں ٹمٹما رہی ہے۔ دونوں کا سامنا ہے۔ شمع تارے کی صورت دیکھتی ہے، تارا شمع کی صورت دیکھتا ہے اور ہم چپکے بیٹھے ایک افسردہ دلی کے ساتھ دونوں کو دیکھ رہے ہیں۔

بھلا اب اندازہ کرو کہ یہ تارا کسے کسے یاد دلاتا ہے۔ ایک غریب کو

آج سفر کی پہلی منزل میں قدم رکھنا ہے۔ گھر والوں کی باتوں میں رات کو اس درجہ طبیعت بہلی رہی کہ بے چارہ بہت دیر میں سویا۔ آدھی رات کو آنکھ لگی ہے اور کئی گھنٹے تک بدخوابیوں میں پریشان رہ کر، اس وقت توپ کی آواز سے جو اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز کی طرح کان میں آئی ہے، چونک پڑا۔ گھبرا کے اٹھ بیٹھا ہے۔ اعزا و اقربا اور یاران وطن گھیرے کھڑے ہیں۔ ایک ایک سے رخصت ہوتا ہے۔ ہر شخص سے کہا سنا معاف کراتا ہے اور چشم پرنم سے ان محبت بھری صورتوں کو بار بار دیکھتا ہے جو اس کے خیال میں اب برسوں نظر نہ آئیں گی۔ روانگی کا وقت اب سر پر کھڑا ہے اور قضا کے فرشتے کی طرح سب لوگوں کا ساتھ چھوڑنے کی تاکید کر رہا ہے۔ اسی عالم میں بھائی کی آنکھ میں ایک آنسو کا قطرہ نظر آتا ہے، جس پر کسی تارے کا عکس جگنو کی طرح چمک جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو پہلے ہی سے بھرے تھے، صرف چھیڑنے کی دیر تھی۔ بھائی کی اشک فشانی دیکھ کے تاب نہ آئی۔ منہ پھیر کے رونے لگا۔ منہ پھیرنا تھا کہ اس ظالم تارے کی صورت نظر کے سامنے ہوگئی۔ یہ صبح کا جھلملاتا ہوا تارا تھا۔ ادھر اس حسرت نصیب کا ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھنا، جس کے سبب سے یہ تارا کچھ اور بھی مٹا مٹا سا نظر آتا تھا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ایک دفعہ نظر آجائیں، تو عمر بھر کے لئے کافی ہوں گی۔ یہ جھلملاتا ہوا تارا روز صبح کو نظر آئے گا اور غم نصیب بھائی کی یاد دلا کر بے چین کر دیا کرے گا۔ خدا جانے کہاں کہاں دیکھے گا اور کس کس طرح بے تاب ہو ہو کے یاد کرے گا۔

ذرا دنیا کے وسیع منظر پر نظر دوڑاؤ۔ دیکھو کیا ہو رہا ہے کیسی کیسی دل فریب کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ سراؤں کے پھاٹک کھلے ہیں، مسافر کمر باندھ رہے ہیں، قافلوں میں روانگی کے وقت نے ایک ہل چل ڈال دی ہے۔ فوجی خیموں کی قطار میں کوچ کا بگل دیا گیا ہے، مسجدوں میں نمازی فصیلوں پر بیٹھے وضو کر رہے ہیں، شوالوں کے گھنٹے رات بھر کے سوئے ہوؤں کو جگا رہے ہیں۔ بزم قدرت کے نواسنج جنوں انگیز ولولوں کو ابھار رہے ہیں۔ پچھلے پہر کا سویا ہوا کانسٹبل جاگا ہے اور دنیا والوں میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے حس و حرکت پیدا ہوئی ہے۔ خوش لباس عورتوں کا جھرمٹ دور دور کے محلوں سے سمٹ سمٹ کر دریا کے کنارے جا رہا ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں نکل جائے۔ الغرض جس مقام کو دیکھو کیفیت سے خالی نہیں۔

اے قوم کے فرزندو! تم اپنے تئیں بھولے ہوئے ہو، آؤ ہم بتائے دیتے ہیں کہ داستان غم کی طرح حسرت کی تصویر نظر کے سامنے پھر جائے۔ تمھیں تمھارا موجودہ اقبال آنکھوں سے دکھا دینے والا یہی تارا ہے، جسے ہم جھلملاتا ہوا تارا کہہ کے یاد کر چکے ہیں۔ روز صبح کو اسے دیکھو، اپنے اقبال کو یاد کرو اور اپنی حالت کا اندازہ کرکے ترقی کی طرف قدم بڑھاؤ۔

لکھنؤ میں فنونِ ادبیہ کی ترقی

(یہ غالباً ایک نیا اقتباس ہے جو مولانا شرر کی مشہور تصنیف "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" سے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ قدر ہے کہ اودھ کے تاریخی و جغرافی حالات کو ادب کی چاشنی دے کر پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ تبصرے میں ذکر آیا ہے مولانا ایک مشہور ناول نگار بھی تھے وہ کم و بیش پچاس ناولوں کے مصنف ہیں ان میں ملک العزیز ورجنا، ایام عرب، فردوس بریں، فلورا فلورنڈا اور زوال بغداد بہت مشہور ہیں)

اردو زبان کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہوئیں وہ شاعروں، ادیبوں، نثاروں اور مصنفوں ہی تک محدود نہیں ہیں۔ مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی و وسعت زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے ہر گروہ والوں کے لیے خاص دلچسپیاں پیدا کیں۔

ان میں سے زیادہ قابلِ توجہ داستان گوئی ہے۔ جو دراصل فی البدیہہ تصنیف کرنے کا نام ہے۔ یہ فن اصل میں عربوں کا ہے جہاں عہدِ جاہلیت میں بھی داستان گوئی کی صحبتیں مرتب ہوا کرتی تھیں لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے ان کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں۔ امیر حمزہ کی داستان جو داستان گوؤں کی اصلی اور حقیقی جولاں گاہ ہے، وہ دراصل فارسی میں تھی اور کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے اسے تصنیف کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ملوک تغلق کے

عہد میں داستان امیر حمزہ موجود تھی۔ دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ میں آنا شروع ہوئے۔ یہاں افیونیوں نے ان کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عنصر اعظم قرار دے لیا۔ چند ہی روز میں لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا کہ کوئی دولت مند نہ تھا، جس کی سرکار میں کوئی داستان گو نہ مقرر ہو۔ سیکڑوں داستان گو پیدا ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکروں میں سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی میں وہ درجہ نہیں نصیب ہو سکا ہے جو قادر الکلام داستان گوؤں کو حاصل تھا۔ دہلی میں بھی دو ایک صاحب کمال داستان گو آج تک پڑے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں ان کا شمار بہت زیادہ ہے، اور ان کے طرز تقریر کا اثر عوام شہر کی زبان پر بے حد پڑ گیا ہے۔ ناولوں کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش کی گئی کہ داستان کو داستان گوؤں ہی کی زبان میں قلم بند کرا لیا جائے تو لکھنؤ ہی ایسے باکمال داستان گو پیش کر سکا جنھوں نے ضخیم جلدیں لکھ کے اردو زبان داں پبلک میں پھیلا دیے چنانچہ جاہ اور قمر کی تصانیف ملک میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

داستان کے چار فن قرار پا گئے ہیں۔ رزم، بزم، حسن و عشق اور عیاری۔ ان چاروں فنوں میں لکھنؤ کے داستان گوؤں نے ایسے ایسے کمال دکھلائے ہیں جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سنے نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اور تصویروں کا نہایت گہرا دیرپا اثر سامعین کے دلوں پر ڈال دینا ان لوگوں کا خاص کمال ہے۔

سوشل تفنن۔ مذاق، ظرافت اور دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ میں علم زبان کے کئی فن پیدا ہو گئے جن میں کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

انھیں میں سے ایک فن پھبتی کہنا ہے۔ اس کو دراصل شاعرانہ تشبیہ واستعارے سے تعلق ہے۔ لیکن اس میں اتنی خصوصیت ہے کہ کسی کو بگاڑ کے دکھانے، اس کے عیب کے نمایاں کرنے اور برجستہ کوئی انوکھی، ہنسانے والی اور عیب و نقصان ظاہر کرنے والی تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ہے۔ لکھنؤ کے ادنیٰ ادنیٰ لڑکے، بازاری عورتیں، جاہل دکان دار، ادنیٰ طبقوں کے اہل حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیاں کہہ جاتے ہیں، کہ باہر والوں کو حیرت ہوجاتی ہے۔ ایک صاحب کربلائے معلّےٰ کی زیارت کرکے واپس آئے، اور برّاق کپڑے پہن کے دوستوں میں آکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک لونڈے نے کہا "ایں یہ فرات کا بگلا کہاں سے آگیا؟" ایک بوڑھے دولھا خضاب کرکے دولھن بیاہنے کو آئے اور بڑی دھوم کی برات لائے۔ زنانے سے نکل کر وہ محفل میں آرہے تھے۔ جوتا اُتارنے کے لیے جھکے اور چند قدم گھٹنے ٹیک کر فرش پر چلے۔ کسی کی زبان سے نکلا۔ "دولھا کہاں ہیں؟" شوخ مزاج رنڈی جو کھڑی مجرا کر رہی تھی ہنس کے بولی "اے وہ بینول چلا تو آرہا ہے" ایک کبڑیا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا صدا یہ تھی کہ "ارے بھئی یہ کنکوے کون لوٹے گا؟" کیا اس سے زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہوسکتا ہے؟۔ نازک ترین استعارہ وہ ہے جس میں مشبّہ اور مشبّہ بہ دونوں کا نام نہ لیا جائے صرف مشبہ بہ کی کوئی خصوصیت بتا کے کلام میں لطف پیدا کر دیا جائے۔ اس کی اس سے بہتر مثال کون ہوسکتی ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا نہ گنّے کا جس سے کن کوّے لوٹے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کہہ کے کہ "کن کوے کون لوٹے گا؟" یہ بتادیا کہ یہ پونڈے گنوں کے برابر ہیں جن سے کن کوے لوٹے جاتے ہیں، اور پھر اس سے زیادہ مناسب اور بازاری لوگوں کے مذاق کی کوئی تشبیہ نہیں ہوسکتی۔

اس طرح کی صدہا ہزارہا مثالیں ہیں جو یہاں کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت سنی جاتی ہیں۔

دوسرا "ضلع" ہے۔ یہ دراصل شاعرانہ رعایت ہے جس نے عوام کی بات چیت اور مذاق کی گفتگو میں آکے خاص رنگ پیدا کر لیا۔ ضلع میں کوشش کی جاتی ہے کہ جس چیز کا تذکرہ آ جائے اس کے تمام متعلقات کو کسی نہ کسی پہلو سے باتوں میں لے آئے جائیں۔ آزاد فقیر جو ایک خاص وضع رکھتے تھے ضلع بولنے میں باکمال مانے جاتے تھے۔ امانت نے اپنی شاعری میں رعایت کی اس قدر کوشش کی کہ تمام شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر کر کے رعایت ہی کو اپنا مقصد قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام شاعری کے درجے سے نکل کے ضلع بولنے کے حکم میں داخل ہو گیا۔ مگر لکھنؤ کے اکثر عوام نے اپنی بے تکلفی کی صحبتوں میں اس فن کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ امانت کی شاعری پیچھے پڑ گئی۔ سچ یہ ہے کہ کسی جگہ کے لوگ ضلع بولنے میں اہل لکھنؤ کے عشر عشیر درجے کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس فن میں ایک کتاب بھی شائع ہو گئی۔

تیسرا فن "تک بندی" ہے۔ یہ شاعری کی قافیہ پیمائی ہے۔ بہت سے جاہل جب ادھر توجہ کرتے ہیں تو جواب سوال میں اس طرح فی البدیہہ قافیہ استعمال کرتے ہیں کہ بڑے بڑے شعرا کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ہم نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک ہندو "بڑھیا کے کاتے والا" دیکھا تھا جو صبح کو خوانچہ لگا کے نکلتا۔ صورت دیکھتے ہی صدہا بازاری لونڈے اسے گھیر لیتے اور وہ سر راہ خوانچہ رکھ کے بیٹھ جاتا۔ فوراً لونڈوں سے اس سے تک بندی میں مقابلہ شروع ہو جاتا۔ سارا مجمع ایک طرف ہوتا۔ فریقین میں گالیوں کی بوچھار ہوتی، مگر شرط تھی کہ کوئی گالی تک سے باہر نہ ہو اور کوئی قافیہ رہ نہ جائے۔

ہم نے اسے بیسوں بار دیکھا۔گھنٹوں اس سے مقابلہ رہتا۔ مگر ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ جواب میں کبھی عاجز رہا ہو۔ کوئی نہ کوئی قافیہ ڈھونڈھ کے پیش ہی کر دیتا تھا۔

اسی طرح مذاق اور گفتگو میں طرح طرح کی خیال آفرینیاں ہوتی تھیں اور جاہل عوام بعض وقت ایسے خیالات پیش کر دیا کرتے تھے کہ بڑے بڑے شعرا حیرت میں رہ جاتے۔ یہ زمانہ دراصل لکھنؤ کا گولڈن ایج تھا۔شاعری اور ادبی خوبیاں لوگوں کے رگ وپے میں سرایت کر گئی تھیں۔ ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے میں شدبد ہو جاتا طبع آزمائی شروع کر دیتا۔ جہلا و عوام، ادنیٰ طبقے کے لوگوں اور گھر بیٹھنے والی عورتوں تک میں شاعرانہ لوچ اور ادبی نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان پڑھ کبڑیے شاعر تھے۔ اور جہلا کی زبان بھی اس قدر شستہ و رفتہ، اخلاقی حفظ مراتب کے الفاظ سے مملو اور تمدنی آداب سے لبریز تھی کہ اکثر صاحب علم ان کی گفتگو سن کے ششدر رہ جاتے اور کسی کو ان پہ جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا۔ سودا بیچنے والوں کی صدائیں شاعرانہ نکات اور فصاحت و بلاغت کے غوامض سے اس قدر آراستہ و پیراستہ تھیں کہ اوروں کو سمجھنا بھی دشوار تھا۔

ادنیٰ طبقے والوں نے بھی اپنے مذاق کے مطابق خاص ادبی دل چسپیاں پیدا کر لی تھیں۔ مثلاً ایک فن خیال کا پیدا ہو گیا۔ لوگ فی البدیہہ اشعار تصنیف کر کے دائرے پہ گاتے۔ اس کا نام خیال اس لیے رکھا گیا تھا کہ ہر شخص اپنے تخیل کا جوہر دکھائے اور کوئی نئی بات پیدا کرے۔ اس فن میں یہاں بہت سے باکمال پیدا ہوئے جن کو اعلیٰ سوسائٹی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبتوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر بجائے خود اگر غور کیجیے تو وہ اصلی اور فطری شاعری تھی اور اسی وضع کی شاعری جیسی کہ عہد جاہلیت عرب میں تھی۔

اسی طرح ایک گروہ ڈنڈے والوں کا پیدا ہو گیا۔ ان لوگوں کی یہ شان تھی کہ

قریب کے زمانے کے اہم اور مشہور واقعات کو کمال آزادی کے ساتھ موزوں کرتے جو جیسا ہوتا چاہے وہ کتنا ہی صاحب اثر اور دولت مند ہوا سے ویسا ہی بڑی بے باکی سے دکھاتے اور ثابت کرتے کہ ملک اور قوم کو اس سے کیا فائدہ ہوا یا کتنا بڑا ضرر پہنچا۔ پھر اپنی ان نظموں کو ایک شعر خوانی کی خاص وضع میں ڈنڈے بجا بجا کے سناتے۔

عورتوں کی زبان مردوں کے مقابل ہر ملک اور ہر قوم میں زیادہ شستہ اور دل کش ہوتی ہے مگر لکھنؤ میں یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محترم خاندان کی معزز بیگموں کی زبان میں علاوہ نسائی دل فریبیوں کے ادبی شاعرانہ نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں اور غور کیجیے تو صحت الفاظ، پیاری بندشیں اور طرز ادا کی نزاکتیں بتاتیں کہ زبان کی خوبیاں اس سرزمین میں کس اعلیٰ کمال کو پہنچ گئی ہیں۔

مزید مطالعہ کے لیے :۔ تنقیدی اشارے از آل احمد سرور
مشرقی تمدن کا آخری نمونہ :۔ از عبدالحلیم شرر

سوالات

۱۔ پہلے مضمون میں مضمون نگار نے کتنی سین پیش کیے ہیں تمہیں کون سین سب سے زیادہ موثر معلوم ہوا؟

۲۔ آخری بند میں جھلملاتا ہوا تارا کسے کہا ہے؟

۳۔ دوسرے مضمون میں مضمون نگار نے کس زمانہ کو گولڈن ایج کہا ہے اردو زبان کی کون سی مخصوص ترقیاں اس زمانہ میں ہوئیں؟

مشقیں

۱۔ داستان گوئی، پھبتی، ضلع اور تک بندی کی وضاحت کرو

۲۔ ان مرکبات کی تشریح کرو
نیرنگ ساز زمانہ، وسیع منظر، جوانان چمن، حسن دل فریب، مرصع کاری، حسرت نصیب، یاران وطن، اشک فشانی، جنون انگیز، جولاں گاہ، عنصر اعظم، قادر الکلام، عشر عشیر

۳۔ تم صفت کی قسمیں پڑھ چکے اب دیکھو فارسی اور عربی کے تفضیل کے الفاظ بھی اردو میں آتے ہیں
فارسی ۔ بہتر، کم تر، بہترین، کم ترین،
عربی ۔ اکبر، افضل، اکثر، احمق، اس قسم کے الفاظ اپنے اسباق سے چھانٹو۔

۴۔ ان جملوں پر غور کرو۔ آفتاب کہاں تک پہنچا۔ رات سارے عالم کو کملی اڑھا کر سلا دیتی ہے۔ کس قیامت کی ٹھکرانی ہے۔ ان جملوں میں فعل کی تین قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے جملے میں کام کا اثر فاعل پر ختم ہوتا ہے اسے لازم کہتے ہیں۔ دوسرے جملے میں کام اثر فاعل سے گزر کر مفعول پر پورا ہوتا ہے۔ یہ فعل متعدی ہے۔ تیسرے جملے میں "ہے" فعل ناقص ہے۔ فعل کی تینوں قسموں کی مثالیں اپنے پڑھے ہوئے اسباق سے چھانٹو۔

مولانا راشد الخیری

آپ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کر کے عربی کالج دہلی سے انٹرنس پاس کیا۔ انیس بیس سال ملازمت کرنے کے بعد زندگی کا بقیہ حصہ علم و ادب کی خدمت میں صرف کیا۔

مولانا اردو کے ایک بڑے انشا پرداز تھے۔ زبان، خاص دہلی کی اردوئے معلیٰ ہے، انگریزی اثر سے یک سر پاک اور ٹھیٹھ ٹکسالی ہے۔ بیگماتی زبان کے یگانہ استاد تھے۔ ساری عمر عورتوں کی صحیح تعلیم و تربیت میں دل چسپی لیتے رہے۔

عورتوں کے رگڑے جھگڑے، پیار محبت کی باتیں اس خوبی سے لکھی ہیں کہ قلم توڑ دیا ہے۔ بیشتر افسانے اور ناول لکھے اور بعض چیزیں مذہبی بھی مگر زیادہ تر مستورات کے لیے۔ آپ کی تصانیف قدیم و جدید دلی کی معاشرت کا آئینہ ہیں۔

ہر چند کہ مولانا کی تحریروں میں سلاست، شگفتگی اور کہیں کہیں خوش طبعی بھی نظر آتی ہے لیکن ان کا عام لہجہ حزنیہ ہوتا ہے۔ وہ غم و الم کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والا تڑپ جاتا ہے۔ اسی لیے انھیں "مصورِ غم" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مولانا کی تصانیف کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے چند مشہور یہ ہیں۔

شبِ زندگی، شامِ زندگی، نوحۂ زندگی، منازل السائرہ، آمنہ کا لال، سیدہ کا لال گدڑی کا لال، گردابِ حیات اور عروسِ مشرق وغیرہ۔

سوتیلی ماں کا آخری وقت

(مولانا کی تمام تصانیف سبق آموز ہیں اور وہ اکثر دبیشتر
خواتین کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اسی لحاظ سے اس افسانہ کا انتخاب کیا گیا
ہے۔ مولانا کے طرز تحریر کی جملہ خصوصیات اس افسانہ میں ملیں گی)

بیٹیوں! تمھاری طرح ایک دن میں بھی کنواری تھی۔ ماں باپ کا سایہ میرے سر پہ موجود تھا۔ بے فکری کے دن تھے، آزادی کی راتیں، خوشی کا وقت تھا، اطمینان کی باتیں، مگر جوانی نے اس بے فکری کا خاتمہ کر دیا۔ شادی کے پیغام آنے شروع ہوئے۔ میں بظاہر خاموش تھی مگر نکاح میری زندگی اور موت کا فیصلہ تھا۔ تمام گفتگو غور سے سنتی رہی مگر اس لیے کہ محض واقعات پر نتیجہ نکالنا ہوتا تھا، میں اماں ابا کی رائے اس واسطے کہ وہ تجربہ کار تھے، اپنے سے بہت بہتر سمجھتی تھی۔ پھر بھی آج جب کہ نو برس سے زیادہ ہوئے ہیں زبان سے نکالتی ہوں کہ اماں جان کے ایک پیغام سے انکار کرنے کا مجھ کو اتنا رنج ہوا کہ میں نے دو وقت روٹی نہیں کھائی۔ یہ میرے چچا زاد بھائی کا پیغام تھا لیکن آخر کار ان کی رائے ٹھیک نکلی اور میرا خیال بالکل غلط نکلا۔ اس شخص نے پے در پے تین بیویاں کیں اور تینوں کو جلا جلا اور گھلا گھلا کر

پار اتارا۔ جب اماں جان نے اس گھر کو جس میں ہم سب بیٹھے ہیں پسند کیا اور رضامندی ظاہر کی تو مجھ کو سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ ان دونوں کلیجے کے ٹکڑوں کو جو میرے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، کہنے کو سوتیلے مگر پیٹ کے بچوں سے زیادہ عاشق زار کس طرح خوش رکھوں گی۔ یہی دھڑکا تھا جس کو ساتھ لیے میں سسرال میں آ داخل ہوئی۔ سرکار نے، جیسا دنیا کے تمام مردوں کا قاعدہ ہے، میری صورت دیکھتے ہی بچوں کی وقعت کم کردی۔ ان کا کھانا پینا پہننا اوڑھنا سب میرے ہاتھ میں تھا۔ میں خود بچہ تھی اور ان بچوں کی خدمت میرے بس کا کام نہ تھا۔ پھر بھی خوف خدا میرے دل میں تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ دنیا کی کسی حالت کو قیام نہیں۔ زندگی کے ساتھ انقلاب لگے ہوئے ہیں۔ یہ دو معصوم روحیں جو قدرت نے میرے سپرد کی ہیں، محض میری شفقت کی محتاج ہیں۔ نہ معلوم چند روز بعد میں اس شفقت کے قابل بھی رہوں یا نہ رہوں۔ میں اندھی، لنگڑی، کانڑی، رانڈ ہو جاؤں اور بھیک بھی مجھ کو میسر نہ ہو، اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا میں ان کی خاطر مدارات کرتی۔ دو سال اسی طرح گزرے اور میں بھی ایک بچہ کی ماں بن گئی۔ مجھے اب اپنے بچے کے آگے یہ دونوں زہر معلوم ہوتے اور ہر وقت یہ خواہش ہوتی کہ سرکار کی تمام محبت چاروں طرف سے کھنچ کر میری طرف آ جائے۔ میری آرزو پوری ہوئی۔ سرکار دم بھر میرے بچہ سلمان کو آنکھ سے اوجھل نہ کرتے اور اپنے بچے عرفان کو جو

مشکل سے تین برس کا ہوگا ہمارے کمرے تک میں نہ گھسنے دیتے۔ اسی طرح چار برس اور گذر گئے۔ مجھے دن عید اور رات شب برات تھی۔ ان سوتیلے بچوں کا کانٹا قریب قریب نکل چکا تھا۔ یہ زندہ تھے مگر مردہ سے بدتر۔ میں بھی اس وقت کچھ ایسے گھمنڈ میں تھی کہ مجھے ان دونوں سے سیدھے منہ بات کرنا قسم۔ میں جو ہاتھ اٹھا کر دیتی، یہ لے لیتے۔ جو کہتی، وہ کر لیتے۔ عرفان لاکھ بچہ تھا مگر چھ سات برس کا بچہ اپنی حالت اچھی طرح پہچانتا اور اپنی عزت پوری طرح جانتا۔ دن بھر میرے بچے کے پیچھے پیچھے خوشامد کرتا پھرتا، پٹتا کٹتا، گھڑکیاں سنتا اور اُف نہ کرتا۔ مجھ کو خود ایسے لڑکے کی ضرورت تھی، جو ہر وقت سلمان کی خدمت کرتا۔ اس کو بہلائے کھلائے، اس کی خدمت کرے، ان داموں عرفان مجھ کو کچھ گراں نہ تھا۔ سلمان کھانا کھا چکتا تو اس کے آگے کا بچا بچایا کھانا بھی اسی کو دے دیتی۔ پرانی دھرانی جوتی، پھٹا پرانا کرتا اسی کے کام آتا۔ میری سوکن کے زمانے کا ایک طوطا تھا جس کو ہیرا من کہتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے، گرمی کے موسم میں شام کے وقت نہانے جا رہی تھی۔ سونے کی گھڑی نکال کر میں نے رکھنی چاہی، سلمان میرے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا۔ گھڑی دیکھتے ہی مچل گیا۔ دس بیس روپیہ کی چیز ہوتی تو خیر، ساڑھے تین سو کی گھڑی میں نے اٹھا کر صندوقچے میں چھپا دی۔ بچہ مچل گیا، لگا ٹھنیاں کھانے۔ عرفان کھڑا اس کو پنکھا جھل رہا تھا۔ بہلایا، چمکارا مگر بچہ کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ اسی سلسلے میں غریب

جاکر طوطے کا پنجرا اٹھالایا اور کہنے لگا۔

"مٹھو، میاں پر ہنس رہا ہے"

وہ تو ادھر بہلا اور میں غسل خانے میں پہنچی۔ ابھی اچھی طرح نہانے بھی نہ پائی تھی کہ اس کے بلکنے کی آواز میرے کان میں پہنچی۔ کیسا نہانا اور کس کا غسل، جلدی سے تین لوٹے ڈال باہر آئی، تو کیا دیکھتی ہوں کہ بچے کی انگلی سے خون کی تلّی بندھی ہوئی ہے اور وہ تڑپ رہا ہے۔ محبت کے مارے بے تاب اور غصہ کے مارے آگ بگولہ ہو گئی۔ انا نے کہا کہ موے عرفان نے طوطے سے انگلی کٹوادی۔ اتنا سنتے ہی میں آپے سے باہر ہو گئی۔ بس چلتا تو عرفان کی بوٹیاں کاٹ کر چیلوں کو دے دیتی۔ میں نے ایک غضب کی بھری ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی رنگت زرد پڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہ میرے چہرے پر تھی اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہی طوطے کا پنجرا جس کی ایک تیلی ٹوٹی ہوئی تھی اٹھا کر اس کے منہ پر اس زور سے مارا کہ تیلی انگل بھر کنپٹی میں گھس گئی۔ اس کے گورے گورے گلے خون میں لہو لہان ہو گئے۔ بن ماں کا بچہ، اس وقت مصیبت کی سچی تصویر تھا۔ بے کسی اس کے چہرے پر برس رہی تھی اور گھونگھر والے بال اس کی بے گناہی کی داد دے رہے تھے۔ اس کی معصوم آنکھیں آنسوؤں کی جھڑیاں بہا رہی تھیں مگر میرے غصّے کی آگ کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ جب تک انا نے انگلی دھلا کر پٹی باندھی میں نے اس مصیبت کے مارے کا ہاتھ پکڑ کر دو طمانچے اور مارے

اور پھر ایک دھکا دیا کہ بے قرار ہو کر دور جا پڑا اور ستون کی کنگر بھوں میں چبھ گئی۔ کنپٹی پہلے ہی لہولہان ہو رہی تھی، بھوں بھی زخمی ہو گئی۔ بے بس اور مظلوم عرفان کی وہ تصویر آج تک میرے دل سے فراموش نہ ہوئی۔ اس کے کپڑے خون میں شرابور تھے مگر اس کو اپنی تکلیف کا مطلق خیال نہ تھا بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ مار پیٹ کا یقین تھا۔ اس کی آنکھ سے آنسو جاری تھے، وہ ہاتھ جوڑے ایسی نظر سے مجھ کو دیکھ رہا تھا جو میرے رحم کی التجا کر رہی تھی۔ ڈر کے مارے آواز بند تھی اور ایک آٹھ برس کی جان میرے سامنے بیری کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں اس حالت میں غصہ میں بھری، سلمان کو گود میں لیے اپنے کمرے میں پہنچی۔ وہ سو گیا تھا، پلنگ پر لٹا دیا۔ اتنے ہی میں سرکار تشریف لے آئے۔ میں سلمان کو کلیجے سے لگائے بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی گھبرا گئے اور پوچھا، "کیوں؟ خیر تو ہے؟"

میں نے آب دیدہ ہو کر کہا "ہاں شکر ہے اللہ کا! اس کا پنڈا پھیکا ہو گیا، وقت کی بات ہے، میں چوک گئی۔ انا کم بخت بھی ادھر چلی گئی۔ عرفان نے طوطے سے کٹوا دیا۔ اتنا سارا جیتا جیتا خون نکل گیا۔ یہ بلک رہا تھا، وہ ہنس رہا تھا۔ میں نہ آؤں تو ساری انگلی الگ ہو جائے۔"

سرکار کی حالت تو اتنا سنتے ہی کچھ سے کچھ ہو گئی۔ وہ بغیر کپڑے اتارے باہر گئے اور عرفان کو اٹھا کر دالان سے انگنائی میں پھینک دیا۔

چھ برس کے بچہ کی بساط ہی کیا۔ ہانتھ کی ہڈی جڑ سے ٹوٹ گئی۔ ایسی حالت میں سرکار نے اس کے کپڑے اتروائے اور ہنٹر لے کر اس قدر مارا کہ تمام کھال ادھڑ گئی۔ بے گناہ معصوم کے پاس قصور سے بری ہونے کی کوئی شہادت نہ تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک خون میں ڈوب چکا تھا اور کوئی حمایتی لاوارث عرفان کا ایسا نہ تھا جو ہم ظالموں کے قبضے سے مظلوم کو نکال لے۔ آخر سرکار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا اور سلمان کو گود میں لے کر بیٹھ گئے۔ اس وقت میں نہایت خوش، دل میں ہنستی، ظاہر میں ٹھنڈے سانس بھرتی، باہر آئی۔ رات چاندنی تھی، آٹھ بج چکے تھے۔ ڈیوڑھی میں کھسر پھسر کی آواز کان میں آئی۔ میرا قدم دھرنا تھا کہ احسان، عرفان کا بڑا بھائی، جو اب دس برس کا تھا، میری صورت دیکھتے ہی سہم گیا۔ اس کی گود میں عرفان کا سر تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"یہ سو گیا، جاگتا ہی نہیں۔ میں اس کو ابھی لے جاتا ہوں"، احسان نے رو رو کر کچھ اس درد سے بھائی کی حالت بیان کی کہ اس وقت میں لرز گئی۔ دیکھتی ہوں تو عرفان بے ہوش پڑا ہے۔ گھبرا کر گھر میں آئی۔ سرکار کی آنکھ لگ گئی تھی۔ صندوقچی کھول کر عطر نکالا، ٹرنک منگوا کر کپڑے نکالے، لے کر آئی تو دونوں بچے جا چکے تھے۔ خاموش آ کر بیٹھ گئی۔ معاملہ پر غور کیا تو بن ماں کا بچہ بے گناہ تھا۔ اس پر جو ظلم ٹوٹا وہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اس کی عبرت ناک تصویر، اس کا میرے آگے ہاتھ جوڑنا،

بلکنا اور رونا میرے کلیجے کے پار ہو رہا تھا۔ دل نے اس وقت یہ صدا دی ”اشرف، زندگی کا اعتبار نہیں۔ اگر آج تیرا دم نکل گیا تو عرفان سے بدتر حالت سلمان کی ہوگی“۔ اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ سلمان کی یہی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ برقع اوڑھ باہر نکل گئی۔ کوٹھی کے سامنے قبرستان تھا۔ چاندنی رات میں دو معصوم بچے ایک قبر پر نظر آئے۔ چھوٹا بے ہوش تھا اور بڑا اس کی صورت دیکھ دیکھ تڑپ رہا تھا۔ میں چپکی کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً چھوٹا کسمسایا اور بڑے نے اس کے منہ پر منہ رکھ کہا۔

”بھائی، اٹھ بیٹھ۔“

عرفان ”بھائی، میرے ہاتھ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔ ہاتھ نہیں اٹھتا۔ ابا جان نے جو باہر پھینکا تو چوٹ لگ گئی۔“

احسان۔ ”لاؤ میں اپنا کرتا اتار کر باندھ دوں۔ ہمارا بھی تو اللہ ہے۔ اب ہم بڑے ہو جائیں گے تو آپ کمانے لگیں گے۔“

عرفان۔ ”اچھے بھائی، خدا کے لیے میرا سر دبا دے، بڑا درد ہو رہا ہے۔ تیلی آدھی گھس گئی ہے، پھر ستون گھسا۔ میری اماں ہوتیں تو وہ دبا دیتیں۔“

احسان۔ ”اماں کے سامنے ابا ہی کیوں مارتے۔ اماں ہی کے مرنے سے تو ہماری مٹی ویران ہوئی۔ اس قبر میں اماں میری سو رہی ہیں۔ اماں جان ہم کو بھی اپنے کلیجے سے لگا لو۔“

یہ کہہ کر دونوں بھائی لپٹ گئے اور چیخیں مار مار کر رونے لگے۔

اس وقت میری حالت بھی بگڑ چکی تھی۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی اور ظلم ناحق کی سزا، دوزخ کے شعلے میرے روبرو بھڑک رہے تھے۔ میں دونوں کو اٹھا کر گھر لائی۔ رات بھر ان کی خدمت کی۔ صبح کی صبح اٹھتے ہی ڈاکٹر کو بلایا۔ ہاتھ پہ پٹی بندھوائی اور سچے دل سے خدا کے حضور میں توبہ کی۔ وہ دن اور آج کا دن، یہ تینوں اب جوان جوان میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان میں رتی بھر فرق کیا ہو، تو خدا کے یہاں دین دار ہوں۔" پیارے بچو! احسان، عرفان، اس ظلم کی آج تم دونوں سے معافی مانگتی ہوں۔ میری زندگی ختم ہوگئی اور اب میں اس جگہ جا رہی ہوں جہاں ہر فعل کی جزا اور ہر کام کی سزا بھگتنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم مجھ پہ اس ظلم کا دعویٰ کرو۔"

اب دونوں بچے اشرف جہاں بیگم کو لپٹے ڈاڑھیں مار مار کر رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"اماں جان! ہمیں تو وہ بات ایک خواب سی یاد ہے۔ ہاں یہ اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کی محبت نے حقیقی ماں کو بھلا دیا۔"

اب اشرف جہاں بیگم نے کہاں "پیاری بچیوں! ممکن ہے تم کو بھی میری طرح ایسے بچوں سے سابقہ پڑے۔ مگر یاد رکھو کہ ان کے دکھتے ہوئے دلوں کی آہ اچھی نہیں ہوتی جس طرح میں اپنے فعل پہ نادم ہو کر آج خدا کے حضور میں سرخ رو جا رہی ہوں اسی طرح جانے کی کوشش کرنا اور وہ موت ایسی ہوگی جس پہ ہزاروں زندگیاں قربان ہوں۔

مزید مطالعہ کے لیے :۔ صبحِ زندگی ، شامِ زندگی
آمنہ کا لال ، سیدہ کا لال

سوالات

۱۔ "یہ زندہ تھے مگر مردہ سے بدتر"، اس جملہ کا محل استعمال کیا ہے؟
۲۔ قبر پر پہنچ کر اشرف جہاں بیگم نے عرفان واحسان کے درمیان کیا گفتگو سنی؟
۳۔ اشرف جہاں نے مرتے وقت کیا نصیحت کی؟

مشقیں

۱۔ راشد الخیری کے طرزِ بیان کا مقابلہ اسٹائل کے لحاظ سے محمد حسین آزاد اور نذیر احمد کے طرزِ بیان سے کرو؟
۲۔ ان مضمونوں میں بیگمات کی زبان کے بہت سے فقرے اور محاورے استعمال ہوئے ہیں، ان کی فہرست مرتب کرو۔
۳۔ صفت اور موصوف مرکب توصیفی بناتے ہیں، جیسے دل مجروح ، جیسد خاکی ، دسواں سال ، عقل سلیم ، اس سبق سے مرکب توصیفی کی مثالیں چھانٹو اور بتاؤ کہ ان میں صفت کی کون سی قسم ہے۔
۴۔ فعل کی قسموں کے بارے میں تم پڑھ چکے ہو۔ فعل کا تعلق زمانہ سے ہوتا ہے۔ فعل یا تو ہو چکا ہوگا یا ہوتا ہوگا یا آئندہ ہوگا۔ اس طرح زمانہ کے لحاظ سے فعل کی تین صورتیں ہوئیں۔

ماضی، حال، اور مستقبل۔ تم ان کی مثالیں پڑھے ہوئے اسباق سے چھانٹو۔

عبدالحق

ہاپوڑ ضلع میرٹھ وطن ہے۔ علی گڑھ کالج کے ابتدائی زمانہ کے بی۔ اے ہیں آپ نے غالباً ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے پاس کیا تھا۔ مضمون نگاری کی طرف بچپن ہی سے رجحان تھا۔ آپ نے ۱۸۹۵ء میں سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اردو زبان کے مستقبل پر ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا تھا اور اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک ہونہار ادیب ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔

فارغ التحصیل ہوکر مولانا کچھ عرصہ پنجاب میں رہے پھر حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں مختلف عہدوں پر کام کرنے کے بعد عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہیں مولانا کی تحریک پر انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی اور آپ ہی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس انجمن کی ساری ترقی مولانا کی ذات سے ہوئی۔ اب وہ پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں مولانا جامعۂ عثمانیہ میں پروفیسر و صدر شعبۂ اردو کے معزز عہدے پر فائز ہوئے۔ صدر شعبہ کی حیثیت سے مولانا نے جامعۂ عثمانیہ میں اردو زبان و ادب کے مرتبہ کو بہت بلند کیا۔ انجمن ترقی اردو کی شاخیں تمام ہندوستان میں قائم ہیں۔ اس انجمن نے اردو زبان کی ترقی و اشاعت اور اصلاح کے لئے جو منظم کوششیں

کی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں۔ ہر وہ شخص جو اردو زبان سے کچھ واقفیت رکھتا ہے انجمن کی گراں قدر خدمات سے آگاہ ہے۔

انجمن کی طرف سے ایک مستند اور بلند پایہ سہ ماہی ادبی رسالہ "اردو" بھی آپ ہی کے زیر ادارت نکلتا ہے۔ اس رسالہ میں تحقیقی و علمی مضامین زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ ایک اور رسالہ "سائنس" بھی وہیں سے نکلتا ہے۔ اس رسالہ کی افادیت اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ مولانا کی ادبی خدمات اور کارگذاریوں کے اعتراف میں الہ آباد یونی ورسٹی نے اُن کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عنایت کی۔

حالی اسکول کے لکھنے والوں میں مولانا عبدالحق کا درجہ سب سے ممتاز ہے۔ آپ کی زبان مستند، طرز تحریر انتہائی سلیس اور انداز بیان واضح، پر زور اور شگفتہ ہے مولانا کی تحریر میں پختگی بہت ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی نہیں ہو جاتے قلم نہیں اٹھاتے۔ ہندی الفاظ نہایت سلیقہ سے استعمال کرتے ہیں۔ موجودہ دور کے اردو نقادوں میں آپ کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ہر چند کہ مولانا کے انتقادی مضامین شعروادب کے بنیادی مسائل سے کم بحث کرتے ہیں لیکن وہ جو کچھ لکھتے ہیں بے لاگ اور وضاحت سے لکھتے ہیں۔ قدیم دکنی ادبیات اور تحقیقی مسائل سے آپ کو خاص شغف ہے۔ مولانا کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن آپ کے متفرق مضامین اور مقدمات کی حیثیت مستقل تصنیف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اب آپ کے تمام مضامین کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔

حیثیت مستقل تصنیف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اب آپ کے تمام مضامین کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔

اُردو کی مقبولیت کے اسباب

گری زون سوسنان کا ایک پرگنہ ہے اور پہاڑی علاقہ ہے۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں قدیم سے ایک روایت مشہور چلی آرہی ہے کہ خلاق عالم نے فرشتہ کلمائیل کو بیجوں بھرے تھیلے دیئے اور فرمایا جاؤ تم دنیا کا ایک چکر لگاؤ۔ فرشتے نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کی اور یہ بیج بنی نوع انسان کے دماغوں میں جم گئے اور فوراً اُگنے شروع ہوئے اور زبانیں چشمے کی طرح اُبلنے لگیں۔ جب فرشتہ کلمائیل اپنے تھیلے خالی کر چکا اور خلاق عالم کے پاس واپس آنے کو ہوا تو یہ دیکھ کر اسے سخت ندامت اور پریشانی ہوئی کہ گری زون کا علاقہ چھوٹ گیا ہے۔ اس نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اس فروگذاشت کے متعلق عرض کیا۔ خدا نے مختلف تھیلیوں کے ملے جلے بیج، جو بچ رہے تھے، اُسے دیئے اور کہا کہ جاؤ یہ وہاں جا کر بو آؤ۔ یہی وجہ ہے کہ اُس پہاڑی آبادی میں طرح طرح کی زبانیں اور بولیاں پائی جاتی ہیں۔

یہ نقل بہ نسبت گری زون کے ہندوستان پر زیادہ صادق

آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اد لے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی، رومال سے ساز کو صاف کیا اور گجن پور چلا، بے خوف و خطر۔ دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت اندھے نے پوچھا، "تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔"

میں نے کہا، "میں تمھارا غلام ہوں۔"

"تمھارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ ہے۔"

"ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔"

"وہ کون دیوی ہے۔"

وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتی ہے۔

"تو کیا وہ عورت ہے"؟

"نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔"

ادب اردو اور چک بست

(یہ مضمون مولانا عبدالحق نے یوم چک بست کے موقع پر لکھا تھا جو ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو زیر صدارت ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو لکھنؤ میں منایا گیا تھا۔ اس موقع پر جو مضامین نظم و نثر حاصل ہوئے تھے وہ ایک مجموعہ کی شکل میں "یاد چک بست" کے نام سے انڈین پریس سے چھپ چکے ہیں۔ اس مجموعہ کے تمام مضامین گراں قدر اور پڑھنے کے لائق ہیں۔

مولانا کی ایک کتاب "چند ہم عصر" ہے۔ اس کے مضامین اسکیچ کے طرز پر ہیں۔ آپ کے مضامین "مقدمات عبدالحق" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔)

ایک زمانہ تھا کہ ہماری شاعری لطف صحبت اور تفنن کا کام دیتی تھی۔ وہ بھی ایک وقت تھا، دولت تھی، ثروت تھی، حکومت تھی، فارغ البالی تھی، دوسرے دنیاوی کاروبار کے ساتھ سامان عیش بھی تھا اور اسی سامان عیش کا ایک جز شاعری بھی تھی۔ لیکن وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ زمانہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہمارے شاعر زمانے کی اس نیرنگی کو معشوقوں کے تلوّن سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن بے چارے معشوق خود اس زمانے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ اب زمانہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ اب نئے دور نے جنم لیا ہے۔ نئے حالات کے ساتھ نئے خیالات اُمڈے چلے آ رہے ہیں اور اس کے ساتھ نئی نئی مصیبتیں اور آفتیں بھی ہمارے سر پر تلی کھڑی ہیں۔ ان مصیبتوں کے ٹالنے اور

ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں طرح طرح کی قربانیاں اور طرح طرح کی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس جدوجہد کے لیے نئے آلات اور حکمتوں کی ضرورت ہے۔ کیا اس جدوجہد میں شاعر کا کوئی حصّہ نہیں؟ کیا شاعر ہماری سوسائٹی اور ہماری قوم کا جزو نہیں؟ کیا وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق ہے؟ کیا وہ ہمارے آرام و آسائش اور ہمارے دکھ درد اور ہماری مسرتوں اور آلام میں شریک نہیں؟ کیا اس کا کام صرف مسخرگی اور دل لگی ہے؟ کیا اس کا دل ایسا اور اس کی جلد ایسی موٹی ہے کہ اس پر کسی چوٹ کا اثر نہیں ہوتا؟ اگر یہ ہے تو وہ شاعر نہیں، مسخرہ ہے۔

فن شعر کے لحاظ سے شاعر کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک نجی حیثیت ہے یعنی یہ کہ وہ شعر کس طرح کہتا ہے۔ مثلاً چت لیٹ کے یا پٹ لیٹ کے، کھڑے کھڑے یا لیٹے لیٹے، ٹہل ٹہل کر یا باقاعدہ میز کرسی پر بیٹھ کر، اس سے ہمیں کچھ بحث نہیں۔ دوسری حیثیت اس کی وہ تعلق ہے جو اسے جمہور سے ہے اور یہی اس کی شاعری کی کسوٹی ہے۔ یہ تعلق کیا ہے؟ اسے میں ایک جملے میں عرض کئے دیتا ہوں۔ شاعر خلق اللہ کے لیے وہ کچھ کر سکتا ہے جو وہ خود اپنے لیے نہیں کر سکتا۔ شاعری میں ایک عنصر ایسا بھی ہوتا ہے جو اسے ایک دوسرے عالم میں لے جاتا ہے اور اسے اصلی اور حقیقی دنیا سے کچھ واسطہ نہیں رہتا اور اس عالم خیال میں اسے خاص لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے اکثر نقاد شاعری کا مقصد صرف یہی سمجھتے ہیں۔ اگر شاعر اس عالم خیال میں پہنچ کر وہیں کا ہو جائے تو بہک جاتا ہے۔ لیکن اصلی شاعر اس عالم میں پہنچ کر اپنے

اصلی اندیشوں اصلی خواہشوں، اور اصلی امیدوں اور دل کی تہہ میں چھپے ہوئے رازوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ تڑپ اٹھتا ہے اور یہ تڑپ اسے حقیقی اور زندہ دنیا کی طرف کھینچ لاتی ہے اور اسے اس بدلتی ہوئی دنیا کے مقابلے کے لیے زیادہ اہل بنا دیتی ہے۔ہم ایک دوسرے معاملے میں ضرور دل چسپی لیتے ہیں لیکن یہ دل چسپی ایک قسم کا تفنن ہوتا ہے جیسے اخباروں میں کرکٹ اور فٹ بال کے میچوں کے ذکر یا آپس کے تنازع اور جھگڑے سے۔یہ دل چسپیاں عارضی ہیں،ان سے ہم دردی نہیں ہوتی جب تک کوئی ایسی قوت نہ ہو جو لوگوں کو ناانصافی، رسم درواج کے تشدد اور گم راہیوں کے خلاف آمادہ کرائے۔ کبھی کوئی سچی ہم دردی اور حقیقی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔سیاسی لیڈر کبھی یہ بات پیدا نہیں کر سکتے اس لیے کہ وہ لوگوں کے تخیل کو نہیں ابھار سکتے۔ یہ شاعر ہی ہے جوان کے تخیل کو گدگداتا اور دبی ہوئی آگ کو بھڑکاتا ہے اور انھیں ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ وہ اپنے زور بیان، تشبیہوں اور استعاروں، مبالغے اور تخیل کے زور سے منتشر قوتوں کو ایک جا جمع کر دیتا ہے، افراد کو جماعت میں منتقل کر دیتا اور کثرت کو وحدت میں بدل دیتا ہے۔ ساری قوم ایک فرد واحد ہو جاتی ہے اس وقت ان میں جذبہ عمل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ زندگی کے اس مقصد کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں جس کی رہ نمائی ایک سچا شاعر ہی کر سکتا ہے۔

ملک میں افلاس ہے، جہالت ہے، غلاظت ہے، گم راہی ہے، اور نہ معلوم کیا کیا خرابیاں ہیں۔ کیا یہ اس لیے ہیں کہ لوگ جہالت و افلاس کو اچھا سمجھتے ہیں۔شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان لعنتوں کو اچھا سمجھتا ہو۔جب

سب بُرا سمجھتے ہیں تو پھر ان کا وجود کیوں ہے؟ یہ ہیں اور رہیں گی۔ اس لیے کہ جو لوگ ان لعنتوں میں مبتلا نہیں، وہ ان سے کامل ہم دردی نہیں رکھتے جو ان میں مبتلا ہیں اُن میں کامل ہم دردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ مصیبت زدہ کے رنج و تکلیف کا حقیقی احساس ہو، یعنی وہ شخص اپنے اوپر وہی حالت طاری کرے جو مصیبت زدہ پر ہے، اور یہ کیفیت صرف تخیل کی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے سیاسی لیڈر کام یاب نہیں ہوتا اور سچا شاعر کام یاب ہو جاتا ہے۔ جس قدر جس کا تخیل قوی اور تیز ہو گا۔ اسی قدر وہ اپنے اوپر دوسروں کی حالت طاری کرے گا اور اسی قدر اس کی ہم دردی زیادہ قوی اور کامل ہو گی۔ شاعر کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ تخیّل کو گدگداتا اور اُبھارتا ہے اور اس میں خیال جذبہ، عمل سب کچھ آجاتا ہے۔

حضرات! یہ کام ہماری اُردو کے تین شاعروں نے انجام دیا حالی چکبست اور اقبال۔ ان کے کلام میں خلوص، درد اور جوش پایا جاتا ہے اور ان تینوں نے ملک اور قوم کی وہ ضروری اور اعلیٰ خدمت انجام دی ہے جو کسی دوسری طرح ممکن نہ تھی۔ یورپی نقاد کہتے ہیں کہ شاعری کا ماحصل لطف و حظ ہے۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ انھیں فارغ البالی حاصل ہے، سامانِ عیش آرام مہیا ہے، تمدن کی بہت سی اعلیٰ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ لیکن ہم یہ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں صرف لطف حاصل کرنا ہی مقصود نہیں بلکہ ہمیں سکون و جمود کو بھی توڑنا ہے، غفلت و کاہلی کو مٹانا ہے، دلوں میں احساس و حرکت پیدا کرنی ہے اور سچ پوچھیے تو مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ ہمیں ایسے ہی شاعروں کی ضرورت تھی

جیسے حالیؔ، چکبستؔ اور اقبالؔ ہیں اور ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنے نغموں اور ترانوں سے قوم کو جگانے کا کام لیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم دل سے ان کا احترام اور عزت کرتے ہیں۔

یوں تو میں نے چکبست کا کلام پڑھا تھا لیکن تین سال کا عرصہ ہوتا ہے میرے ایک طالب علم نے جس کا مضمون اردو تھا اپنے مقالے (تھیسس) کے لیے چکبست کو انتخاب کیا۔ اسے یہ کام میری نگرانی اور ہدایت میں کرنا تھا۔ طالب علم محنتی اور شوقین تھا اور محنتی اور شوقین طالب علم استاد کے لیے وبال جان ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مجھے بھی چکبست کا کلام غور سے پڑھنا پڑا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیسا قادر الکلام شاعر ہے۔ زور بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے۔ وہ ملک کی بے بسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے اور اس حال میں جو کچھ کہتا ہے اس کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ آزادی کا دل دادہ ہے مگر بے لگامی کا روادار نہیں۔ وہ سچا لبرل ہے اور اس رستے پر چلنے والا ہے جو بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہے، جس کا دوسرا نام اعتدال ہے۔ لوگ اعتدال پر ہنستے ہیں اس لیے کہ وہ اس پر چل نہیں سکتے۔ انگریزی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے مگر یورپ کا اندھا مقلد نہیں وہ اپنے ملک کی معاشرت اور رسم و رواج سے خوب واقف ہے۔ اور ان کے عیب چن چن کر دکھاتا ہے لیکن وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ نئے خیالات کی رو میں ہماری خوبیاں بھی بہہ جائیں۔ وہ جذبات انسانی سے گہری واقفیت

رکھتا تھا اور بعض اوقات نازک جذبات کو موقع پر بڑی خوبی اور حسن سے ادا کر جاتا ہے۔

اس کا مشاہدہ بھی معمولی نہیں۔وہ حقیقت اور واقعیت کو خوب صورت تشبیہوں اور استعاروں میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ تصویر کھنچ جاتی ہے اور یہ سب باتیں اس زبان میں فصاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے جو ہماری تہذیب اور یک جہتی کی سب سے بڑی اور قابل قدر یادگار ہے اور آئندہ بھی آپس کے اتحاد میں کارگر ثابت ہوگی۔اس نے اپنے کلام سے اردو زبان کا مرتبہ بڑھا دیا اور اس کے ساتھ ہی اردو ادب میں اپنی جگہ قائم کردی۔ بلاشبہ اس کا شمار ہمارے اساتذہ میں ہے۔

اکبر کی شاعری کا [illegible] واخلاقی پس منظر

(یہ مضمون مولانا عبدالماجد صاحب کے ایک طویل [illegible] سے مقتبس ہے۔ مولانا صاحب ایک متبحر عالم اور صاحب طرز [illegible]۔ زبان، صاف وسلیس اور شگفتہ ہوتی ہے اور انداز بیان میں علمیت، فکر ونظر کی گہرائی اور ایک مخصوص قسم کا وقار ہوتا ہے۔)

اکبر کے صحیفۂ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق ومعاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی روح ان کی اخلاقی ومعاشری تعلیمات ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں، آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے اول سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی۔ ایک ظرافت، جس کا تعلق پیرایۂ ادا و انداز بیان سے تھا، دوسرے اصلاح معاشرت وتزکیۂ اخلاق، جس کا تعلق موضوع سخن و مفہوم کلام سے تھا۔

اکبر کی شاعری کے نمود وترقی کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا خمس اول ہے۔ یہی زمانہ ہندوستان میں مغربی تمدن، مغربی اخلاق، مغربی معاشرت غرض مغربیت کی انتہائی عروج وشیوع کا ہے۔ اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک وقوم کی حالت یہ ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کو فرو ہوئے چند سال گذر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت وتسلط کے شکنجے میں پوری طرح کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی

مزید مطالعہ کے لیے:- چند ہم عصر ادبی تبصرے ــ از مولانا عبدالحق

سوالات

۱- مضمون نگار نے شاعر اور مسخرہ میں کیا فرق بتایا ہے؟
۲- فن شعر کے لحاظ سے شاعر کی کون سی دو حیثیتیں ہیں؟

مشقیں

۱- مضمون نگار نے چکبست کی شاعری کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے ان کی وضاحت کرو اور چکبست کے کلام سے ان کی مثالیں تلاش کرو۔

۲- 'ناانصافی' اور 'ہمدردی' میں 'نا' اور 'ہم' سابقے ہیں۔
ان سابقوں کی مدد سے دس دس الفاظ بناؤ۔

۳- تم فعل متعدی کے بارے میں جانتے ہو۔ اس میں مفعول واضح رہتا ہے اور کبھی وہی مفعول فاعلی حالت میں ہو جاتا ہے فعل کی ان حالتوں کو طور کہتے ہیں۔ شاعر ہی تخیل کو گدگداتا ہے، دبی آگ کو بھڑکاتا ہے۔ اس جملے میں فعل کا پہلا طور آیا ہے جسے معروف کہتے ہیں۔ اس جملے کو یوں کہیں، شاعر ہی سے تخیل گدگدایا جاتا ہے اور دبی آگ بھڑکائی جاتی ہے، تو فعل کا طور مجہول ہوگا۔
تم سبق سے پانچ مثالیں معروف کی تلاش کر کے مجہول میں تبدیل کرو۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی جن کا انتقال ابھی حال ہی میں ہوا ہے، خواجہ نظام الدین اولیا کے خواہر زادے تھے، ۱۸۷۸ء میں انھیں کی درگاہ میں پیدا ہوئے۔ پیری مریدی اور دلی کی ٹکسالی زبان وراثت میں پائی تھی۔ البتہ اردو انشا پردازی خود ان کی کمائی تھی۔ بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا اور مرتے دم تک ہاتھ سے قلم نہ چھوٹا۔ انشا پردازی میں کمال رکھتے ہیں۔ کیسا ہی پیش پا افتادہ عنوان ہو مگر خواجہ صاحب کا معجز نگار قلم اور لطیف مزاج کی بہ دولت اس میں جان پڑ جاتی ہے اور اس میں عقلی نکات اور روحانی اسرار نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر ان کی اکثر تحریریں کانا باتی ہیں یا گدگدیاں، دل چسپ بات ہے کہ یہ ان کی کتابوں کے نام بھی ہیں۔

ان کے اسلوب بیان پر مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کا اثر ضرور نظر آتا ہے مگر خواجہ صاحب کا طرز اپنا مخصوص طرز ہے۔ پچاسوں کتابوں کے مصنف ہیں، متفرق مضامین ان کے علاوہ ہیں، اردو میں ان سے زود تر مصنف کوئی نہیں ہوا۔

غدر دلی کے افسانوں کی وجہ سے خواجہ صاحب کی خاص شہرت ہوئی، انھوں نے غدر کے عبرت ناک واقعات کو اتنے موثر انداز میں لکھا ہے کہ پڑھنے والا تڑپ اٹھتا ہے۔ بیگمات کے آنسو، بہادر شاہ کا مقدمہ اور دہلی کا آخری سانس ان میں بہت مشہور ہیں۔

کرشن بیتی، میلاد نامہ، آپ بیتی، بیوی کی تعلیم اور اولاد کی شادی دوسری مقبول کتابیں ہیں۔

مرچ نامہ

(مرچ ہم سب لوگ کھاتے ہیں اور اگر کھاتے نہیں تو ہم سب نے دیکھا ضرور ہے مگر اس پر مضمون لکھنے کا خیال شاید ہی کسی کو آیا ہو۔ خواجہ صاحب نے اپنی جدت طرازی اور ندرت بیان سے کیا کیا نکات اس مضمون میں پیدا کیے ہیں!)

پرانا قلعہ ہی نہ رہا جہاں کی لال مرچیں دلی میں مشہور تھیں اور پھیری والے کنجڑے پرانے قلعہ کی آواز لگا کر مرچیں بیچا کرتے تھے۔ کہنے کو قلعہ اب بھی موجود ہے لیکن اس کے آس پاس کی زمین جہاں مرچوں کی پیداوار تھی، نئی دلی کے نقشے میں آگئی اور کھیتی کیاری کا نقشہ قلعہ کے قریب بالکل مٹ گیا۔ خدا کی مار منہ میں آگ لگ گئی۔ آنکھیں پانی میں ڈوب گئیں۔ یہ سالن ہے یا مرچوں کا اچار۔

دلی والے خبر نہیں اتنی مرچیں کیوں کھاتے ہیں۔ دکن، مدراس اور دلی کے سوا ساری دنیا میں مرچوں کی اتنی زیادتی نہیں ہے۔ کہیں کالی مرچوں کا رواج ہے کہیں سرے سے مرچ کھاتے ہی نہیں۔ مگر دلی، الٰہی تیری پناہ۔ سالن میں لال مرچ نہ ہو تو دلی والے اس کی صورت پہ نام دھرتے ہیں۔ نیلی پیلی شکل بناتے ہیں۔

دہلی والے ہری مرچیں روکھی کھاتے ہیں۔ نیبو میں کتر کر کچومر بناتے

ہیں۔ اچار میں ڈالتے ہیں۔ لال ہو جائے تو دال سالن اس ہی سے پکتا ہے۔ سالن کی لال لال رنگت کی تعریف کی جاتی ہے جو مرچ کی تیزی سے ہر وقت سرخ رہتا ہے۔

لال مرچ کا پودا۔ دو ڈیڑھ فٹ اونچا مرچ کا درخت ہوتا ہے۔ ڈالیاں گنجان پتے ٹھنی کی برابر نوک دم۔ مرچ شروع میں بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ انگل بھر کی سبز چکنی، پاؤ انچ موٹی۔ جڑ کی طرف سے چوڑی منہ کے پاس سے پتلی۔ زمین کی طرف آنکھیں جھکائے رکھتی ہے۔

چند روز میں بڑھتے بڑھتے دو انچ ڈھائی انچ کی لمبی ہو جاتی ہے۔ بچپن کی سبزی جوانی کا سرخ لباس پہنتی ہے اور ہرے ہرے درختوں میں لال لال مرچیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سبز ساٹھن میں لال لال پھول یا روشنی کے سبز جھاڑ میں سرخ رنگ کی قلمیں لٹکا کرتی ہیں۔

بے چارہ درخت تو اول سے آخر تک سبز ہی رہتا ہے۔ خبر نہیں مرچ میں یہ جوانی کہاں سے آ جاتی ہے کہ مرتے دم تک لال رہتی ہے۔ شاید مرچ کے درخت کا جگر بھی لال ہو گا اور اس نے اس کو کاٹ کر مرچیں بنائی ہوں گی۔

مرچیں ٹوٹ کر آتی ہیں تو ڈوروں میں پرو کر اور ہار بنا کر یا یوں ہی چھتوں اور سوکھی زمین پر پھیلا کر ان کو سکھا لیتے ہیں۔ پھر کیا مجال دھوپ سے اس کے رنگ و روغن میں فرق آتا ہو۔ سوکھ کر مرجھا جاتی ہے مگر چہرہ ویسا ہی لال دمکا کرتا ہے بلکہ کھال میں ایک طرح کی چمک اور شفافی

پیدا ہو جاتی ہے جس میں سے اس کے اندر کے بیج نظر آیا کرتے ہیں۔

مرچ کے پیٹ میں بہت سے بچے یعنی بیج ہوتے ہیں اور ان کی شکل زرد اور گول گول بالکل سونے کی گنیوں کی سی ہوتی ہے۔

مرچ کے نقصان۔ مرچ کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اس کو تو کھیت میں دیکھنا چاہیے مگر خلقت کھاتی ہے۔ لال مرچ معدہ کو، جگر کو، مثانہ کو، دل و دماغ کو بے حد مضر ہے۔ مرچ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اس کا نقصان بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور معلوم نہیں ہوتا۔ مرچ بھی افیم اور شراب کی طرح منہ کو لگ جائے تو مشکل سے چھوٹتی ہے۔

مجھی کو دیکھو، اس کے ول دادوں میں ہوں۔ آٹھ دن ہوئے بالکل چھوڑ دی ہے اور دیکھتا ہوں کہ اس کے ترک نے میری صحت کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ "فراق مرچ میں انچور ہوا جاتا ہوں" وہ لال جوڑے والی جس کے سر پہ سبز رومال بندھا تھا، ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ کھانا سامنے آتا ہے تو روح اس کے دیکھنے سے انکار کرتی ہے اور رپتیلی کی لال پری کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔

کچھ ہی ہو، بات ہے تو سب کچھ ہے۔ اب تو جو عہد کر لیا خدا نے چاہا تو اس فتنی کو کبھی منہ نہ لگاؤں گا۔ ہندوستانی ہوں مگر بائیکاٹ میں ہندوستانی نہیں ہوں۔ جو کہتا ہوں اس سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہوتا۔

بی مرچ کو چھوڑ دیا۔ طلاق دے دی۔ برسوں ساتھ رہی تھی، اس واسطے اس کی یادگار میں یہ مرچ نامہ لکھا ہے کہ مجھ کو بے وفا نہ کہے۔

مرچ کی صوفیانہ شان ۔ ذرا دل کے مسالے کا بھی خیال رکھنا۔ جو بات کہو، جو لفظ زبان سے نکالو صوفیانہ نکتہ اس میں ضرور تلاش کرو۔ مرچ کی وداع کے وقت میں نے اس پر بھی عمل کیا اور سوچا تو واہ واہ مرچ کی عجیب ادا پائی۔ انسان کے افعال، اس کے لباس کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ عمدہ لباس تکبر سکھاتا ہے۔ ادنیٰ لباس خاک ساری کی طرف لے جاتا ہے۔

مگر مرچ جب ہری تھی، سبز کپڑے پہنتی تھی، جب بھی اس میں تیز مزہ تھا اور جب متوالی ہوئی لال برقع پہنا، اس وقت بھی تیز رہی تر تھی جب بھی تیز۔ خشک ہوئی جب بھی تیز۔ آدمی زمانہ کی تپش سے کمھلاتا ہے تو خدا کو بھول جاتا ہے۔ اپنے اخلاق حسنہ کو مٹاتا ہے۔ مرچ ایسی نہیں ہے اور شروع سے آخر تک مستقل زندگی بسر کرتی ہے اور یہی استقلال، یہی ایک حالی ثبوت ہے اس بات کا کہ مرچ ایک خدا رسیدہ پھل ہے اور مغروروں کی ناک میں اس کی دھانس گھس کر وہی کام کرتی ہے جو مچھر نے نمرود کا کیا تھا۔

مرچ میں مفید خواص بھی ہیں، اگر اس کا استعمال قدرت کی ہدایت کے موافق ہو ورنہ وہ شان قہاری کا نباتاتی ظہور ہے۔

(۲)
کربلا کی باتیں

(کربلا کی ٹریجڈی سے دنیا جہان واقف ہے اور اسے سیکڑوں طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے روایتی طریقہ نہیں اپنایا ان کی جدت پسند طبیعت نے اس بیان کا بھی ایک انوکھا طریقہ نکالا ہے)

سنتی ہو گنگا جی! میں ہوں فرات، عراق کا مشہور دریا۔ میں ہندوستان کی گنگا جی سے کربلا کی باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ تمھاری بہن جمنا بھی ہوں تو اپنے کنارے کی ایک دکھ بھری کہانی سناؤں۔ گنگا جی نے جواب میں کہا:۔

کیا کہتے ہو بھائی فرات؟ میں گنگا ہوں اپنی بہن جمنا جی سے ملی ہوئی الہ آباد سے جواب دے رہی ہوں۔ میں تم کو جانتی ہوں۔ میری اور میری جمنا کے کنارے سیکڑوں برس سے تمھارا نام مرثیوں میں لیا جاتا ہے۔ سناؤ، وہ کیا داستان ہے؟ کس کے دکھ کی بپتا ہے؟ فرات نے جواب دیا۔

"بہنوں! آج سے کچھ کم چودہ سو برس کا ذکر ہے، عرب ملک کے مشہور حضرت محمدؐ کے نواسے حسینؓ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ میرے کنارے پر آکر ٹھہرے۔ یہ حسینؓ اپنے باپ علیؓ کے زمانے میں جب کہ شہر کوفہ میں ان کا دارالسلطنت تھا اور وہ ایک تہائی دنیا پر وہاں بیٹھ کر حکومت کرتے

تھے، میرے کنارے گھوڑے دوڑانے آیا کرتے تھے۔ بڑی سندر صورت تھی، لمبے لمبے بال، کندھوں پر پڑے رہتے تھے، عراق کے لاکھوں عورت مرد ان کے آگے جھک جاتے جب ان کو دیکھتے تھے۔ مگر جب کا قصہ میں کہہ رہا ہوں، اس وقت وہ آئے تو ان کے باپ کی بادشاہی پر یزید نامی ایک انیائی اور ظالم راجہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ یزید کی فوج کا سیناپتی عمر سعد تھا اور اس نے حسینؑ کو گھیر لیا اور میرے کناروں پر پہرے لگا دیے کہ فرات کے پانی کا ایک بوند حسین اور ان کے بچوں اور عورتوں کو نہ ملے۔ اس زمانے میں بڑی گرمی تھی اور میرے کنارے کی زمین کا ریتا بھاڑ کی بھوبل کی طرح تپتا تھا اور حسینؑ کی عورتیں اور بچے کئی دن کی پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ وہ سب میرے کنارے پر تھے اور میرے بہتے پانی کو دیکھ سکتے تھے اور میں ان کے سوکھے ہونٹوں اور پیاسی شکلوں کو دیکھ سکتا تھا۔ حسینؑ کے بھائی عباسؑ مشک لے کر لڑتے بھڑتے میرے اندر گئے اور انھوں نے پانی بھر لیا اور دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر پینا چاہا مگر کچھ سوچ کر بولے، میرے بھائی پیاسے ہیں، میرے بھائی کی عورتیں پیاسی ہیں، میرے بھائی کے چھوٹے چھوٹے بچے پیاسے ہیں اور سکینہ بھی پیاسی ہے، میرے بھائی حسینؑ کی چھوٹی لڑکی جس نے مجھے پانی لینے بھیجا ہے۔ میں ان پیاسوں سے پہلے کیوں کر پانی پیوں۔ یہ بڑی بے مروتی کی بات ہے۔ یہ کہہ کر عباسؑ نے پانی ہاتھ سے پھینک دیا اور مشک لے کر چلے۔ دشمنوں نے تیر برسانے شروع کیے۔ ان کی مشک چھلنی ہو گئی۔

پانی بہنے لگا۔ پھر ان کے دونوں ہاتھ کٹ گئے اور مشک گر پڑی تو انھوں نے دانتوں سے مشک کو اٹھالیا۔ بہنوں! یہ آدمی بڑا بہادر معلوم ہوتا تھا، مگر میرے ہی کنارے مارا گیا اور اس کے بھائی حسینؑ گھوڑا دوڑا کر آئے اور اپنے مرنے والے بھائی کی لاش اٹھا کر لے گئے۔

بہن گنگا اور جمنا! ہم تم کو ہر وقت بہنا پڑتا ہے اور ہم سب نے اپنے اپنے کناروں پر بڑے بڑے دکھ دینے والے کام دیکھے ہیں۔

مگر جیسا دکھ بھرا قصہ میں نے اپنے کنارے دیکھا ایسا قصہ دنیا کے کسی دریا نے نہ دیکھا ہوگا۔ جب حسینؑ اور ان کے سب بچے اور سب ساتھی ایک ایک کر کے قتل ہو گئے تو یزید کی فوج نے بڑی بے رحمی سے عورتوں کے خیموں کو لوٹا اور پردے والی عورتوں کے سروں سے چادریں بھی چھین لیں اور ان کے بچوں کو بھی مارا اور ستایا اور ان کے خیموں میں آگ بھی لگائی۔ تم خیال کرو گے کہ یزید کی فوج کو ایسے برے کام کرنے کے لیے بڑی دولت یزید نے دی ہوگی۔ نہیں بہنوں! یہ بات نہ تھی ان کو فقط ڈیڑھ سیر جو فی آدمی روزانہ ملتے تھے۔

گنگا جی نے جواب دیا۔ بھائی فرات! تمھاری کہانی سن کر ہم دونوں کو بہت دکھ ہوا۔ ہمارے دیس میں بھی جمنا کے کنارے

راجہ کنشک نے بڑے بڑے ظلم کیے مگر ایسا ظلم جس کا تم نے ابھی حال میں بیان کیا ہے، راجہ کنشک نے بھی نہیں کیا۔ اس نے اپنی بہن کے بچوں کو راج چھین لینے کے ڈر سے مارا تھا پر ایسا دکھ نہیں دیا تھا جیسا یزید کی فوج نے حسینؑ اور ان کے بیوی بچوں کو دیا۔ مگر بھائی فرات اس میں بھگوان کی ایک لیلا تھی اور امام حسینؓ اس لیلا کو خوب جانتے تھے۔ جب ہی تو وہ اسنتوشٹ اور بے صبر نہیں ہوئے۔

فرات نے جواب دیا، سچ کہتی ہو میری بہنو! یزید کی فوج اور اس کے سیناپتی ابن سعد اور شمر بڑے ہی کھوڑ دل کے تھے۔ مگر حسینؓ کی بہادری بھی سارے سنسار کی بہادری سے بڑی تھی۔ بولو اللہ کے پیارے حسینؓ کی جے! فاطمہ کے سپوت کی جے!!

مزید مطالعہ کے لیے:۔ کانا باتی، گدگد بانسی پارۂ دل بیگمات کے آنسو از حسن نظامی

سوالات

۱۔ مضمون نگار نے مرچ کا کیا حلیہ بیان کیا ہے؟

۲۔ دوسرے مضمون کے طرز بیان میں کیا جدت ہے؟

مشقیں

۱۔ مرچ میں جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں ان کی وضاحت کرو؟

۲۔ ان جملوں کی تشریح کرو؟

ا مگر وہ لی ...... بتاتے ہیں۔

ب وہ لال جوڑے والی ...... اترتا۔

ج مرچ ایک خدا رسیدہ .... کیا تھا۔

۳۔ تم کرشن جی کے حالات معلوم کرکے انھیں جمنا کی زبانی دوسرے مضمون کے طرز بیان کرنے کی کوشش کرو۔

۴۔ ہمارے دیش میں بھی جمنا کے کنارے راجہ کنشک نے بڑے بڑے ظلم کیے مگر ایسا ظلم جس کا تم نے ابھی حال میں بیان کیا ہے راجہ کنشک نے بھی نہیں کیا۔ اس نے اپنی بہن کے بچوں کو راج چھین لینے کے ڈر سے مارا تھا پر ایسا دکھ نہیں دیا تھا جیسا یزید کی فوج نے حسینؑ اور ان کے بیوی بچوں کو دیا۔ ان جملوں میں حروف کی مندرجہ ذیل قسمیں آئی ہیں۔

حروف ربط۔ جس سے اسموں اور جملوں میں ربط پیدا ہو۔ جیسے نے، تک پر، سے۔

حرف عطف۔ جو الفاظ اور جملوں کو ملائے جیسے اور، کا، کی، کے

حرف شرط و جزا۔ جس سے شرط اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو جیسے جب، تب، تو، اگر، مگر

حرف نفی ۔ جس سے انکار ظاہر ہو جیسے، نہ، نہیں

حرف اشتراک۔ جس سے شرکت کی حالت پیدا ہو جیسے بھی، ان حروف کی مثالیں پڑھے ہوئے سبق سے چھانٹو۔

342

25[illegible]4

5[illegible]

2606

"دیسی کھانا ہم نے نہیں کھایا اور ملا عبدالقادر کے لیے پلاؤ، زردہ اور قورمہ شیرمال بھی بھیج دینا۔"

ان جملوں میں حرف کی مندرجہ ذیل قسمیں آئی ہیں۔

حرف ربط۔ جس سے اسموں اور جملوں میں ربط پیدا ہو جیسے نے، تک، پر، سے۔

حرف عطف۔ جو الفاظ اور جملوں کو ملائے جیسے اور، کا، کی، کے،

حرف شرط و جزا۔ جس سے شرط اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو جیسے جب، تب، تو، اگر، مگر۔

حرف نفی۔ جس سے انکار ظاہر ہو۔ جیسے نہ، نہیں۔

حرف اشتراک۔ جس سے شرکت کی حالت پیدا ہو جیسے بھی۔

" " " " کی مثالیں پڑھے ہوئے سبق سے چھانٹو۔

ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد ۱۸۸۸ء میں عرب میں پیدا ہوئے، بچپن کے کئی سال عربی ممالک میں گزارے بعد کو ہندستان آئے۔ کلکتہ ان کا آبائی وطن تھا۔

وہ ایک جید عالم، مفکر، ادیب، مورخ اور سیاست داں تھے۔ ان کی زندگی ہندستان کی عملی سیاسیات سے آخر دم تک اس طرح وابستہ رہی کہ لوگ ان کی زندگی کی دوسری حیثیتوں سے کم واقف ہو سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیائے ادب میں ان کا پایہ اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ میدان سیاست میں۔ انھوں نے علم و ادب کا انتہائی پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق پایا تھا۔ مولانا کی ہمیشہ کوشش رہی کہ ان کے ذوق ادب کی پاکیزگی اور بلندی میں کسی طرح حرف نہ آنے پائے۔ ان کے ادبی نگارشات "ادب العالیہ" میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ ادب اعلیٰ کے اتنے پاکیزہ اور عمدہ نمونے کم از کم اردو میں کم یاب ہیں۔

مولانا کی ادبی اور صحافتی زندگی "الہلال" کے پرچہ سے شروع ہوئی۔ اس پرچے کا زمانہ آج سے ۳۰۔ ۳۵ سال پہلے کا ہے۔ مولانا کے اسلوب نگارش میں ایک مجتہدانہ شان پائی جاتی تھی، اس میں بلا کی شگفتگی، رنگینی اور موسیقیت تھی۔ اس لیے لوگ ان کی نثر کو "شعر منثور" سے تعبیر کرتے تھے۔

الہلال کے بند ہونے کے بعد مولانا نے مستقل طور سے لکھنا بند کر دیا اور ہندوستان کی سیاسی جدوجہد سے اپنے کو اس طرح وابستہ کر دیا کہ ادبی ذوق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے مواقع نایاب ہوتے گئے۔

یہ مضمون مولانا کے ایک مکتوب سے اقتباس ہے۔ اس اقتباس سے فارسی اور عربی کے بہت سے اشعار اور ٹکڑے نکال دیئے گئے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے سیاسی ہنگامے میں مولانا موصوف قلعہ احمد نگر میں عرصہ تین سال تک اسیر رہے۔ اس دوران میں انھوں نے اپنے عزیز ترین دوست مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڈھ کو مخاطب بنا کر وقتاً فوقتاً مکاتیب لکھے جو اسیری کے باعث مکتوب الیہ تک نہ پہنچ سکے۔ یہ مکاتیب بعد میں اجمل خاں صاحب کی نگرانی میں "غبار خاطر" کے نام سے شایع ہوئے۔ نام کی موزونیت مولانا کی خوش مذاقی کا پتہ دیتی ہے درحقیقت یہ خطوط عالم کیف و سرور میں محض اپنے دل کا غبار نکالنے کی خاطر لکھے گئے۔ ان میں ادب اور انشا کی سخن طرازیاں ہیں، عقلیات و فلسفہ کی بحثیں ہیں، لطیفہ سنجیاں ہیں، جیل کے حالات اور مشاغل ہیں۔

یہ خطوط اردو ادب و انشا میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان میں بقول اجمل خاں صاحب نثر میں شاعری کی گئی ہے۔ جدتِ فکر کی نقش آرائی ہر جگہ ہے۔ وسعتِ تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر اور تجدیدِ اسلوب مولانا کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ مولانا نے فروری ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات پر سارے ملک میں سوگ منایا گیا۔

خوش رہتا ہوں۔

آپ کہیں گے قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے۔ لیکن لذتیہ کے عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا واقعہ ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں انھیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سر و سامان کہاں میسر آسکتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش، دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ سے ان کا دماغ لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی۔

ملے جو حشر میں، لے لوں زبان ناصح کی عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے

اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر و سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں ؎

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا!

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس

ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔

حسن نظامی بس کر، لکھ چکا۔ غالب کی لکھی ہوئی عبارتیں نقل کر چکا۔ اپنی حاشیہ نویسی کا بھی زور دکھا دیا۔ جہاں سنا رہا ہے وہاں کی پابندی کو بھی جانتا ہے کہ یہاں ایک ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کا حساب لکھا جاتا ہے۔ یہ سرکاری کارخانہ ہے۔ کیا تو نے اسی کو بھی دیگی اور بٹی اور زردوزی اور زرکوبی کا کارخانہ سمجھا ہے کہ بولنے بیٹھا تو بولے چلا جاتا ہے اور کارخانہ والے ہیں کہ جھوم رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اچھا پھر کیا ہوا اور کہو بات بیچ میں کیوں چھوڑ دیتے ہو۔ تمھاری بول چال میں تو بڑا مزا آتا ہے۔

لو استاد غالب، میں تمھاری داستان ختم کرتا ہوں، جو آسمانی لہروں کے ذریعہ دنیا کے ہر سن سکنے والے باشندے نے سن لی۔ کسی نے آہ کی، کسی نے واہ اور جب مولانا آداب عرض نے کہا ”خواجہ حسن نظامی کی تقریر آپ نے سنی“ تو سننے والے چونکے کہ ایلو وہ تو کہہ چکے۔ یہ تو وہ بولنے لگے جو کہا کرتے ہیں ”اچھا آداب عرض کرتا ہوں۔“

حکایت بادہ و تریاک

(مولانا ابوالکلام آزاد نے قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران میں اپنے دل کا غبار دور کرنے کے لیے اپنے ایک عزیز دوست حبیب الرحمان خاں شروانی کو کچھ خطوط لکھے تھے جو بعد میں 'غبار خاطر' کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ اقتباس ان کے ایک خط سے لیا گیا ہے۔ طلبہ کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے مشکل حصے حذف کر دئے گئے ہیں)

قلعہ احمد نگر
۲۷ اگست ۴۲ء

صدیق مکرم۔ انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی اور اندر کی۔ دونوں زندگیوں کے مرقع کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو نہ پہچان سکیں۔ قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر نہیں آنا چاہتا اور اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بار خاطر نہیں ہوتا لیکن یار شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں۔

لیکن جوں ہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریم دل کے

طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش ونگار بناؤں اور انھیں پھر سے آراستہ کر دوں۔

"وقتیست دگر بت کدہ سازند حرم را"

اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچاکر واپس چلی گئی، اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی، آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں۔ "ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوش گوار بناؤ" جس کا دستور العمل ہے۔

میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جز رواقیہ (Stoics)[1] کا ہے، ایک لذتیہ (Epicureans)[2] کا۔ جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جہاں تک زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔ میں نے اپنے کاک ٹیل[3] (Cocktail) کے جام میں دونوں بوتلیں اونڈیل دیں۔ میرا ذوق بادہ آشامی بغیر اس جام مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایت بادۂ وتریاک

---

[1] یونانی فلسفی زینو کے متبعین جو اپنے کو رنج و مسرت دونوں سے بے نیاز کہتے تھے۔

[2] فلسفی اپیکورس کے متبعین جن کا مشرب تھا "کھاؤ پیو، خوش رہو"۔

[3] جب کئی قسم کی شرابیں ملا دی جاتی ہیں تو اس آمیزش کو کاک ٹیل کہتے ہیں۔

میں نے تازہ کر دی ہے۔ البتہ کاک ٹیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خام کار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گساران کہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (VERMUTH) اور جن[۱] (GIN) کا مرکب پینے والے اس رطل گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔

آپ کہیں گے قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے، لیکن لذتیہ کے عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں انھیں قید و بند کی محرم زندگی میں اس کا سر وسامان کہاں میسر آسکتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش، دماغ کا عیش ہے جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ سے ان کا دماغ لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغؔ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی۔

ملے جو حسرتیں لے لوں زبان ناصح کی   عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے

اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر وسامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے

---

[۱] شراب کی قسمیں

مگر خود اپنی خبر نہیں ؎

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ، ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا!

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پروں کو کھول دے گا، ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔

قید خانے کی چاردیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیران قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گل گوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام رکھے کسی کو محروم کر دے۔ جب وہ کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی

ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سروسامان کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشے میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے۔ حالاں کہ اگر اسے ڈھونڈھ نکالیں تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے۔

ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے؟ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوش نمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی جلوہ فروشیاں کرے گی لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلایئے اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ! تو نہ مر جائے　　　کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

میں آپ کو بتلاؤں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہان زندگی کی ساری رونقیں اسی مے کدۂ خلوت کے دم سے ہیں، یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی۔

باہر کے سارے ساز و سامان عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک

یہ نہیں چھنتا، میرے عیش کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جام صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقات زندگی کا سب سے زیادہ پرکیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لئے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے اس لیے خود اپنے ہی دست شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی چینی چائے کا تازہ ڈبّا کھولتا ہوں اور ایک ماہر فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اس کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سرو سامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھئے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا؟

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے پینے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوق کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں۔ مگر خدا نخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشان کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لئے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتداد کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں، طول دوں گا۔ پھر دوسرے

اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوک قلم سے نکل رہی ہیں، اسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ ۹ اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا اور اب کیا ہو رہا ہے۔

میرا دوسرا پُر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحت تعین کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں، پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس وقت آسمان کی بے داغ نیل گونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواق دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں۔

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہے یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی، اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر

سمجھا تھا۔ ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے"؟ پھر جواب دیا ہے" جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے۔" اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے۔

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا ہے۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہرے کو غم گین نہ بنائیں۔

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہل قلم آندری ژید (Andre Guide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھی ہے۔ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں۔

"افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را!"

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بہ یک وقت متعدد آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات

بھی صرف ہماری نہیں ہوتی ۔ ہم جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں، اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے ۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غم ناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں ۔

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ، اور اخلاق تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہو گا ۔ گویا علم اور تقدس دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضرور ہوئی ۔

آپ جانتے ہیں کہ اہل ذوق کی مجلس طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی، اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی تو وہ زاہدان خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے ۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے ۔ اسی لیے بعض یاران بے تکلف کو کہنا پڑا تھا!

در مجلس ما زاہد! زنہار تکلف نیست   البتہ تو می گنجی، عمامہ نمی گنجد !

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سیکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاش فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے ۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک درختوں کا رقص،

پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ترنم، اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔

مزید مطالعہ کے لیے:۔ غبار خاطر کے اقتباسات

محشر خیال۔ از سجاد انصاری

سوالات

۱۔ مولانا نے قید خانہ میں عیش کوشی کا سامان کیسے مہیا کر لیا؟

۲۔ دل کے مر جانے سے کیا مراد ہے؟

۳۔ مضمون نگار کے اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ خوش رہنا ایک اخلاقی ذمہ داری ہے؟

روشنی

(منشی پریم چند کا یہ افسانہ ان کی کتاب "واردات" سے منتخب کیا گیا ہے۔ منشی جی کی کہانیوں کے دوسرے مجموعے ہیں۔ زادِ راہ، دودھ کی قیمت، خواب و خیال، آخری تحفہ، پریم بتیسی اور پریم پچیسی وغیرہ۔ ناولوں میں گئودان، میدانِ عمل، چوگانِ ہستی، کرم بھوم، بازارِ حسن اور غبن بہت مشہور ہیں۔ گئودان ان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔)

آئی۔ سی۔ ایس پاس کر کے ہندوستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی۔ میری دلی مراد بر آئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے ہی پہ کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی، اس لیے سیر و شکار اور اخبارات اور رسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا اور امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے، ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے۔ سوچتا تھا، "وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے شاندار رسالے نکلیں گے۔"

بہار کا موسم تھا۔ پھاگن کا مہینا، میں دورے پر نکلا اور اندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی، مگر منظر نہایت سہانا، دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوش گوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آگئے تھے

تھے۔ ان کے افسانے زیادہ تر رومانی اور عشقیہ ہوتے تھے۔ ان میں رنگینی اور شعریت زیادہ ہوتی تھی۔ منشی پریم چند نے ادب کو زندگی سے قریب کیا اور زندگی کے گوناگوں واقعات کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا۔ آپ کے افسانوں میں ہمیں زندگی کی نفسیاتی تحلیل بھی نظر آتی ہے۔ اور مسائل زندگی کا تجزیہ بھی کردارنگاری بھی ملتی ہے۔ اور افسانوی دل کشی بھی۔

منشی جی کے افسانوں میں بالعموم تین رجحان نظر آتے ہیں۔ سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی۔ معاشرتی اور بالخصوص دیہی زندگی کا خاکہ پیش کرنے میں آپ خصوصاً بہت کامیاب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں آپ کا کوئی مد مقابل نہیں ہے۔ اخلاقی افسانوں میں ایثار، خدمت، صداقت، خودداری اور شجاعت کی تلقین ہر جگہ نظر آتی ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں راجپوتوں کی شجاعت اور قدیم ہندو سماج کے روشن پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔

آپ کی زبان بہت سادہ ہوتی ہے۔ بقول مولانا سلیمان ندوی، پریم چند کی زبان اردو ہندی دونوں زبانوں کا سنگم ہے۔ تشبیہات اکثر اچھوتی ہوتی ہیں اور اس میں مقامی رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔ منشی پریم چند نے افسانوی ادب میں جو غیر فانی شہرت حاصل کی اس کے وہ ہر طرح مستحق تھے۔

پریم بتیسی، پریم پچیسی، زادِ راہ اور واردات ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ناولوں میں بازارِ حسن، چوگانِ ہستی، گئودان اور میدانِ عمل وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عیدگاہ

(یہ افسانہ منشی پریم چند کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں تیوہار کی تفصیلات کو نہایت خوبی سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے متعلق نفسیاتی باتوں کا دل کش بیان ملتا ہے۔)

رمضان شریف کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچّہ کی طرح پُر تبسم۔ درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے، کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے۔ گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارک باد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں۔ سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سیکڑوں رشتہ قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا، وہ بھی دوپہر تک، کسی نے وہ بھی نہیں لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی اُن کا حصّہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچّوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آ گئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سیویوں کے لیے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں اس کی انھیں کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا جان کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں،

ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور رکھ لیتے ہیں۔ انھیں دو چار پیسوں میں دنیا کی نعمتیں لائیں گے کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد وہ چار پانچ سال کا غریب صورت بچّہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہوگیا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔ کہتی کس سے کون سننے والا تھا، دل پر جو کچھ گزرتی تھی سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے حامد خوش ہے۔ امید تو بڑی چیز ہے پھر بچوں کی امید۔ اُن کا تخیل تو رائی کے پربت بنا لیتا ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹا سیاہ ہوگیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا محمود اور محسن، نور اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جاکر امینہ سے کہتا ہے: "تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں

والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو؟ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی ننھی سی جان تین کوس چلے گا۔ پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوئیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا کیا اس وقت سوئیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس دن فہیمن کے کپڑے سیے تھے آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی جاتی تھی اس عید کے لیے۔ لیکن کل گھر میں آٹا نہ تھا۔ اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لیے دو پیسے کا روز دودھ تو لینا ہی پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن سب ہی تو آئیں گی۔ سب کو سوئیاں چاہئیں کس کس سے منہ چھپائے گی اور منہ کیوں چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے زندگی خیریت سے رہے اور ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور بچوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو ساتھ والوں کا

انتظار کرتے یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سوداشروع ہوگیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھاکر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا اُلّو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے، اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی۔ بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ابھی تک پڑھنے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے۔ لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے ڈاڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔ گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کودن۔ غبی، کام سے جی چرانے والے۔ یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مُردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتا ہے اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو اندر نہیں جانے دیتے اور یہاں

لوگ شام کو کھیلتے ہیں۔ بڑے بڑے آدمی کھیلتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ۔ ہماری اماں کو وہ دے دو کیا کہلاتا ہے۔ "بیٹ" تو اُسے گھماتے ہی لُڑھک جائیں۔

محسن نے کہا ہماری امّی جان تو پکڑ ہی نہ سکیں ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم"!

حامد نے اس سے اختلاف کیا "چلو منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سیکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں کے تلے اندھیرا آجائے"۔

محسن۔ لیکن دوڑتی تو نہیں۔ اُچھل کود نہیں سکتیں۔

حامد۔ کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمھاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمھاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تم دونوں اُن سے پیچھے رہ گئے۔

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دوکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں۔ اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نہ ایک ایک دوکان پر منوں ہوں گی۔ سُنا ہے رات کو ایک آدمی ہر ایک دوکان پر جاتا ہے اور جتنا مال ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپئے دیتا ہے بالکل ایسے ہی چاندی کے روپئے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپئے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے؟

محسن ۔ جنات کو روپیوں کی کیا کمی جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک روک نہیں سکتے۔ جناب آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جوہرات ان کے پاس رہتے ہیں جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیئے پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔

حامد ۔ جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔

محسن ۔ اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔

سمیع ۔ سنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھوا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آکر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔

اب ہر ایک کی سمجھ میں آگیا کہ چودھری قائم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آکر انھیں روپیہ دے جاتے ہیں۔ آگے چلیے یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ، لپ۔ پھام پھو!

نوری نے تصحیح کی۔ کیا کہا۔ یہ پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تمھیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں شہر کے جتنے ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلہ میں تو چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو۔ اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو، جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں۔ لیکن تھیلیاں بھر بھر کر گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم، تھیلیاں بھر بھر۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا ماموں اتنے روپئے کہاں سے لاتے ہیں، ہنس کر کہنے لگے بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ یہ لوگ چوری کرواتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں۔

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ ارے احمق انھیں کون پکڑے گا، پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن نہ بچا کئی دن درخت کے نیچے سوئے۔ اللہ قسم! اچھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے، کوئی تانگے پر سوار،

کوئی موٹر پر چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوش بو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سرو سامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن، صابر و شاکر چلی جا رہی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔



وہ عیدگاہ نظر آئی جماعت شروع ہو گئی ہے۔ اوپر املی کے

درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے جس پر جا جم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ دہقانیوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں، ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پر احترام، رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانیوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے ان دل حیسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر کبھی آسمان پر جاتے معلوم ہو گے کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ۔ ہاتھی میخوں سے لگے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ اُن کے بزرگ

اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکّر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بھشتی اور سپاہی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بھشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ وہ کتنے خوب صورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے خاکی وردی اور لال پگڑی کندھے پر بندوق، معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آرہا ہے۔ محسن کو بھشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک ہے۔ مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے دوسرے ہاتھ میں رسی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے۔ شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ، نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں کی سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کوئی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے

ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں اگر دو کا کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں، کھلونا فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا؟ کس مصرف کے ہیں؟

محسن کہتا ہے میرا بھشتی روز پانی دے جائے گا۔ صبح و شام۔

محمود۔ اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فیر کر دے گا۔

نوری۔ اور میرا وکیل روز مقدمے لڑائے گا اور روز روپے لائے گا۔

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی کے تو ہیں گریں تو چکنا چور ہو جائیں۔ لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انھیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے۔ طرح طرح کی ضروری چیزیں ایک چادر پر بچھی ہوئی ہیں۔ گیند اور سیٹیاں اور بگل اور بھونرے اور ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے۔ محمود گیند۔ نوری ربڑ کا بط جو چوں چوں کرتا ہے۔ اور سمیع ایک خنجری۔ اسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لیے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بچارہ یوں مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں۔ کسی نے گلاب جامن، کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کم بخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوش بودار ہیں۔

حامد سمجھ گیا۔ یہ محض شرارت ہے محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں، حامد نے ہاتھ پھیلایا، محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں۔ محمود اور نور اور سمیع، خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانا ہو گیا۔

محسن نے کہا۔ اچھا اب کی ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ حامد۔ اللہ قسم۔

حامد نے کہا رکھیئے رکھیئے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

سمیع۔ تین ہی پیسے تو ہیں کیا کیا لو گے؟

محمود۔ تم اس سے مت بولو حامد۔ میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو۔

حامد۔ مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔

محسن۔ لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے؟

محمود۔ میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے

پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا چڑھا کر کھائے گا۔
حلوائیوں کی دوکانوں کے آگے کچھ دوکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔



دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا۔ اماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے گا تو وہ کتنی

خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ۔ مفت کے پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انھیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ برابر ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکے ہیں ضد کر کے لے لیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اتار لو۔ چولھے میں سینک لو۔ کوئی آگ مانگنے آئے چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت کہ بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھولاؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں آپ منہ سڑے گا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہو گی۔ اس نے پھر سوچا، اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی ماں کے لیے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسنوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انھیں دعائیں دے گا۔

بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو یوں مزاج دکھاؤں گا وہ کھلونے کھیلیں اور مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا جان کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی۔ پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لوگے، ایک ایک کو ایک ایک ٹوکری دوں اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا اور کتابیں دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑی لیں اور چڑھا چڑھا کر کھانے لگے۔ دست پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے دوکان دار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا یہ دست پناہ بیچو گے؟

دوکان دار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا "وہ تمھارے کام کا نہیں ہے"۔

"بکاؤ ہے یا نہیں"؟

"بکاؤ ہے جی اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں"۔

"تو بتلاتے کیوں نہیں، کے پیسے کا دوگے؟"

"چھ پیسے لگیں گے"!

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا "تین پیسے لوگے"؟ اور آگے بڑھا کہ دوکان دار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دوکان دار نے گھڑکیاں نہ دیں اور

دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ دست پناہ لایا ہے! احمق اسے کیا کرے گا؟ حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ ''ذرا اپنا بھشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچا کی''۔

محمود۔ تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟

حامد۔ کھلونا کیوں نہیں ہے؟ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا جما دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!

سمیع متاثر ہو کر بولا۔ ''میری خنجری سے بدلو گے؟ دو آنے کی ہے''۔

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ ''میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا''۔

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی

تو نہیں رہے ہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود اور محسن اور نوری ایک طرف حامد یکہ و تنہا دوسری طرف۔ سمیع غیر جانب دار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف جا ملے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ، لکڑی کی چیزیں ہیں۔ دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بھشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے چغنے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا؟

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا یہ بھشتی کو ڈانٹ بتائے گا تو وہ دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازہ پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب چھر اس سے چاہے گھڑے، مٹکے کونڈے بھر والو۔

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ بچا گرفتار ہو جائیں

تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولیئے جناب!

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادہ سے پوچھا اسے پکڑنے کون آئے گا؟

محمود نے کہا یہ سپاہی بندوق والا!

حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔ یہ بچارے اس رستم ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بچارے۔

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا اور کہا۔ "تمھارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا۔" حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ "آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب تمھارے یہ وکیل اور سپاہی اور بھشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا۔ "تمھارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے کرسی لگا کر بیٹھے گا۔" اس جملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ بیشک بڑے معرکے کی بات کہی دست پناہ تو باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔

حامد نے دھاندلی کی۔ میرا دست پناہ باورچی خانہ میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر ٹپک دے گا اور

سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما مُنہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند اور سیٹی اور بطِ زر روبیں تھے۔ مگر ان مشین گنوں کے سامنے اُن پٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستمِ ہند ہے۔ اس میں کسی کو چون وچرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا۔ "ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو"۔ حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن، محمود، نور اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا، اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوب صورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں۔ مگر ان کھلونوں کے لیے انھیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔

اسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ رستم ہے اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی گکڑیاں لیں اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالاں کہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستمِ ہند کی برکت تھی۔

گیارہ بجتے بجتے سارے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی میلے والے آ گئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بھشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی کے جو اچھلی تو میاں بھشتی نیچے آرہے اور عالم جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے، ان کی اماجان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا تو لحاظ کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ اُن پر ایک چیڑ کا پُرانا پٹرا رکھا گیا۔ پٹرے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آرہے اور ان کے جسد خاکی کے پُرزے پرزے ہو گئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق گھورے پر پھینک دی گئی تاکہ بے کار نہ جاکر زاغ و زغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے چلنے کی ذلت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے "چھونے والے جاگتے لہو" پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آ رہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہئے۔ گولر کا دودھ آتا ہے ٹانگ جوڑی جاتی ہے۔ لیکن سپاہی جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عمل جرّاحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو چل نہ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیئے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اُسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا"

"ہم نے مول لیا ہے۔ تین پیسے میں"۔

امینہ نے چھاتی پیٹ لی "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ

کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ، سارے میلے میں تجھے کوئی اور چیز ہی نہ ملی؟"
حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ "تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں"۔

امینہ کا غصّہ فوراً شفقت سے تبدیل ہو گیا اور شفقت بھی وہ نہیں جو پُر بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت کی درد اور التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف! کتنی نفس کشی ہے! کتنی جاں سوزی ہے غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا ہوگا! جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے، مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیوں کر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب ایک بڑی دل چسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا! اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

مزید مطالعہ کے لیے :- پریم بتیسی ، پریم پچیسی، گئو دان، میدان عمل

سوالات

۱- افسانہ نگار نے عید کی کیا چہل پہل بیان کی ہے ؟

۲- چودھری قائم علی کے پاس زیادہ دولت ہونے کی کیا وجہ بچوں نے بیان کی ؟

۳- تمہارے خیال میں امینہ کے رونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ؟

مشقیں

۱- اس کہانی میں منظر کشی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں تمھیں جو نمونے زیادہ پسند ہوں انھیں تحریر کرو

۲- ان پیراگرافوں کا خلاصہ بتاؤ۔

ا اب دو فریق ہو گئے .... آنکھیں نکال لے گا۔

ب گیارہ بجتے بجتے .... کام آئے گا۔

۳- پرتبسم اور ذی رعب میں 'پُر' اور ذی ، سابقے ہیں ان سابقوں کی مدد سے پانچ پانچ الفاظ اور بناؤ۔

۴- تم کلموں کی قسموں سے واقف ہو چکے ہو اب جملے کی ساخت پر غور کرو

لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں

لڑکوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ سب سے زیادہ خوش ہیں ۔

اس طرح سے جملہ کے دو بڑے اجزا کیے جا سکتے ہیں۔

"لڑکے" اور" سب سے زیادہ خوش ہیں"۔ قواعد کی رو سے پہلا جز مسندالیہ اور دوسرا مسند ہے ۔ اس طرح کی نسبت کو "اسناد" کہتے ہیں ۔

سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو چل نہ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصّہ سُنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اُسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا"

"میں نے مول لیا ہے۔ تین پیسے میں۔"

امینہ نے چھاتی پیٹ لی "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہو گئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ، سارے میلے میں تجھے کوئی اور چیز ہی نہ ملی۔"

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا "تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔"

امینہ کا غصّہ فوراً شفقت سے تبدیل ہو گیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو پُر بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت کی درد اور التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لئے کتنا ضبط کیا ہو گا! جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے، مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے اس کا دل کتنا لہراتا ہو گا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیوں کر اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آ جائے اور وہ اُسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

سجاد حیدر یلدرم

علی گڑھ کالج کے پرانے گریجویٹ تھے۔ پہلے نواب اسمٰعیل خاں صاحب تعلقہ دار میرٹھ اور پھر مہاراجہ صاحب محمود آباد کے پرائیویٹ سکریٹری رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کے اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ ہو کر برطانوی سفارت خانہ بغداد میں کام کرتے رہے۔ بغداد سے واپسی پر یو۔پی گورنمنٹ نے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر نامزد کیا۔ کچھ عرصہ ڈپٹی کلکٹری کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں رجسٹرار ہو کر آئے اور یہاں اپنی خوش انتظامی اور قابلیت سے کافی شہرت حاصل کی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے کچھ عرصہ بعد انتقال کیا۔

سجاد حیدر یلدرم کا نام اردو ادب میں ایک خاص طرز نگارش سے منسوب ہے۔ یہ طرز نگارش رقصاں اور سبک تراکیب، شگفتہ اور مترنم الفاظ اور پرکیف تشبیہ و استعارات سے عبارت ہے۔ سجاد حیدر اردو ادب میں ادب لطیف کے موجد ہیں۔ نیاز فتح پوری اور ل۔ احمد وغیرہ بھی اسی دبستان انشا سے متعلق ہیں۔

سجاد حیدر کے افسانوں اور مضامین کا مجموعہ "خیالستان" کے نام سے

دنیائے ادب میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس میں کچھ چیزیں تو ترکی اور انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں اور کچھ طبع زاد ہیں۔ اردو افسانہ نگاری کو جن لوگوں نے عمدہ ترجموں سے مالا مال کیا ہے ان میں سجاد حیدر کا نام بہت ممتاز ہے۔ آپ نے سب سے پہلے اُردو میں ترکی اور ایرانی افسانوں کے ترجمے کئے اور اس عمدگی سے کئے کہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں تین خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت تو وہ نفسیاتی نقطۂ نظر ہے جو افسانے کے ہر حصّہ میں یکساں طور پر نمایاں رہتا ہے دوسری خصوصیت رومان ہے۔ سجاد حیدر ایک رومانی افسانہ نگار ہیں اور خیالی پیکر بنانے اور اس کے گرد رومانی فضا پیدا کرنے میں انھیں خاص کمال حاصل ہے تیسری خصوصیت جذبات لطیف کی مصوری ہے۔ انھیں خصوصیات نے سجاد حیدر کو دورِ حاضرہ کا شگفتہ قلم اور لطیف نگار ادیب بنایا۔

سفر بغداد

کراچی سے بصرہ تک

(یہ اقتباس سفر نامے کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ سفر اور مقامات کا بیان اس قدر پر لطف انداز میں کیا گیا ہے کہ اس میں ادبی شان پیدا ہو گئی ہے۔)

۲۶ مارچ سنہ ۱۹۰۴ء کو اپنے پیارے دوستوں سے کچھ ارمان بھرے اور زیادہ تر حرمان بھرے دل کے ساتھ جُدا ہوا اور دوستوں نے جس عنایت اور محبت سے مجھے خیرباد کہا ہے اس کے شکریہ کے بجائے شکایت کو جی چاہتا ہے کیونکہ اس نے جُدائی کے قلق کو صد گونہ کر دیا۔ کراچی پہنچتے پہنچتے مجھے

احباب و اعزا کی کوشش گئی اور شہروں میں بھی لے گئی ؎

چلا ہیں وادیِ الفت میں راہ سوزن کی
قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہ ملے

آخر کار ۳ ۔ اپریل کو جہاز "کولا" کراچی سے روانہ ہو گیا۔ موسم نہایت خوش گوار تھا اور سمندر کی جبیں پر ذرا بھی بل نہ تھا اور اگرچہ یہ میرا پہلا بحری سفر تھا لیکن میں نہیں جانتا کہ سر گرانی اور طبیعت کا متلانا کسے کہتے ہیں اور اگر بحری سفر ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہے تو میں عمر بھر سفر کرنے کو تیار ہوں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ مئی جون میں خلیج فارس کا مزاج برہم ہوتا ہے اور اُس وقت وہ کسی کی نہیں سُنتی۔

۵ ۔ اپریل کو ۲ بجے سہ پہر کے وقت مسقط پہنچے۔ اس مقام کو دیکھ کر طبیعت نہایت مکدر ہوئی۔ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں جن پر درخت کیا سوکھی گھاس کے ایک پتے کا نشان نہیں اور اُس پر مسقط کو دعویٰ سلطانی ہے شہر مسقط پہاڑوں سے گھرا ہے اور خود پہاڑ کے ڈھال پر واقع ہے اور دور سے خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ پکے اور کئی منزل کے مکان ہیں، جو سمندر کے کنارے چلے آئے ہیں۔ کراچی میں سردی تھی اور آگے چل کر تو مجھے پوری پوری سردی ملی۔ مگر یہاں خیر سے ابھی سے وسط مئی کا لطف آ رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ اتر کر شہر دیکھ آؤں مگر قرنطینہ نے کسی کو اجازت نہ دی اور ہم مسقط کو دور ہی سے ڈنڈوت کر کے ۶ بجے شام کو روانہ ہو گئے۔ مسقط کے بعد بو شہر تک سمندر ذرا خراب تھا مگر میری

طبیعت پھر بھی خراب نہ ہوئی۔

۸ر اپریل کو ۸ بجے صبح بوشہر پہنچے۔ یہاں بھی اترنے کی اجازت نہیں ملی دوربین ہی سے شہر کو دیکھا اور کچھ اچھا نہ پایا (سنا ہے بوشہر کے انگور کھٹے ہوتے ہیں)

مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدھا بوشہر تو ہمارے جہاز کے گرد ہی آگیا تھا۔ ایک صاحب مجسّم قرنطینہ پھرتے تھے یعنی ان کی ٹوپی پر نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا تھا "قرنطینہ" جس کے نیچے ایرانی نشان یعنی شیر آگے کے پنجوں میں شمشیر لیے کھڑا تھا مگر صرف ایک کمی تھی وہ یہ کہ خود "قرنطینہ" صاحب کی صورت ڈراونی نہ تھی۔ پھر بھی میں ان سے ہمیشہ دس قدم کے فاصلہ پر رہا۔ چار بجے شام کو انھیں بھی خیرباد کہا۔

۹ر اپریل ۷ بجے صبح۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ ہم کس خطے میں جا رہے ہیں۔ رات ہی بھر میں یہ کیا طلسم ہو گیا۔ جہاز کے دونوں جانب یہ کیسا دل کش منظر ہے! دو طرفہ خرمے کے درختوں کی مسلسل قطاریں ہیں اور ان کے پیچھے اور نیچے گلاب اور نارنگی اور انار کے درخت ہیں جو پھول پھل سے لدے ہوئے ہیں۔ جہاں تک نگاہ دوربین کے ذریعہ سے کام کرتی ہے یہ مارے خوشی کے پاگل کر دینے والا منظر سامنے ہے اور میں حقیقت میں تھوڑی دیر کے لئے پاگل ہو گیا تھا۔ جہاز پر دوڑا دوڑا پھرتا ہوں۔ کبھی اس طرف کے منظر کو دیکھتا ہوں اور کبھی اس طرف کے۔

معلوم ہوا کہ ہمارا سفینہ سمندر چھوڑ کر دجلہ اور فرات کے مجموعہ پانی

کے سفینہ پر چل رہا ہے اور ایک طرف ساحل ترکی ہے اور دوسری طرف ایرانی۔ دجلہ اور فرات کے نام نے میں عرض نہیں کر سکتا کہ میرے دل پر کیا اثر کیا؟

آہ! تو اب ہم ان دریاؤں پر ہیں جو اسلامی تاریخ، اسلامی فسانہ، اسلامی ادب، اسلامی شاعری کے ہر صفحہ پر موج زن ہیں۔

دجلہ و فرات، دجلہ و فرات!! تو یوں کہیے کہ ان منظروں سے گزرتے ہیں اور ان ساحلوں کو سیراب کرتے ہیں۔ میں نے سوا کشمیر کے کہیں کسی دریا کا کنارہ اتنی دور تک ایسا سرسبز و شاداب نہیں دیکھا۔ اور اصل تو یہ ہے کہ جہلم کا کنارہ شاداب اور بہت شاداب ہے۔ آخر ملک کشمیر ہے۔ لیکن دوطرفہ میدان نظر آتا ہے۔ اگرچہ سرسبز میدان ہے۔ یہاں اس دریا کے کنارے سوا گھنے اونچے اور سرسبز درختوں اور پھولوں کے آپ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اوپر آسمان ہے نیچے پانی ہے اور دائیں بائیں نظر کو یہ درخت روک رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ میں سُنتا ہوں کہ یہاں سے بغداد تک یعنی چار سو میل تک قائم ہے۔ آپ کا جہاز ان سبز پوش سنتریوں کے بیچ میں ناؤ سے (جہاں سے سلسلہ شروع ہوا ہے) بغداد تک جائے گا۔

شاید لوگ خرمے کے درختوں کی اس قدر تعریف سُن کر زیرِ لب مسکرائیں گے مگر خیال رہے کہ یہ حجاز یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں ہیں کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں۔ اور گرد سیکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان ہے۔ یہ عراقین کے نخلستان اور خرمستان ہیں جس کے سایہ میں ہر قسم کے پھول اور پھل لگے ہیں اور دماغ کو معطر کر رہے ہیں۔ دو بجے ہم محمرہ پہنچے

یہ ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ یہاں ایرانی سرحد ختم ہوتی ہے اور یہاں سے دو طرفہ ساحل ترکی ہے۔

یہاں بھی وہی قرنطینہ "کولا" برٹش سفارت کے ایک جج ہز آنر ورتھ پکٹ قسطنطنیہ سے بغداد شریف لے جا رہے تھے۔ جو جہاز ہندوستان سے آتا ہے اس کے مسافروں پر ایک نہ دو دس دن کا قرنطینہ ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے یہ ترکیب کی گئی ہے کہ بغداد سے برٹش اسٹیم لانچ کامیٹ محمرہ بھیج دیا گیا تھا تاکہ وہ محمرہ سے اس میں سوار ہو کر بصرہ جائیں اور کہیں کہ میں محمرہ سے آ رہا ہوں تو ان پر کوئی قرنطینہ نہ ہوگا لیکن دقت یہ ہوئی کہ محمرہ کے قرنطینہ کے افسروں نے کہا کہ اگر یہاں اُتریں گے تو پانچ دن قرنطینہ میں رہنا ہوگا۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ لانچ جہاز کے ساتھ ساتھ چلا اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو ایک خالی مقام دیکھ کر چپکے سے جہاز کھڑا کیا گیا اور ہز آنر کامیٹ میں سوار ہو گئے اور باقی ہم سب یوں ہی حسرت سے دیکھتے رہے۔

محمرہ سے بصرہ کوئی تیس پینتیس میل کے فاصلہ پر ہے اور ذرا آگے بڑھتے ہی بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ وہی ہیں، پھول وہی ہیں، مگر اب ان میں امرائے بصرہ کے مکانات شروع ہو جاتے ہیں اور ان قدرتی بے جان پھولوں میں انسانی زندہ پھول اور غنچے نظر آنے لگتے ہیں یعنی حسین اور نہایت حسین ماہودی، آرمینین اور خال خال ترک عورتیں اور لڑکے لڑکیاں دوڑ دوڑ

کر لب دریا ہمارے جہاز کو دیکھنے آتے ہیں اور ہم دوڑ دوڑ کر ڈک کے کنارے ان کو دیکھنے جاتے ہیں۔ کاش یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا۔ مگر وہ تو ایک دو گھنٹہ ہی میں۔ جہاز بصرہ پہنچ گیا اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم سب قرنطینہ پہنچائے گئے۔

زنداں کو چلے محل محل کر

مگر حق یہ ہے کہ ہمارا قید خانہ برا نہیں۔ اس کے سامنے دریا کا منظر نہایت عمدہ ہے اور رات دن کشتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہاں گاڑی کا کام کشتی دیتی ہے اس لئے ہر وقت بادبانی اور دخانی کشتیاں سامنے سے گذرتی ہیں۔ بعض یہودیوں کا جھرمٹ ان کشتیوں میں عود بجاتا اور عربی گانے جنھیں ہم خاک نہیں سمجھے گاتا سامنے سے گزرتا ہے اور یہ عجب پر لطف سین ہوتا ہے۔

قرنطینہ کا مکان، سکنڈ کلاس والوں کے لئے خاصے آرام کا ہے اور میں سوا اس کے کہ تنہا ہوں نہایت آرام سے ہوں۔ موسم بے انتہا پیارا ہے۔ کھڑکی کے سامنے گلاب کا تختہ کھلا ہے اور مہک رہا ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ ؎

بہشت آں جا کہ آزارے

(ہائے مارڈالا کم بخت! کس زور سے کاٹا ہے۔ لکھنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے بھنبھناہٹ کی آواز بھی تو نہیں سنی ورنہ یہ تو خبردار کر کے کاٹتے ہیں) ------------ نیا شد

کسے را با کسے
"........"
(ارے تیری کی ایسی کی تیسی، پسو ہیں کہ قہر خدا تمام کپڑوں کے اندر گھس گئے اور مارے ددوڑوں کے تمام جسم سوج گیا۔)
"........کارے"
(ارے توبہ! پھر پیٹھ میں کاٹا۔ اب بغیر اس کے کہ تمام کپڑے اتار ڈالوں پسوؤں کا ملنا مشکل ہے۔ مچھر کو تو آسانی سے مار بھی سکتے ہیں۔ کل ڈاک جائے گی۔ مضمون ختم کرنا ضروری ہے اور یہ کاٹ کاٹ کر بے تاب کیئے دیتے ہیں)
..........نباشد
تو یہ مقام بہشت (ہائے! ہائے!! کیا کاٹتے ہیں، میں باز آیا اس بصرہ سے۔ اس شدت کے مچھر اور پسو تو میں نے کہیں نہیں دیکھے) اور یہ خیال رہے کہ مارچ اور اپریل کے بصرہ کا ذکر کر رہا ہوں ورنہ جون اور جولائی میں تو بصرہ کا نام لیتے ہوئے بھی چھالا پڑتا ہے۔ رہا بغداد تو یہ اس ولایت کا شملہ یا نینی تال یا کشمیر سمجھا جاتا ہے۔ کراچی سے یہاں تک جس شخص سے بغداد کا ذکر آتا ہے، مارے تعریف کے اس کی زبان خشک ہو جاتی ہے، بغداد کا موسم یوں اچھا، میوے یوں اچھے، پانی یوں اچھا غرض کہ ہر چیز اچھی ہی اچھی ہے اور صاف بات تو یوں ہے کہ جگہ تو یہ بھی اچھی ہے۔ مگر دس دن کا قرنطینہ، خدا کسی کو اس مصیبت میں نہ ڈالے۔ اب مجھے بھی یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ میں دس دن کی قید (غنیمت تھا کہ با مشقت نہ تھی) بھگت چکا ہوں۔ قسمت میں یہ لکھا تھا۔

اب تک منظر ہی دیکھے یا کسی آدمی سے بھی ملا؟ ہاں کیوں نہیں! کراچی سے جہاز پر بیٹھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب زیادہ تر واسطہ ایرانی، عرب، یہودی، ترک اور آرمینیوں سے ہو گا۔

جہاز پر میرے ہم کلام صرف تین صاحب تھے۔ ایک ایرانی، دو ارمنی۔ ایرانی صاحب کو اوّل تو میں انگریز سمجھا باتیں کرنے سے خیال ہوا (یوں کہ انگریزی ٹھیک نہیں بول سکتے تھے) کہ فرنچ ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانی ہیں۔ آغا محمد نمازی شیرازی نام ہے۔ شنگھائی سے آرہے ہیں اور وطن جا رہے ہیں۔ شنگھائی میں بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی حقیقت میں بعد بمبئی کے مسلمانوں میں اگر تجارت میں کوئی مسلمان قوم ہمت سے کام لیتی ہے تو وہ ایرانیوں کی قوم ہے۔ ترکوں کا تو اس میں نام و نشان نہیں۔

شیرازی صاحب اپنے ملک کے شیدا تھے۔ ان کے خیالات سننے کے لئے میں نے خواہ مخواہ ایران اور ایرانیوں پر اعتراض کرنے شروع کیے۔ مجھے نہایت لطف آتا تھا۔ جب وہ سچے جوش و خروش سے اپنے ملک کی حمایت کرتے تھے۔

دونوں ارمنی بمبئی میں تجارت کرتے ہیں اور اپنے وطن بصرہ کو آرہے ہیں۔ جب وہ عربی میں باتیں کرتے تھے تو مجھے مخالفین عربی بہت یاد آتے تھے کہ کاش وہ انھیں دیکھیں اور بتائیں کہ عربی نے ان پر کیا ستم ڈھایا۔ اچھے خاصے انگریز بنے ہوئے تھے۔

یہاں قوموں میں بڑا مغالطہ ہوتا ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی

مزید مطالعہ کے لیے:۔ خیابستان   از سجاد حیدر یلدرم
کہکشاں کا ایک سانحہ از نیاز فتح پوری

سوالات

۱۔ وہ کون سا منظر تھا جس نے مضمون نگار کو تھوڑی دیر کے لیے پاگل بنا دیا تھا؟
۲۔ زندان کو چلے مچل مچل کر'۔ اس مصرع میں کس زندان کی طرف اشارہ ہے؟
۳۔ نورانی چہرہ پر دو بڑے بڑے آنسو کیوں ڈھلکتے نظر آئے تھے؟

مشقیں

۱۔ تم ڈائری کی شکل میں اپنے کسی سفر کا حال بیان کرو۔
۲۔ اس مضمون میں منظر نگاری کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گیے ہیں اُن کی فہرست بناؤ اور انھیں اپنے مضامین میں استعمال کرنے کی کوشش کرو۔
۳۔ ان الفاظ کی تجنیس بتاؤ۔
محبت، شکریہ، شمشیر، منظر، کشتی، پیسو، جہاز، فکر۔
۴۔ حرف کی مشقیں تم پڑھ چکے ہو اب سبق میں آئے ہوئے ان لفظوں پر غور کرو
ارے، ہائے ہائے، ہی، اس لیے، الحمد للہ، وغیرہ
یہ بھی حرف کی قسمیں ہیں۔
حرف انبساط یا تحسین۔ جس سے خوشی یا تعریف مقصود ہو، جیسے ارے، واہ واہ
سبحان اللہ، وغیرہ۔
حرف تاسف۔ جس سے غم ظاہر ہو جیسے ہائے ہائے، آہ
حرف تخصیص۔ جس سے خصوصیت پائی جائے، جیسے، ہی، بھی
حرف علت۔ جس سے سبب ظاہر ہو جیسے اس لیے
حرف ندا۔ جس سے مخاطب کیا جائے، جیسے او، اے وغیرہ

"آج جا کر شہنا سے کہہ دے کھیت جانور چر گئے، ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔"

"رات بڑے گجب کی سردی تھی۔"

"میں کیا کہتی ہوں۔ تم کیا سنتے ہو۔"

"تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ شہنا کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ تمھارا کھیت چاہے جانور کھا جائیں، چاہے آگ لگ جائے، چاہے اولے پڑ جائیں اسے تو اپنی مال گجاری چاہیے۔"

"تو چھوڑ دو کھیتی۔ میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔"

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ "جی میں تو میرے بھی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں، منی تجھ سے سچ کہتا ہوں۔ مگر مجوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا۔ چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے کھیتی کا مرجاد نہ بگاڑوں گا۔ جبرا! جبرا! کیا تو سوتا ہی رہے گا؟ چل گھر چلیں!

مسعود حسن ادیب

لکھنؤ یونی ورسٹی میں عرصے تک شعبۂ اردو و فارسی کے صدر رہے۔ آپ کی تصنیف "ہماری شاعری" دورِ جدید کا ایک اہم علمی و ادبی کارنامہ ہے جس نے اردو شاعری کے محاسن کو ایک نئے انداز سے انگریزی داں طبقے کے سامنے پیش کیا۔ اس زمانے میں اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی مختلف قسم کے اعتراضات کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ "ہماری شاعری" نے ان اعتراضات کی دھار موڑ دی۔

آپ نے میر انیسؔ کے مراثی اور واجد علی شاہ کی تصانیف کے سلسلے میں بڑی تحقیقات اور چھان بین کی ہے۔ روحِ انیسؔ آپ کی مشہور کتاب ہے۔

واجد علی شاہ اور اردو ادب

(اودھ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ کی سیرت کے بالعموم تاریک ہی پہلو عوام کے سامنے آتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے ان کی زندگی کے روشن پہلو دکھائے ہیں)

اودھ کے آخری تاج دار سلطانِ عالم واجد علی شاہ خود بہت ذی علم تھے اور عالموں کی قدر کرتے تھے۔ ان کی قابلیت اور علمی قدردانیوں کا ذکر بہت سے مصنفوں نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک

مسعود حسن ادیب

۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ علم وادب کا گہرا ذوق پایا ہے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو کے صدر کی حیثیت سے عرصہ تک اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ وہ بلند پایہ ادیب ہیں مگر شاعر کی حیثیت سے ادیب تخلص برائے بیت ہے۔ آپ کا انداز بیان صاف، سلجھا ہوا اور سلیس ہوتا ہے۔ آپ کی تصنیف ہماری شاعری، دور جدید کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے جس نے اردو شاعری کے محاسن کو ایک نئے انداز میں انگریزی داں طبقہ کے سامنے پیش کیا۔ اس زمانہ میں اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی مختلف قسم کے اعتراضات کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ہماری شاعری نے ان اعتراضات کی دھار موڑ دی۔ لوگوں کو از سر نو اردو شاعری میں محاسن نظر آنے لگے۔

آپ نے انیسؔ کے مراثی اور واجد علی شاہ کی تصانیف کے سلسلے میں بڑی تحقیقات اور چھان بین کی ہے۔ انھیں تحقیق و تنقید سے فطری لگاؤ ہے اصولی طور پر وہ قدامت پسند نقاد ہیں اور شعر و شاعری میں نئے تجربات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔

ہماری شاعری کے علاوہ، روح انیسؔ اور آب حیات کا تحقیقی مطالعہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

سندیلے کے فاضل تعلقہ دار راجا درگا پرشاد صاحب مرحوم ہیں۔ انھوں نے الحاق اودھ کے برسوں بعد اودھ کی ایک تاریخ فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام بوستان اودھ ہے۔ وہ اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"سرزمین ہند پر کوئی بادشاہ ایسا نہیں گزرا جس میں واجد علی شاہ کی طرح علم و فنون جمع ہو گئے ہوں، اور ہندوستان کی مملکت میں کسی ایسے فضل و کمال والے فرماں روا نے بادشاہی کا علم بلند نہیں کیا۔ ان دنوں اگرچہ آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی کی وجہ سے خاطر اقدس طرح طرح کی فکروں میں گھری رہتی ہے، لیکن ان کا وقت زیادہ تر علمی تذکروں میں گزرتا ہے اور اپنی تازہ تصنیفوں اور نئی تالیفوں سے اپنے متوسلوں کو فیض پہنچاتے رہتے ہیں۔ اگر باغوں کی سیر کے لیے جاتے ہیں تو خادم اساتذہ کی تصنیفیں ساتھ رکھتے ہیں، اس لیے کہ سیر و تفریح کی حالت میں اکثر شعر و سخن کا ذکر رہتا ہے اور اساتذہ کی کتابیں ملاحظہ کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔"

واجد علی شاہ نے اودھ کے تخت پر بیٹھتے ہی اپنی فوجوں کی درستی کی طرف خاص توجہ شروع کر دی تھی اور کئی پلٹنوں اور رسالوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ فوج کے قواعد خود کرواتے تھے اور فوجی قواعد کی اصطلاحیں فارسی میں خود بنائی تھیں۔ انھوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے، جس کا نام تاریخی مرزا

حاتم علی بیگ مہر نے "مجاہدۂ اختری" تجویز کیا تھا۔ اس زمانے کے لکھنؤ میں بادشاہ سے لے کر متوسط طبقے کے لوگوں تک کو فنون جنگ کا خاص ذوق تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کو عام طور پر "شاہ نامہ" اور "حملۂ حیدری" کی سی رزمی کتابوں سے دل چسپی تھی۔ چنان چہ منشی ہردھیان سنگھ نے شاہ نامے کا خلاصہ فارسی میں لکھ کر واجد علی شاہ کے نام معنون کیا اور رجب علی بیگ سرور نے بادشاہ کی فرمائش سے شاہ نامے کے ایک قدیم خلاصے کا، جس کا نام شمشیر خانی ہے، اردو میں ترجمہ کر کے اس کا نام "سرور سلطانی" رکھا۔ حملۂ حیدری کا ترجمہ خود بادشاہ نے اردو نظم میں کیا اور ہیبت حیدری اس کا نام رکھا۔

جنگ اور بہادری کے قصوں کی مانگ جب بہت بڑھی تو امیر حمزہ کی پرانی داستان جو فارسی زبان میں تھی اردو کے لباس میں پیش کی گئی اور اسے اتنی وسعت دی گئی کہ ہزار ہزار آٹھ آٹھ سو صفحوں کی پچاس ساٹھ جلدیں تیار ہو گئیں۔ میرے لڑکپن تک لکھنؤ میں یہ منظر جگہ جگہ دکھائی دیتا تھا کہ کسی دوکان پر یا کسی مکان میں یہ داستان پڑھی جا رہی ہے اور لوگ شام سے آدھی رات تک بیٹھے سن رہے ہیں۔

اردو کے رزمی ادب میں سب سے بہتر چیز مرثیہ ہے۔ اگرچہ عہد واجدی کے نامی مرثیہ گو اس عہد سے پیشتر کے دور کی پیداوار تھے، مگر اس میں شک نہیں کہ اس عہد میں مرثیے نے بے حد ترقی کی

اور بہتر بن مرثیے اسی عہد میں لکھے گئے۔ واجد علی شاہ خود بھی مرثیہ کہتے تھے اور اگرچہ ان کے مرثیے شاعری کے اعتبار سے کچھ بہت اچھے نہیں ہیں مگر مقدار میں اتنے ہیں جتنے کسی خالص مرثیہ گو شاعر نے بھی شاید کہے ہوں۔ ان میں اسیر اور امانت کے مرثیے تعداد میں اوروں سے زیادہ ہیں۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ میں شعر و شاعری کا بڑا زور تھا۔ تقریباً ہر پڑھا لکھا آدمی شعر بھی ضرور کہتا تھا۔ واجد علی شاہ کو بھی کم سنی ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا چنانچہ ان کا ایک دیوان شاہ زادگی کے زمانے میں مرتب ہو گیا تھا۔ وہ بڑے زود گو تھے، خود کہتے ہیں۔ ؎

اس قدر جلدی غزل کہنا بہت دشوار ہے
کب کوئی دنیا میں اختؔر آپ سا پیدا ہوا

ان کے اس دعوے کی تصدیق کئی مصنفوں نے کی ہے۔ سوانح عمری کے مصنف محمد کاظم کا بیان ہے کہ سلطان عالم واجد علی شاہ اتنی جلد شعر کہتے تھے کہ دو کاتب مل کر بھی ان کو نہ لکھ سکتے تھے۔ مولانا شررؔ مرحوم نے بھی بادشاہ کی حیرت خیز زود گوئی کے بارے میں اپنی عینی شہادت پیش کی ہے۔ واجد علی شاہ کے منظوم کلام کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ وہ تیس پینتیس جلدوں میں سما سکا ہے۔

بادشاہ خود مشاعرے کرتے تھے اور مشاعروں میں

شریک ہوتے تھے۔ بہت سے شاعر ان کے دربار سے وابستہ تھے، جن میں ذکیؔ، برقؔ، قلقؔ، درخشاںؔ، اسیرؔ، امیرؔ، تسلیم خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ درباری شاعروں کے علاوہ اور بھی بہت سے خوش گو شاعر اس عہد کے لکھنؤ میں موجود تھے، مثلاً صباؔ، رندؔ، وزیرؔ، امانتؔ، شوقؔ، شہیدؔ۔ لکھنؤ سے باہر کے بعض شاعر بھی واجد علی شاہ کے خوان کرم سے فیض پاتے رہتے تھے۔ مثال کے لیے مرزا غالبؔ دہلوی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ایک قصیدے کے صلے میں بادشاہ نے زر نقد کے علاوہ ایک قیمتی خلعت عطا فرمایا تھا اور ان کے شاعرانہ کمال کے اعتراف میں ان کا وظیفہ پانچ سو روپئے سالانہ مقرر کر دیا تھا۔

بادشاہ کی کئی بیگمیں شعر کہتی تھیں جن میں سے چند کے تخلص یہ ہیں، عالمؔ، صدرؔ، محبوبؔ، بیگمؔ، عشرتؔ، قمرؔ، حورؔ۔ ان کے کئی شاہ زادے بھی شاعر تھے جن میں کوکبؔ، ہزبرؔ اور انجمؔ کے دیوان چھپے ہوئے موجود ہیں۔ جب تک واجد علی شاہ بادشاہ رہے لکھنؤ میں شاعروں کا جمگھٹا رہا۔ مگر ان کے کلکتہ چلے جانے کے بعد یہ مجمع منتشر ہو گیا اور شعر و سخن کے چرچے بہت کم ہو گئے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

جب سے قیدی ہوا کلکتہ میں آ کر اخترؔ
شاعر ہند بہت لطف سخن بھول گئے

عہد واجدی کے ایک استاد مولوی محمد بخش شہید گزشتہ شاعرانہ صحبتوں کو یاد کرکے اپنی دلی حسرت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

فصل گل کب آئے گی کب ہوں گے آکر نغمہ سنج
ایک مدت ہو گئی یارانِ گلشن کو گئے

واجد علی شاہ نے قصیدے بہت کم کہے اور غزلیں بہت زیادہ اور یہی حال اس عہد کے دوسرے شاعروں کا بھی ہے۔ امن و اطمینان، عیش و عشرت کے زمانے میں عشقیہ شاعری خوب پھولتی پھلتی ہے اور غزل میں عشق کی طولانی داستانیں بیان نہیں کی جا سکتیں، اس لیے عہد واجدی میں عشقیہ مثنویوں کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ خود بادشاہ نے کئی بڑی بڑی مثنویاں تصنیف کی ہیں۔ نام یہ ہیں، افسانۂ عشق، دریائے تعشق، بحرالفت اور عشق نامہ۔ اس زمانے کے دوسرے شاعروں نے بھی بہت سی مثنویاں کہیں جن میں سے یہ تین بہت مقبول ہوئیں۔ دیا شنکر نسیم کی گل زار نسیم۔ نواب مرزا شوق کی زہر عشق۔ آفتاب الدولہ قلق کی طلسم الفت۔

عشقیہ شاعری کی ایک خاص صنف واسوخت ہے۔ فارسی میں وحشی یزدی واسوخت کا موجد سمجھا جاتا ہے، اردو میں میر تقی میر نے واسوخت کی ابتدا کی۔ اس صنف سخن نے واجد علی شاہ کے عہد میں بڑی ترقی کی۔ امانت اور قلق کے

واسوخت بہت مشہور ہوئے۔ نواب مرزا شوق اور امیر مینائی نے بھی واسوخت خوب کہے۔

شعر و سخن کے عام چرچے کے ساتھ فن عروض کی طرف توجہ ہونا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ خود واجد علی شاہ نے اس موضوع پر شمس الدین فقیر کے ایک فارسی رسالے کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس میں جگہ جگہ اپنی طرف سے اضافے بھی کیے۔ بادشاہ کی اس کتاب کا نام ارشاد خاقانی ہے۔ اس کتاب کے چھپنے کی تاریخ مہدی علی خاں قبولؔ نے خوب کہی ہے ؎

تاریخ طبع کرد قبول ایں چنیں رقم
ملبوس دادہ نوشہ اقدس فقیر را ۱۲۶۹ھ

ارشاد خاقانی کے علاوہ واجد علی شاہ نے فن عروض پر تین رسالے اور بھی لکھے ہیں۔ اس عہد کے بعض دوسرے شاعروں نے بھی اس فن پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے اسیرؔ اور ذکیؔ کے رسالے بہت مقبول ہوئے۔

واجد علی شاہ کو موسیقی اور رقص کا بے حد شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کی ایک نئی صورت انھوں نے یہ نکالی کہ ایک طرح کا ڈراما ایجاد کیا، جس کے تمام ایکٹر گانے اور ناچنے کے فن میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ یہ ڈرامے "رہس کے جلسے" کہلاتے تھے۔ واجد علی شاہ نے متعدد رہس تصنیف کئے اور کنھیا اور

رادھا کی محبت کے افسانوں کو ان سب کا موضوع قرار دیا۔ رہس کے جلسے لاکھوں روپئے کے صرف سے تیار ہوتے اور قیصر باغ میں کھیلے جاتے تھے۔ ان جلسوں کی تعریفیں سن سن کر لکھنؤ کے عام باشندوں کے دلوں میں انھیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا مگر شاہی جلسوں میں ان کی رسائی ممکن نہ تھی۔ آخر ان کا شوق پورا ہونے کا سامان بھی ہوگیا۔ یعنی لکھنؤ کے ایک ممتاز شاعر آغا حسن امانت نے اپنے ایک شاگرد کے کہنے سے شاہی رہس کے نمونے پر ایک ناٹک لکھا اور کنھیا اور ران کی گوپیوں کی جگہ راجہ اندر اور ان کی پریوں کو دی اور اندر سبھا اس کا نام رکھا۔

دو برس کی محنت میں اندر سبھا کا جلسہ تیار کر کے پبلک کے سامنے پیش کیا گیا یہ جلسہ اتنا پسند کیا گیا کہ شہر بھر میں جگہ جگہ دکھایا جانے لگا۔ جہاں یہ جلسہ ہوتا تھا وہاں ہزاروں تماشائی ٹوٹ پڑتے تھے۔ اندر سبھا کی یہ غیر معمولی مقبولیت دیکھ کر دوسرے مصنفوں نے بھی اس کی تقلید میں ناٹک لکھنا شروع کردیے۔ کئی ناٹکوں کے جلسے بھی تیار ہو گئے۔ امانت کی اندر سبھا کے بعد مداری لال کی اندر سبھا سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ ان اندر سبھاؤں سے ملتے جلتے دو جلسے اور بھی مقبول ہوئے جن کے نام بزم سلیمان اور جشن پرستاں تھے اس طرح واجد علی شاہ کے زیر اثر اردو میں ڈرامے کی بنیاد پڑی۔

مختصر یہ کہ واجد علی شاہ کے عہد میں اردو کے ادبی ذخیرے میں اس وقت کے مذاق کے مطابق کافی اضافہ ہوا۔ بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ خود واجد علی شاہ نے نظم اور نثر میں سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ میں ان کی ستر پچھتّر کتابوں کا پتا لگا چکا ہوں اور ان میں سے کوئی چالیس کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

مزید مطالعہ کے لیے :- ہماری شاعری آب حیات کا تحقیقی مطالعہ از مسعود حسن ادیب
مشرقی تمدن کا آخری نمونہ از عبد الحلیم شرر

سوالات

۱۔ بوستان ادب کس کی تصنیف ہے اور اس سے واجد علی شاہ کی سیرت پر کیا روشنی پڑتی ہے؟

۲۔ واجد علی شاہ کو کن فنون لطیفہ سے شوق تھا؟

۳۔ رہس کسے کہتے ہیں اور اس کی ترقی کیسے ہوئی؟

مشقیں

۱۔ "اردو کے رزمی ادب میں سب سے بہتر چیز مرثیہ ہے"۔ اس خیال کی توضیح و تشریح کرو۔

۲۔ واجد علی شاہ کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لو۔

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ کی تجنیس لکھو۔
ذکر، قابلیت، مملکت۔ عَلَم، سیر، تفریح۔ توجہ، داستان۔ لڑکپن۔
منظر، مرثیہ۔ مقدار، شہادت۔

۴۔ فارسی جمع کے الفاظ بھی اردو میں بہت آتے ہیں جان دار کی جمع میں "ان" اور بے جان کی جمع میں "ہا"، لگاتے ہیں۔ جیسے بزرگ سے بزرگان
مرغ سے، مرغان، سال سے سالہا، بار سے بارہا، وغیرہ
تم کتاب سے ایسے الفاظ چن کر ان کی فارسی قاعدہ سے جمع بناؤ۔

اب عرب وحشی اور جاہل ہیں۔ اب جو لوگ ان ــــ اہل ہیں ان کے پاس یہ کام گیا۔" یہ فرمایا اور اس نورانی چہرے پر دو بڑے بڑے آنسو ڈھلکتے نظر آئے۔ اور پھر یکایک نظروں سے غائب ہو گئے۔

اس تقریر کا مجھ پر بہت اثر ہوا بڑی دیر تک میں خیال میں محو رہا اور پھر میں نے سوچا تو دیکھا کہ ان کا فرمانا صحیح تھا۔

مزید مطالعہ کے لیے :- خیالستان سجاد حیدر یلدرم

مشقیں

۱۔ تم ڈائری کی شکل میں اپنے کسی سفر کا حال بیان کرو۔

۲۔ اس مضمون میں منظر نگاری کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اُن کی فہرست بناؤ اور انھیں اپنے مضامین میں استعمال کرنے کی کوشش کرو۔

۳۔ ان الفاظ کی تجنیس بتاؤ۔
محبت۔ سکریہ۔ شمشیر۔ منظر۔ کشتی۔
پشتو، جہاز، فکر،

۴۔ حرف کی قسمیں تم پڑھ چکے ہو۔ اب سبق میں آئے ہوئے ان لفظوں پر غور کرو۔
ارے، ہائے ہائے، ہی، اس لیے، الحمد للہ، وغیرہ
یہ بھی حرف کی قسمیں ہیں۔
حرف انبساط یا تحسین، جس سے خوشی یا تعریف مقصود۔ جیسے ارے، واہ واہ، سبحان اللہ وغیرہ۔
حرف تاسف۔ جس سے غم ظاہر ہو جیسے ہائے ہائے، آہ۔
حرف تخصیص۔ جس سے خصوصیت پائی جائے جیسے یہی، بھی،
حرف علت۔ جس سے سبب ظاہر ہو۔ جیسے اس لیے
[illegible]۔ جس سے مخاطب کیا جائے جیسے، اُو، اے وغیرہ۔

نیاز فتح پوری

نیاز فتح پوری ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں درس لیا۔ نیاز کے والد ریاست رام پور میں محکمۂ پولیس کے انسپکٹر تھے۔ نیاز نے علوم عربیہ کی مزید تعلیم سرکاری مدرسہ عالیہ رام پور سے حاصل کی۔ کچھ دن تک ندوۃ العلما لکھنؤ میں بھی تعلیم پائی۔ عربی و فارسی کی درسیات ختم کرنے کے بعد انگریزی اور ترکی زبانوں کا پرائیویٹ طور پر مطالعہ کیا اور دونوں زبانوں میں اچھی استعداد پیدا کرلی۔ آپ نے مختلف روزانہ اخبارات میں کام کیا ہے اور اب تقریباً ۳۵۔۴۰ سال سے ایک بلندپایہ علمی و ادبی رسالہ "نگار" کے اڈیٹر و مالک ہیں۔ یہ رسالہ اب لکھنؤ سے نکلتا ہے اور اردو کے ممتاز ترین رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔

نیاز کا طرزِ تحریر بہت منفرد ہے۔ پہلے آپ کا رجحان لطیف نگاری کی طرف تھا۔ اس لیے تحریر میں تصنع کی حد تک رنگینی پائی جاتی تھی۔ زبان میں فارسیت و عربیت غالب تھی۔ عبارت میں نادر تراکیب، مترنم الفاظ اور تشبیہ و استعارے کی کثرت ہوتی تھی۔ مگر اب تحریر میں کافی اعتدال پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کا انداز بیان انگریزی طرز انشا سے بہت متاثر ہے جس سے آپ کے مخصوص رنگ میں اور حسن

پیدا ہو گیا ہے۔

نیاز کا اسلوب اُردو کے اسالیب بیان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ، رومانیت، ترنم و موسیقی، شعریت اور زور و قوت پائی جاتی ہے۔

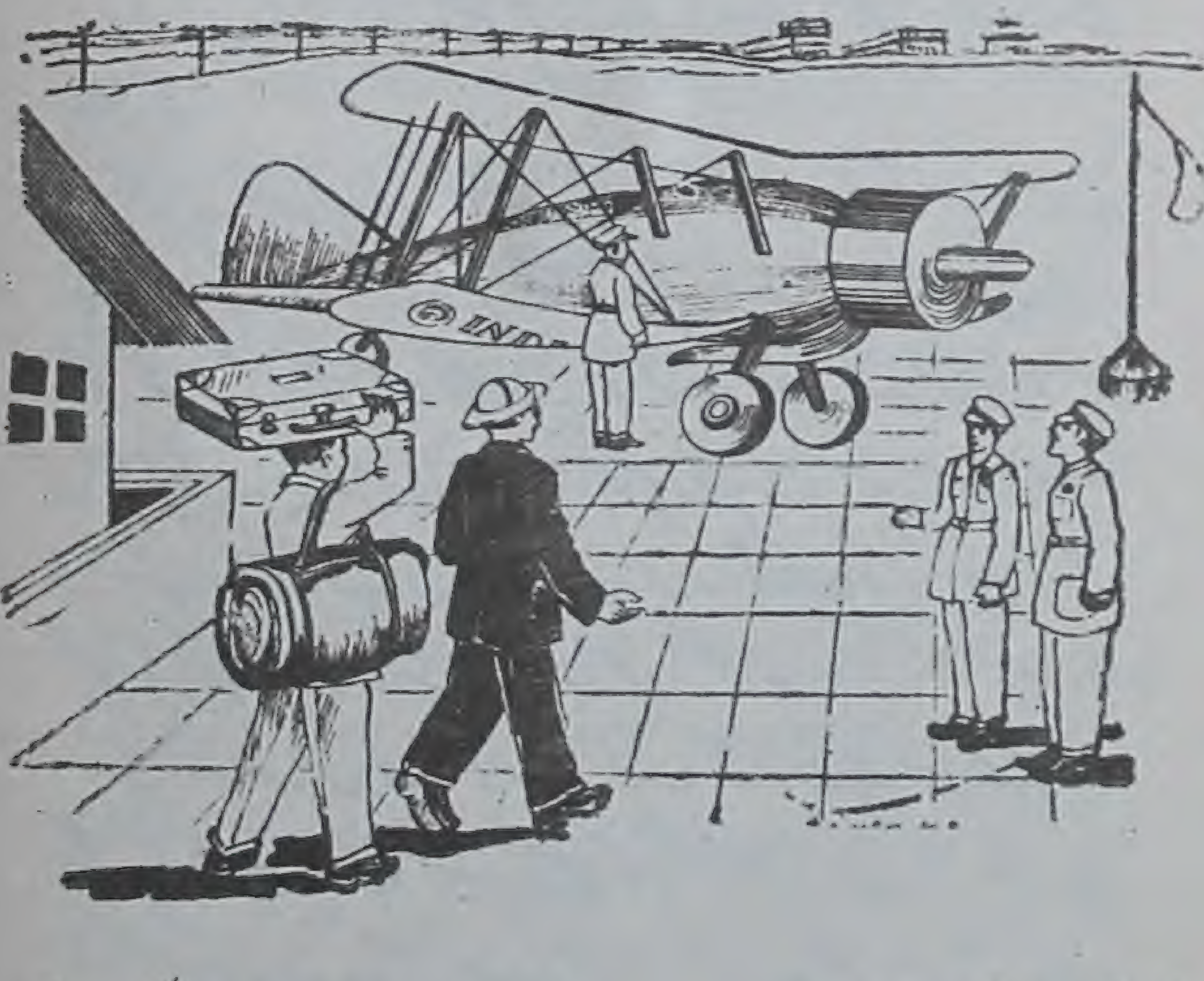
نیاز کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو اپنے قلم پر پورا اعتماد ہے اور لکھنے میں انتہائی جراُت سے کام لیتے ہیں۔ آپ ہر موضوع پر بے باکی سے قلم اٹھا سکتے ہیں۔ اُردو کے کم ادیب اس خصوصیت کے حامل ہیں۔

نیاز ایک بلند پایہ ادیب، انشا پرداز اور نقّاد ہونے کی حیثیت سے اُردو ادب میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کی تصانیف متعدد ہیں جن میں خاص شہاب کی سرگذشت، نگارستان، جمالستان، گہوارۂ تمدن، ترغیبات جنسی، جذبات بھاشا اور شاعرہ کا انجام وغیرہ ہیں۔ ایک ادیب اور جرنلسٹ کی حیثیت سے نیاز نے ادبی، مذہبی، سیاسی و اقتصادی غرض کہ ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ لیکن رومانی افسانوں میں بالخصوص بہت شہرت نصیب ہوئی۔ ان افسانوں میں کچھ تو دوسری زبانوں کے ترجمے ہیں اور کچھ طبع زاد۔ لیکن ایک خصوصیت قدر مشترک کی طرح تمام افسانوں میں پائی جاتی ہے وہ خصوصیت یہ ہے کہ افسانے تمام تر "شراب و شعر" میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان میں افسانویت سے زیادہ رنگین انشا پردازی نظر آتی ہے۔

چاند کا سفر

(چاند کا سفر ابھی تک محض انسان کے تخیل میں تھا۔ جب سے "اسپٹنک" چھوڑے گیے ہیں اس سفر کے امکانات پیدا ہو گیے ہیں۔ اس پسِ منظر میں یہ مضمون خاص دل کشی رکھتا ہے)

جیسے کسی نے یہ کہہ کر جگا دیا کہ ہوائی جہاز تیار ہے۔ ہاں یاد آیا مجھے بھی تو سفر کرنا تھا، اُٹھا، داڑھی مونڈی، کنگھا کیا، کپڑے بدلے، گرم کپڑوں کا صندوق موٹے موٹے کمبلوں کا بستر اور ایک بکس مختلف ضروری چیزوں کا خادم کے ذریعہ سے موٹر پر پہنچایا اور چل دیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خیال



آیا کہ ٹکٹ تو نہیں بھول آیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو موجود تھا۔ یہ ٹکٹ ایک سال کا موسمی ٹکٹ تھا اور عمومی تھا عمومی سے مراد یہ ہے کہ میں کرۂ ارض

کے ہر مقام سے سفر کر سکتا تھا اور کرۂ قمر کے ہر مقام تک جا سکتا تھا۔ کاسموپولیٹن کمپنی چوں کہ سب سے زیادہ معتمد علیہ کمپنی تھی اور اس کے جہاز بھی نہایت تیز رو اور آرام دہ ہیں اس لیے کرایہ تو ضرور زیادہ ادا کرنا پڑا لیکن میں نے اسی کو زیادہ ترجیح دی اور آخر کار سب کو خیرباد کہہ کر اس کرہ کی سیاحت کے لیے چل دیا جس کے تاب ناک وجود کی ہمارے کرۂ ارض کی بہت سی عشق خیز راتیں گرویدۂ احسان ہیں۔

دس منٹ میں پولو گرونڈ کے میدان میں پہنچ گیا اور کپتان کو ٹکٹ دکھا کر غیر ضروری سامان چھت کے ایک کمرہ پر رکھوا کر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا، ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بادلوں کے ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے تھے لیکن بالکل دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہلکے اور تُنک۔ بگل کی کرخت آواز بلند ہوئی، جھنڈا کھول دیا گیا اور سامنے کا پہیہ گردش کرنے لگا۔ ہلکی سی جنبش ہوئی اور تین پہیوں کے اوپر جہاز تھوڑی دور چل کر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا۔

میرے علاوہ نو۹ آدمی اور بھی تھے جن میں سے تین عورتیں، دو نوجوان لڑکیاں اور چار مرد تھے۔ یہ سب امریکہ کے باشندے تھے اور براہ راست وہیں سے سوار ہوئے تھے۔ یہ جہاز دو درجوں میں منقسم تھا، اوپر کا درجہ اسباب کے لیے تھا اور دوسرا بیٹھنے، سونے اور کھانے کے لیے، لیکن ہر کام کے لیے مختلف حصے تھے۔ کپتان کے کمرے میں ایک طرف لاسلکی ٹیلیفون اور ریڈیو لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایک بڑی گھڑی نہایت ہی پیچیدہ مشینری کی نصب

تھی۔ جس کے ذریعہ سے درجۂ حرارت، موسمی کیفیت، طول البلد، عرض البلد، درجات فلکی اور خدا جانے کیا کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

میری جگہ بالکل دریچہ کے پاس تھی، اس لیے بلند ہوتے وقت نہایت اچھی طرح محسوس کرتا جاتا تھا کہ تمام مکانات اور درخت وغیرہ کس طرح چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد شہر کا بلند مینار صرف ایک چھوٹا سا دھبا نظر آنے لگا۔ سردی بھی بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی بادل کے ٹکڑوں کے اندر سے ہم کو گذرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ بادل خشک تھے اور دریچوں کے شیشوں پہ ایک ہلکے نم کے علاوہ اور کوئی اثر نہ پیدا کرتے تھے۔

جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس جہاز کے تمام مسافر پورے ہو گئے ہیں اور اب براہ راست بغیر راہ میں کہیں قیام کیے ہوئے سیدھے کرۂ قمر تک کا سفر کرنا ہے تو میرے اعصاب میں ایک خاص قسم کی بے چینی محسوس ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ دیکھیے وہاں کیوں کر گزرتی ہے اور کس طرح سے واپسی ہوتی ہے۔

جہاز کی رفتار نہایت تیز ہوتی جاتی تھی اور سامنے جو رفتار پیما لگا ہوا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس وقت ہم ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ ابھی اس کی دوچند رفتار اور بڑھے گی۔ میں بیٹھا ہوا اپنی اس نئی سیاحت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ خادم آیا اور میرے سامنے کے مسافر کے پاس ایک تار لایا جو اسی وقت لاسلکی کے ذریعہ موصول

ہوا تھا۔ یہ اُسے دیکھ کر فوراً اُٹھا اور ٹیلیفون کو امریکہ کے کسی کارخانے سے ملا کر کاروبار تجارت کے متعلق کچھ ہدایت دینے لگا۔

میں سخت حیران تھا کہ اس وقت جب کہ جہاز کم از کم ۲۰۰ میل کی بلندی پر فضا میں اُڑ رہا ہے کیوں کر امریکہ کے کسی آدمی سے براہِ راست گفتگو کرنا ممکن ہے۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو میرے سامنے ہو رہا تھا اور کوئی وجہ اس سے انکار کی نہ تھی۔

دن بھر کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی کیوں کہ اب کرۂ ارض کا کوئی حصہ ہم کو نظر نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا جہاز صرف آسمان کے نیل میں تیرتا ہوا جا رہا ہے۔ ہوا چوں کہ ۱۰۰ میل کے بعد ہی ختم ہو گئی اس لیے ہر شخص کے منھ سے آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور رفتار ۱۵۰ فی منٹ تک پہنچ گئی۔

شام کو چاند کے طلوع کا نظارہ بہت دل چسپ تھا اور وہ آج ہم سے زیادہ قریب نظر آتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جب کہ ہم لوگ کھانا کھا کر سینما دیکھ رہے تھے کرۂ قمر سے ایک لاسلکی پیغام کپتان کو موصول ہوا۔ کپتان ہم لوگوں کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا کہ چاند کے بڑے سمندر میں شدید سیلاب ہونے کی وجہ سے جلد وہاں پہنچنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے یہ سفر کم از کم دس دن اور بڑھ جائے گا، کیوں کہ جہاز کی رفتار کم کرنا ہو گی۔ بعض کو اس خبر سے خوشی ہوئی، بعض کو رنج، لیکن میں نے اس کو مذاق سمجھ کر کوئی اثر نہیں لیا اور سامنے پردہ پر نہایت لطف کے ساتھ

میری پکفورڈ کی ایکٹنگ کو دیکھتا رہا۔ میں زیادہ جُزئیات سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ حقیقتاً اب جہاز میں کوئی نیا تجربہ نہ ہوتا تھا۔ وہی کھانا، پینا، سینما دیکھنا، اور سو جانا، روز کا مشغلہ تھا۔ اب میرے مراسم لوگوں سے کافی طور پر بڑھ گئے تھے اور اس لیے کبھی کبھی برِج کھیلنے میں بھی مشغول ہو جاتا تھا۔ ایک دن البتہ جہاز کا انجن کچھ برہم سا ہو گیا تھا اور جہاز نیچے کی طرف مائل ہونے لگا تھا۔ لیکن کپتان نے فوراً دوسرا انجن کھول دیا اور پانچ میل سے زیادہ نہ اُترے تھے کہ جہاز پھر تازہ قوت کے ساتھ صعود کرنے لگا۔ بیس دن کے بعد ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار بہت بڑھ گئی لیکن رفتار پیما صفر پر رہے۔ تھوڑی دیر میں کپتان مسکراتا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا سفر تو حقیقتاً آج ختم ہو گیا اور اب ہمارا کوئی کام باقی نہیں رہا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ہم کشش زمین کی حدود سے نکل کر کشش قمر کی حدود میں آ گئے ہیں تو میں اس کا مدعا سمجھا۔ الغرض ہم چاند کی طرف خود اپنی قوت سے نہیں جا رہے تھے بلکہ چاند خود ہمیں اس طرح کھینچ رہا تھا، جس طرح کوئی ڈھیلا زمین کی طرف پھینکے اور وہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف مائل ہو۔ جہاز اس وقت زمین پر اُترنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ چاند کی کشش دفعتاً اُسے کھینچ نہ لے اور اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا تھا کہ ہم چاند میں پہنچ کر دفعتاً کسی چیز سے ٹکرا جائیں گے۔ اس وقت سب سے زیادہ حیرت انگیز تجربہ میرے لیے یہ تھا کہ میرا بدن بالکل ہلکا ہو کر پھول سا

ہو گیا تھا اور جس وقت میں قدم اُٹھاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُڑ رہا ہوں۔

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدودِ زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا۔ چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند کرۂ زمین کے گرد چکر لگا رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ تھے، یعنی اس طرح ہم اوّل اوّل اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے تھے، جو حُبِّ وطن رکھنے والوں کے لیے یقیناً حجِ اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دیکھا کرتے تھے آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا پھول۔

جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی، کیوں کہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارے کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اتنی ہی بلند نظر آ رہی تھی اور وہاں باوجود اس کے کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن میں کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیوں کر ممکن ہے اور فوراً مجھے ایک دوست کا خیال آ گیا جو کہا کرتے تھے کہ زمین گردش کرتی ہے تو اس کے سمندروں کا پانی کیوں نہیں بہہ جاتا۔ واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت ہم کو اوپر نظر آ رہی تھی اور اس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی ہم تک نہ پہنچتا تھا۔ عقل قبول نہیں

کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اس کی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی، لیکن آخر کار ایک خاتون مچل ہی گئیں کہ "مجھے تو تم جلدی سے چاند میں پہنچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو! کیوں کہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمین کے سمندر بہہ بہہ کر نیچے کی طرف آ سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے"۔

سب لوگ ہنسے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اُس نے کپتان سے کہا کہ جلد سے جلد پہنچنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے تو اُس نے جواب دیا کہ آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہنچ سکتی ہیں۔ لیکن اس عالم میں اس کا حال صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے"۔

خاتون:- "یہ کیوں کر"؟

کپتان:- "وہ اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچ لے گی، جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلا نیچے کی طرف پھینکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہنچ جائے۔ اس وقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلے کی طرح چاند کی طرف کھنچا جا رہا ہے لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ اپنے سفر کا رُخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لیے وہ جا تو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلے کی طرح نہیں بلکہ ایک طائر کی مانند۔ اگر

آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے پہنچ جائیں گی لیکن بالکل اسی طرح جیسے چینی کے گُل دان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ پٹک دیا جائے۔"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعتاً جہاز کی رفتار ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی اور وہ ایک جگہ معلق رہ کر قائم ہو گیا۔ اس جھٹکے کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے، لیکن بعد کو کپتان نے آ کر اصل وجہ یہ بیان کی کہ "چوں کہ جہاز کا انجن کششِ قمری کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور میں نے اندازہ اسی کشش پیما سے کیا تھا جو زمین کے لیے مستعمل ہے اس لیے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چوں کہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لیے اس کی کشش بھی اسی سبب سے کم ہے۔ اب میں نے گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے اور اس قسم کا تجربہ شاید اب نہ ہو۔"

کپتان نے اس حالت پر اظہارِ افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ اگر جھٹکے سے کسی کو ایذا پہنچی ہو تو معاف کیا جائے۔ اب ہمارا جہاز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ سمت کی تعیین چوں کہ فضائے بسیط میں نہیں ہو سکتی، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چوں کہ پہلے سے روزانہ اب ہر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور درخشانی کم ہوتی جاتی تھی اس لیے ہم سمجھتے تھے کہ چاند کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ

میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بیوی کو سمجھایا تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ چاند میں خود روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہے اور اسی وقت اس کا ظہور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے لوٹتی ہیں۔ پھر چوں کہ شعاعوں کا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور جا کر ہوتا ہے اس لیے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ سفر اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی۔ پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ دس درکار ہوتی تھیں۔ حالاں کہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور ایک اونس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرام رہ گیا تھا۔ جو وزن ایک روٹی کا ہوتا تھا اس میں اب آٹھ روٹیاں چڑھتی تھیں۔ چوں کہ اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا اس لیے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا اور شراب کے دو ساغر پوری بوتل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لیے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نلکیاں ناک سے علاحدہ کر کے رکھ دی گئی تھیں۔ پھیپھڑا ساکن تھا اور قلب و نبض کے ضربات نہایت ہلکے ہو گئے تھے، کیوں کہ کرۂ قمر کی فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز اور ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کر کے خون میں مل جاتی ہے اور رفتار خون کو بہت دھیما کر دیتی ہے۔ اس لیے جون کو

صاف رکھنے کے لیے پھیپھڑوں کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ایک "عصری عضو" ہو کر رہ گیا۔

سردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ ہر شخص نے اپنے لبادے سمور کے کپڑے پہن لیے تھے لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت زیادہ مطمئن تھی کیوں کہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور لحاف کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تو اپنی ایک روئی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمبل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب وغریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ جذبات محبت وہم دردی میں کمی پیدا ہوتی جارہی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا بہت کم یاد آتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کی موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یوروپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے۔ لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے، نہ مرد عورت کے لیے اپنی جگہ خالی کرتا ہے اگر وہ جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھ کر اس کو سنبھالتا نہیں اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔ گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہو گیا ہے۔

کیوں کہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہنچتا ہے۔ اداے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کیے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سُن کر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہو پاتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں۔ کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا کیوں کہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں گیا تھا کہ اس کا وہی حصّہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رُخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصّہ نہایت دل چسپ تھا کیوں کہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن اور منوّر عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی۔ سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کیے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی۔ بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی اور محض رات ہونے کا علم اعصاب و دماغ میں ایک قسم کا تعطّل پیدا کیے رہتا تھا۔

اس ایک ہفتہ کی رات میں عجیب و غریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ سب پسینے پسینے ہو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سیکڑوں غبارے جو یک سر شعلۂ جوالہ نظر آتے تھے اُڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے

ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجمیات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہنچ گیا ہے جو ابھی تک کیسی حالت میں مشتعل ہیں۔ اس کے چہرے سے تشویش کے آثار پیدا تھے لیکن اس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کر کے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولے کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹے تک گرمی کا اثر باقی رہا اور پھر مشکل سے نیند آئی۔

دوسرا تجربہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتاً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بے شمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر انھوں نے نور کا جال بچھا دیا۔ معلوم ہوا کہ سب چاند کے شہاب ثاقب (Meteors) ہیں۔ نظارہ اس قدر دل فریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہو گیا اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہوگی جہاز کے عرشہ پر آ کر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہو گئے۔ ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا، لیکن اس میں سپید نقطے اس قدر کثرت سے تھے

جیسے گنی فول (مرغی) کے پر میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے بہت سے ٹکڑے کر کے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کر دیے گئے اور کچھ اس لیئے محفوظ رکھ لیے کہ کرۂ ارض کے کسی عجائب خانہ کو دے دیے جائیں۔

یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دل کش تھے لیکن میرے لیے تو سب سے زیادہ پُر لطف وقت وہ تھا۔ جب پورے ۱۶۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت بصارت آج از سرِ نو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر جنوری میں محبوب ہو جاتا ہے۔

سب لوگ کمل اُتار اُتار کر عرشہ پر آ گئے اور بے اختیارانہ طور پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جس کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے اُنھیں مل جائے گا۔ چوں کہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لیے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرد رات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں۔ اسی سلسلۂ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لے کر باہر پھینک دیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ نیچے کی

طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن ان کی اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب اس بید کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اُڑتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی دیر میں وہ جہاز سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اُس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پُر لطف تھا کہ مس جوزف نے اس کے بعد اپنی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری نہ تھیں باہر پھینک دیں اور اس تماشے کا لطف اُٹھایا۔ جس وقت انھوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی اور وہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اُڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بندھا ہوا ایک جال آگے کر کے ٹوپی کو پھر اندر کھینچ لیا۔ مس جوزف نے اس کو پھر فوراً باہر پھینک دیا اور کپتان نے پھر اسی طرح اس کو لے لیا۔ دیر تک یہ مشغلہ جاری رہا اور غالباً جاری رہتا، اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہو کر رات کا سماں نہ پیدا کرتا۔ دن نہایت مختصر صرف چار گھنٹے کا تھا اور اس خیال نے اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کر دیا۔ بجلی کی روشنی ہو گئی، کھڑکیوں کے پردے کھینچ لیے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے پھر ہر شخص تیار ہو گیا۔ اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کامل ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ہم سب سو کر اُٹھے تھے کہ دفعتاً روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آ رہے ہیں جو کرۂ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے وہاں نظر آتے

تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر اپنی مادر گیتی کے آغوش میں پہنچنے والے ہیں، کیوں کہ اونچے اونچے پہاڑ، بڑے بڑے دریا، وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آبادی کے ہیں تو ہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہم کو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا نیچے کی طرف جا رہے ہیں ورنہ اس سے قبل تو بلندی اور پستی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا۔ الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اُترا جسے وہاں کی زبان میں سوشان یعنی تختۂ گل کہتے ہیں۔

یہاں تک تو سطحِ قمر تک پہنچنے کا حال تھا اب میں کچھ واقعات و تجربات وہاں کے بیان کرتا ہوں۔

کرۂ ارض میں سُنا کرتا تھا کہ وزن نام ہے صرف کشش زمین کا اس لیے اگر کوئی کرہ زمین سے چھوٹا ہو تو وہاں کشش کی وجہ سے ہر چیز کا وزن کم ہو جائے گا یعنی اگر کوئی چیز کرۂ ارض میں ایک من ہے چاند میں پہنچنے کے بعد وہ صرف ایک سیر رہ جائے گی۔

جہاز پر بھی اس کا علم ہو گیا تھا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لیکن پوری حقیقت یہاں پہنچنے پر معلوم ہوئی۔ جس وقت ہمارا جہاز سوشان کے میدان میں اُترا تو اُس کی خفت وزن کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ سلنڈروں کی تمام قوت صرف کرنے پر بھی وہ اس طرح اُترتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے بلندی سے

کوئی پتنگ ٹوٹ کر جھپ کھاتی ہوئی نیچے اُترتی ہے۔

جب ہم سطح قمر پر اترے تو خیال تھا کہ یہاں انسانی آبادی نظر آئے گی اور کچھ اسی قسم کے آثار حیات دکھائی دیں گے جیسے زمین پر نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہ گئی جب بجائے انسانی آبادی کے وہاں ایک خاص قسم کے جانور دیکھے جو شکل و صورت میں تو انسان سے بہت مشابہ تھے لیکن اعضا میں بہت فرق تھا۔ مثلاً یہ کہ بجائے دو ٹانگوں کے ان کے صرف ایک ٹانگ تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ خفت وزن کی وجہ سے انھیں اپنا جسم سنبھالنے کے لیے ایک ہی ٹانگ کافی ہوتی ہے۔ جب یہ مخلوق چلتی ہے تو اپنی ٹانگ کو آگے نہیں بڑھاتی بلکہ سارا جسم ایک ستون کی طرح اوپر کی طرف بلند ہوتا ہے پھر جس طرف جی چاہتا ہے وہ اوپر ہی اوپر تیرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لیکن سو دو سو قدم چلنے کے بعد وہ پھر اسی ایک ٹانگ پر اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کوئی اوپر سے زقند بھر کر نیچے آیا ہو۔ اس لیے یہ مخلوق بالکل چھلاوے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کی ٹانگ گاؤدم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک لکڑی کی طرح برابر ہوتی ہے جس میں کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا اور اسے جسم سے علاحدہ بھی کر سکتے ہیں۔

یہ ٹانگ کمر سے ملی ہوتی ہے اور کمر نام ہے صرف ایک باریک سی ہڈی کا۔ چوں کہ یہاں کی زندگی کے لیے ہوا کی ضرورت نہیں ہے اس لیے پھیپھڑا بھی نہیں ہوتا اور غذا کے لیے معدہ بھی نہایت مختصر ہے کیوں کہ

صرف رقیق چیزوں پر گزر ہے جن کا فضلہ پسینے کی راہ سے نکل جاتا ہے اور اسی لیے امعا وغیرہ بھی نہیں ہیں۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ناک بھی ندارد ہے اور سخت چیزوں کی غذا نہ بننے کی وجہ سے دانت بھی نہیں ہیں۔ کانوں کے بجائے صرف ایک سوراخ پیشانی پر ہے اور دہن نام ہے ایک مختصر سے شگاف کا جس میں نہ زبان ہے نہ دانت۔ آنکھیں البتہ بجائے دو کے چار ہیں، دو رخساروں پر دو پشت پر، ہاتھ انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں لیکن نہایت ہی کم زور۔ جنس کا فرق بھی ان میں نظر نہیں آتا اور باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سلسلۂ تناسل ان کے ہاں کس طرح قائم ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کا راز ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کی تمام گفتگو سیٹیوں یا اشارات سے ہوتی ہے اور ان کے جسم کے اوپر سنہرے بال جا بجا کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ گفتگو کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والے پر سخت ہیبت طاری ہوتی ہے۔

جس وقت ہمارا جہاز پہنچا تو کثیر تعداد میں یہ جانور جو چاند کی اشرف المخلوقات ہونے کا فخر رکھتے ہیں چاروں طرف آ گئے اور لگے اپنے گول گول دیدے پھرا کر دیکھنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ لوگ لپٹ جائیں گے اور نوچ کر کھا جائیں گے۔ کپتان نے جو یہاں کے حالات سے کچھ زیادہ واقف تھا اس نے کچھ اشارات کی مدد سے کچھ سیٹیاں بجا بجا کر کبھی بیٹھ کر کبھی اٹھ کر اور طرح طرح کا منہ بنا کر خدا جانے ان سے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے لیکن ہم نے صرف اس قدر محسوس کیا

کہ وہ دور دور ہٹ گئے۔ غالباً اس نے یہی کہا ہوگا کہ یہ لوگ ڈرتے ہیں، ذرا دور ہو جاؤ۔ ہماری ہم سفر خاتونوں کی حالت نہایت خراب تھی۔ انھوں نے چہرے چھپا لیے تھے اور مردوں سے لپٹی جاتی تھیں۔ میں بھی جہاز کے اندر چلا گیا اور دروازے بند کر کے سوچنے لگا کہ کتنی بڑی غلطی یہاں آنے میں کی ہے اور اب بظاہر واپسی کی بھی کوئی اُمید نہیں ہے۔

یہاں کی زمین بالکل کرۂ ارض کی طرح ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سبزہ اور درخت کا پتا نہیں۔ جابجا اونچی اونچی چٹانیں ضرور ہیں جن سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے اور پانی کے اندر پتھروں پر چٹانوں کی چوٹیوں پر نشیب و فراز میں ہر جگہ برف کے بلورات (Crystals) مختلف ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں جو دور سے ہزاروں کھلے ہوئے سفید پھول کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ میدان جہاں ہمارا جہاز اُترا تھا تختۂ گل کے نام سے موسوم تھا۔ حشرات کا یہاں پتا نہیں ہے اور نہ چوپائے کہیں نظر آتے ہیں۔ طیور میں صرف ایک چیز بہ کثرت پائی جاتی ہے اور اس کو ہم ہندوستان کے چمگادڑ سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ چاند کا یہ جانور جسم و قامت میں بہت بڑا ہے اور اس کے پر و بازو بھی بہت وسیع ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ چیز معنوی حیثیت سے یہاں کی اجنبیت تھی اور ظاہری اعتبار سے یہاں کی بڑھی ہوئی سردی۔ آفتاب چمک رہا تھا لیکن یہ

بجائے گرمی کے اور خنکی برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کی ٹھٹھرن کسی طرح نہ جاتی تھی۔ ایک ایک منٹ تک مسلسل آگ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

یہاں نہ کوئی بازار ہے، نہ کوئی شہر۔ یہاں کی مخلوق غاروں میں اور پیڑوں کی چوٹیوں پر، جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ آپس میں نہ کوئی خاص اختلاط ہے اور نہ ایسی منافرت۔ ایک ایک غار میں چار پانچ کی جگہ ہوتی ہے اور شب و روز میں مشکل سے چند گھنٹوں کے لیے باہر نکل کر چشموں پر جاکر پانی پی لیتے ہیں اور پھر وہیں جاکر پڑ رہتے ہیں۔

یہاں کا سب سے دل کش مقام ایک تو وہ وسیع حصّہ سمندر ہے جو بالکل خشک ہوگیا ہے اور جس میں اتنے بڑے بڑے غار پائے جاتے ہیں کہ آج تک ان کی تھاہ نہیں ملی اور نہ یہ پتہ چلا کہ اُن کے اندر کیا ہے۔ دوسری تفریح کی جگہ سمندر کا وہ لب ریز حصّہ ہے جہاں برف کی ہزاروں چادریں تیرتی پھرتی ہیں اور یہاں کی مخلوق سوار ہوکر اُن سے جہازوں کا سا کام لیتی ہے۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی مچھلی بالکل چاندی کی سی پائی جاتی ہے۔ اس کا شکار کھانے کی غرض سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی چربی نکال کر جلاتے ہیں اور اس کی کھال کو اوڑھتے ہیں۔

سہ پہر کو جب ہم لوگوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا اور اس خیال سے خیموں سے باہر نکلے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی جھینگے کی طرح تیار تھی جس میں چار چار وہی

چمگادڑ جُتے ہوئے تھے اور ایک چلانے والا۔ اسی عجیب الخلقت قسم کا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھ کر سخت وحشت زدہ ہوا اور میں نے اس پر بیٹھنے سے انکار کیا، لیکن پیچھے مُڑ کر دیکھا ہی تھا کہ تین چار آدمی ایک ایک ٹانگ سے کودتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنے اشاروں، سیٹیوں، آنکھ کی گردشوں اور ڈراؤنی شکلوں سے ایسا ڈرایا کہ میں بے اختیارانہ اس چھینکے کے اندر گر پڑا اور چمگادڑ اس کو لے کر اوپر اُڑ گئے۔ میں چیخ رہا تھا، چلّا رہا تھا لیکن اس جانور پر کوئی اثر نہ تھا اور میں لٹکا ہوا اوپر فضا میں چلا جا رہا تھا۔ اگر اطمینان تھا تو صرف اس قدر کہ میرے اور ساتھی بھی اسی طرح آگے پیچھے چھینکوں میں لٹکے چلے آ رہے تھے۔

اندازاً دو گھنٹے کے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا کر ٹھہر گئی۔ میرے ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آ گئے۔ یہاں پہلے سے ایک جماعت ...... سروں پر اسی کھال کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہاتھوں میں پتھر کے نوک دار ٹکڑے لیے موجود تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں کے فرماں روا کے پاس جا رہے تھے اور یہ سب اس کے سپاہی تھے جو ہمارے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھے۔

انھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا اور ہم لوگ کملوں، سمور کے ٹکڑوں میں اپنے ہاتھ لپیٹے ہوئے آگے بڑھے۔ اب شام ہو گئی تھی اور آفتاب کی شعاعیں پہاڑ کی سفید چوٹیوں، میدانوں کی برفانی بلورات اور

وادیوں کے شفاف چشموں پر پڑ پڑ کر بے شمار قوس قزح پیدا کر رہی تھیں یہ منظر یقیناً اس قدر دل کش تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے میں اپنے تمام مصائب بھول گیا اور میرے ساتھیوں میں سے بھی ہر شخص محو ہو کر رہ گیا۔

چار فرلانگ کے بعد دفعتاً ہم کو ٹھہر جانا پڑا، کیوں کہ یہاں سے اب شاہی محلات کے حدود شروع ہوتے تھے۔ میں نے خدا جانے دل میں کیا جغرافیہ ان محلات کا قائم کیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہی محلات عبارت ہیں صرف ان وسیع غاروں سے جو کھود کھود کر پہاڑوں کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ان غاروں کا سلسلہ اس قدر وسیع و پیچیدہ ہے کہ اچھی خاصی بھول بھلیاں ہو گیا ہے اور اگر کوئی واقف الحال نہ ہو تو پھر ایک مرتبہ جانے کے بعد باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک غار کے دہانے پر پہنچ کر ہم لوگ ٹھہر گئے، اور اندر سے کئی آدمی مشعلیں لیے ہوئے نمودار ہوئے۔ جو سپاہی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ باہر ہی رہ گئے۔ اب ہم ایک سرنگ کے اندر جا رہے تھے جس کی چھت سے سرد پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور سردی کا یہ عالم تھا کہ ہڈی تک میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سُرنگ ایک فرلانگ کی تھی، اس سے نکل کر پھر روشنی میں آئے۔ لیکن اب چٹانوں کا لا تناہی سلسلہ سامنے تھا۔ اس کے بعد پھر دوسری سرنگ ملی۔ الغرض اسی طرح یکے بعد دیگرے پیچ در پیچ سرنگوں اور چٹانوں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹے کے اندر ہم خاص قصر شاہی کے اندر پہنچے جہاں بہت

بہت سی مشعلیں روشن تھیں۔ یہ قصرِ شاہی صرف ایک وسیع دالان سا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک سنگین تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا، جس کے جسم پر بہت سی سیپیاں چپکی ہوئی تھیں اور سر کے تاج میں جو اُسی مچھلی کی کھال کا تھا بہت سے رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس کی صورت بھی ویسی ہی بھیانک تھی۔ یہ اس وقت اپنی ٹانگ الگ کیے ہوئے ایک مضغۂ گوشت کی طرح تخت پر پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ قریب پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور اس نے مخصوص اشارات سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سنگین پیالوں میں شربت کی قسم سے ایک چیز آئی جس کو ہم لوگوں نے پیا۔ اس کے پینے سے ہم لوگوں کی ساری تھکن دور ہو گئی اور سردی کی شدت بھی کم محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ خاص چشمۂ شاہی کا پانی تھا جس میں عجیب و غریب اثرات پنہاں تھے۔ اس بادشاہ کے درباری بھی سب ایک وضع اور صورت کے تھے اور اس وقت ان سب کی سیٹیوں اور اشارات نے ایک خاص قسم کا ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

رات کو ہم لوگ یہیں رہے اور ایک غار کے اندر رہ صبح کرنی پڑی۔ جب دوسرے دن آفتاب بلند ہوا تو پھر بادشاہ کا سلام ہوا اور انھیں سرنگوں سے گزر کر چھینکوں میں بیٹھے۔ اس مرتبہ یہ چھینکے زیادہ بلند نہیں گئے بلکہ پہاڑوں کی سطح کے قریب قریب روانہ ہوئے۔ مقصود یہ تھا کہ اگر ہم لوگ سیر کرتے ہوئے جائیں۔ جب اپنے خیموں کے محاذ میں پہنچے تو یہ چھینکے دفعتاً بلند ہو گئے اور ڈرائیور نے آہستہ سے میرے بازوؤں

میں چمڑے کے دو پر جو پیٹے ہوئے تھے کسی چیز سے چپکا کر نیچے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد صرف مجھے اتنا ہوش ہے کہ جھٹکے سے گرنے کے بعد وہ دفعتاً کھلنے شروع ہوئے اور میں طائر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا، لیکن دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی برداشت نہ کر سکا اور سر چکرانے لگا۔ دفعتاً میں نے ایسا محسوس کیا کہ کسی چٹان سے جا کر ٹکرا گیا ہوں۔

آفتاب بہت بلند ہو چکا تھا اور میری چھوٹی بچی مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھی اور سامنے کرسی پر بیوی بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں اور وہ پوچھ رہی تھیں کہ آج سوتے میں تم نے چیخ کیوں ماری۔ میں ان کو دیکھ کر سہما جا رہا تھا کہ یہ بھی کہیں انھیں چاند والوں میں سے کوئی نہ ہوں۔ لیکن جب ان کی دونوں آنکھیں، دونوں کان اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم نظر آئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور بولا کہ چائے پی لوں تو بتاؤں کہ کتنی بڑی مہم سر کر کے آیا ہوں۔

مزید مطالعہ کے لیے:۔ شہاب کی سرگذشت از نیاز فتح پوری

سوالات

۱۔ "میں سخت حیران تھا"، کون سا واقعہ مضمون نگار کی حیرانی کا باعث ہوا؟

۲۔ ہوائی جہاز کی رفتار ایک جھٹکے سے کیوں رک گئی؟

۳۔ کرۂ قمر میں پہنچنے کے بعد سانس لینے کے لیے آکسیجن کی ضرورت کیوں نہیں رہ گئی تھی؟

۴۔ کرۂ قمر پر رہنے والی مخلوق کا کیا حلیہ مضمون نگار نے بیان کیا ہے؟

مشقیں

۱۔ فرض کرو کہ چاند سے کوئی جہاز زمین پر اترتا ہے۔ چاند والوں کے تاثرات بیان کرنے کی کوشش کرو۔

۲۔ ان مرکبات کی تشریح کرو اور ان کی قسمیں بتاؤ۔

کرۂ ارض، گرویدۂ احسان۔ راہ راست، حیرت انگیز، تجربہ، حج اکبر کشمش قمر، قلب ونبض، مساماتِ انسانی، عجیب ودل کش سخت چیز۔

۳۔ فعل کی قسموں سے تم واقف ہو۔ اب سبق میں آئے ہوئے فعل کی ان شکلوں پر غور کرو۔

جگا دیا، یاد آیا، دیا ہے، گیا ہے، چل رہی تھی، نظر آتے تھے، کرتا جاتا تھا جاری رہتا، پیدا کرتا، وغیرہ، یہ سب ماضی کی قسمیں ہیں،

ماضی مطلق جس میں زمانے کے دور نزدیک کی قید نہ ہو۔ جیسے جگا دیا۔ یاد آیا۔

ماضی قریب۔ جس میں زمانہ قریب میں ہو۔ جیسے آیا ہے، گیا ہے،

ماضی بعید۔ جس میں دور کا زمانہ پایا جائے۔ جیسے رہی تھی، گیا تھا

ماضی ناتمام۔ جس میں کام جاری رہے تمام نہ ہو جیسے آتے تھے۔ کرتا جاتا تھا۔

ماضی تمنائی۔ جس میں تمنا یا آرزو پائی جائے جیسے جاری رہتا، پیدا کرتا۔

تمنائی کو شرطی بھی کہتے ہیں۔

ماضی شکی۔ جس میں فعل واقع ہونے میں شک پایا جائے جیسے آیا ہوگا گیا ہوگا

علی عباس حسینی

اترپردیش کے محکمہ تعلیمات میں ملازم تھے۔ چند سال ہوئے سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوچکے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداے عمر سے

دل بہلاوا

(یہ ایک ایکٹ کا ڈراما علی عباس حسینی صاحب کے ڈراموں کے مجموعہ نورتن سے منتخب کیا گیا ہے۔ ڈرامے کا موضوع اس کے عنوان سے ظاہر ہے)

افراد

سلمٰی۔ ایک پردہ نشین باتونی خاتون
رحیمن۔ ایک جہاں دیدہ ماما۔
بزاز۔
ایک کمرہ ہے جس کی دیواریں زیادہ تر دھوئیں سے کالی ہیں،

علی عباس حسینی

اترپردیش کے محکمہ تعلیمات میں ملازم تھے۔ چند سال ہوئے سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدائے عمر سے تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ باسی پھول، آئی سی ایس، کچھ ہنسی نہیں ہے آپ کے افسانوں کے مشہور مجموعے ہیں۔ بہت سے ڈرامے اور ناول لکھے ہیں۔ ڈراموں کا ایک مجموعہ نورتن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی کتاب ناول کی تاریخ اور تنقید ناول نگاری کی مکمل تاریخ ہے۔ اس کتاب نے افسانوی ادب میں ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ حسینی صاحب کے افسانوں کے پلاٹ دل کش ہوتے ہیں۔ مقامی رنگ گہرا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اصلاح معاشرت کا پہلو بھی نمایاں رہتا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد سے متاثر ہو کر آپ نے چند بہت موثر افسانے لکھے ہیں۔

ان میں ایک ماں کے دو بیٹے بہت مشہور ہے۔ لکھنؤ کی زبان نہایت لطف سے استعمال کرتے ہیں۔

علی عباس حسینی

اردو کے مشہور افسانہ نویس ہیں۔ محکمہ تعلیمات میں ملازم تھے۔ چند سال ہوئے ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ باسی پھول اور آئی، سی، ایس آپ کے افسانوں کے مشہور مجموعے ہیں۔ بہت سے ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ڈراموں کا ایک مجموعہ نورتن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

حسینی صاحب کے افسانوں کے پلاٹ دل کش ہوتے ہیں۔ ان میں مقامی رنگ گہرا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اصلاح معاشرت کا پہلو بھی نمایاں رہتا ہے۔

دل بہلاوا

(یہ ایک ایکٹ کا ڈراما علی عباس حسینی صاحب کے ڈراموں کے مجموعہ نورتن سے منتخب کیا گیا ہے۔ ڈرامے کا موضوع اس کے عنوان سے ظاہر ہے)

افراد

سلمیٰ۔ ایک پردہ نشین باتونی خاتون

رحیمن۔ ایک جہاں دیدہ ماما۔

بزاز۔

ایک کمرہ ہے جس کی دیواریں زیادہ تر دھوئیں سے کالی ہیں،

کونوں میں جالے لٹک رہے ہیں، تخت پر چاندنی کا فرش ہے، گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی سلمیٰ میٹھی ڈلی کاٹ رہی ہے۔ سامنے ایک بڑا سا پان دان ہے اور تخت کے نیچے اگال دان رکھا ہے۔ تخت سے تھوڑے فاصلے پر دو پلنگ بچھے ہیں جن میں سے ایک پر میلی دری پڑی ہے دوسرے پر بستر سرہانے نہ کیا ہوا رکھا ہے۔ رحیمن ایک پیڑھی پر بیٹھی ہے۔

سلمیٰ۔ کس جگہ لا کے بند کیا ہے انھوں نے۔ نہ تو کسی سودا بیچنے والے کی آواز آتی ہے، نہ پھیری والے کی۔ نہ کہیں سڑک دکھائی دیتی ہے اور نہ کوئی برات آتی جاتی دیکھ سکتی ہوں اور نہ کوئی جنازہ۔ واہ کیا مکان ہے، ایک کمرہ دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں، صحن ندارد۔ بس میں پنجرے کی چڑیا کی طرح بند پھڑ پھڑاؤں۔ لوج اللہ میاں نے ہم لوگوں کو عورت کا جنم دیا (سروتا اور ڈلی ہاتھ سے رکھتے ہوئے) اور یہ موئی ڈلی آج کل نہ جانے کیسی چلی ہے، دام سنو تو تین روپیہ سیر اور آدھی سے زیادہ سڑی گلی۔ میں کہتی ہوں، یہ بنئے بھی بڑے ٹھگ ہیں، دھیلے کی چیز بھی آج کل روپئے ڈیڑھ روپئے میں دیتے ہیں۔ اب کل ہی دیکھو کہ ہم سائی جو ڈوپٹہ دکھاتی تھیں، ہو گا کوئی تین آنے گز اور ان کے میاں سے لیے ڈیڑھ روپئے گز۔

رحیمن۔ مگر بی بی بنئے تو کپڑا بیچتے نہیں، کپڑا تو بزاز بیچتے ہیں۔

سلمیٰ۔ اوئی رحیمن تم نے بھی کیا بات نکالی۔ چاہے بزاز انھیں کہو

یا بنیے سب ہیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ کوئی دال چاول لے کر خلق خدا کو ٹھگنے بیٹھ گیا اور کوئی کپڑا لے کر لوٹنے لگا۔ میں کہتی ہوں ان پاجیوں کے دل میں ذرا بھی خدا کا ڈر نہیں۔ آخر یہ اتنا نفع لے کے کہ یں گے کیا۔ انھیں نبتوں کا تو پھل ہے کہ جسے سنو بس بے اولادا۔ پوچھو تم گاہکوں کا کلیجا تو نکال لیتے ہو، بھلا تمھارے کلیجے میں کیا ٹھنڈک پڑے گی۔

رحیمن۔ یہ بی بی آپ نے بالکل ٹھیک بات کہی، ہم گریبوں کا دل دکھاتے ہیں جب ہی کھدا بھی ان سے ناکھس رہتا ہے۔

سلمٰی۔ ارے تو اور کیا۔ وہ تھانہ بنیا جو ہمارے یہاں لگا ہوا تھا، ارے بھلا سا تو نام تھا اس کا۔ بلاؤ، نہیں نہیں، پلاؤ ارے پیٹ میں ہے، منہ میں نہیں آتا۔ پلاؤ، ارے ہاں یاد آگیا، کھلاؤ۔ میں کہتی ہوں، ان موؤں کو نام بھی نہیں رکھنے آتا۔ عجیب عجیب طرح کے نام رکھتے ہیں، گھورو، گھسیٹے.........

رحیمن۔ نام تو بی بی میں نے پنجاب میں سنے ہیں۔ ایسے سکھت سکھت کہ جبان لوٹ جائے اور نام نہ نکلے۔

سلمٰی۔ اے تو میں کہتی ہوں کہ ان کی کون سی بات درست ہوتی ہے۔ کبھی بات کرتے سنو، معلوم ہوتا ہے پتھر کھینچ کے مارتے ہیں اور یہ بھی کیا پہناوا ہے اس طرف کا۔ چھوٹی قمیص اور شلوار۔ مردوں کو دیکھو تو یہی پہنتے ہیں۔ نگوڑی عورتیں تو یہی پہنے ہیں۔ ایسی صورت نکل آتی

ہے کہ واری قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ دنیا جہان کے مردوں عورتوں کے پہناوے الگ الگ ہیں مگر اس دلیس کی ریت ہی نرالی ہے۔ ان کا باوا آدم ہی دوسرا ہے۔ ان کے ہاں عورت مرد میں فرق ہی نہیں (آواز آتی ہے کپڑا لو! کپڑا! جمپر کے لیے، پائجاموں کے لیے، شیروانیوں کے لیے ہر طرح کا کپڑا، مردانہ زنانہ جوڑا) ارے تیری آواز کے مدینے، تو بولا تو، میری رحیمن روک لے اسے جلدی سے، اے ہے ذرا جلدی اٹھو بوا، تم تو اس طرح سڑسڑ چلتی ہو جیسے پورے دن ہیں۔ ذرا تو قدم بڑھا دے میری بیوی۔

رحیمن۔ اے کپڑے والے او میاں بزاز۔

بزاز۔ کدھر پکارا جی۔

رحیمن۔ ارے ادھر آ میرا بھائی، ڈیوڑھی پر۔

سلمیٰ۔ ارے تو ذرا تم باہر تک تو چلی جاؤ۔ تم کیوں پردے کی بوا بن گئیں۔ ذرا دیکھ کے پائجامے والا تھان نکلوا لاؤ۔ (رحیمن باہر جاتی ہے، سلمیٰ تخت سے اتر کر بے تابی سے ڈیوڑھی تک خود بھی جاتی ہے۔ باہر جھانکتی ہے) ہاں ہاں۔ پائجامے والا۔ ہاں وہ تھان لیتی آؤ رحیمن، ارے وہ بھی لے لو، ہاں ہاں وہ بھی۔ ارے اسے ادھر کہاں رکھ دیا۔ وہ تو بڑا وضع دار معلوم ہوتا ہے۔ کل دس ہی تھان تو ہوئے اور تم ہو کہ تم سے اٹھتا ہی نہیں ...... اے لے بھی آؤ کسی طرح، چند قدم تو چلنا ہے، دلی تھوڑے جانا ہے (رحیمن تھانوں سے لدی اندر آتی ہے۔ سلمیٰ جلدی سے دو

ایک اس سے لے لیتی ہے اور پلنگ کھینچ کر بیٹھ جاتی ہے) واہ واہ کیا کہنا ہے، اس کی کیا بوٹیاں ہیں۔ اس کا کیا، کیا رنگ ہے کیا چمک ہے اس کا پائیچہ دار خوب ہو گا۔ مگر اس میں گوٹ کاہے کی لگے گی۔

رحیمن۔ اسی کی گوٹ لگا دیجیے گا بی بی۔

سلمیٰ۔ نا بی بی۔ بھلا اس میں اسی کی گوٹ کیا جنچے گی۔ اس میں تو بس پٹا پٹی ہی کی ہونی چاہیے۔ اسی کی گوٹ لگا دوں گی تو بجھ کے رہ جائے گی۔ ارے دیکھا نہیں تھا تم نے بڑی نند کو میری۔ وہی جن کے دماغ میں انگریزیت سوار ہے۔ میں کہتی ہوں، نوج کسی کو اسکول میں پڑھائے۔ جہاں انھوں نے دو چار حرف پہچان لیے اور لگیں گٹ پٹ بولنے اور ہر چیز لوٹا ماچس کرنے۔

رحیمن۔ یہ لوٹا ماچس کیا بلا ہے بی بی؟

سلمیٰ۔ ارے تو تم بوڑھی ہونے کو آئیں اور ان چھوکریوں کی لوٹا ماچس ہی نہیں جانتی۔ ارے بی لوٹا ماچس کہتے ہیں رنگ میں رنگ ملانے کو۔ ایک ہم لوگ تھے کہ اگر ہم نے پائجامہ پہنا سرخ تو کرتا پہنیں گے دھانی اور ڈوپٹہ ہو گا فالسئی اور گندھکی، یا آج کل یہ وتیرہ چلا ہے کہ جس رنگ کا ڈوپٹہ ہو، اسی رنگ کی قمیص، اسی رنگ کا پائجامہ، اسی رنگ کا موزہ، اسی رنگ کا جوتا، اور اسی رنگ کا رومال اور اسے کہتے ہیں لوٹا ماچس۔

بزاز۔ ماما جی! ماما جی!

رحیمن۔ کیا ہے؟
بزاز۔ کچھ پسند بھی آیا کہ نہیں۔ کہو ذرا جلدی کریں، دیر ہو رہی ہے۔
سلمٰی۔ لو یہ بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار آیا ہوا ہے۔ میں کہتی ہوں یہ آخر آج کل کا ہے کی بھاگا بھاگ لگی ہے۔ جس سودے والے کو دیکھو بس یہی رٹنے لگتا ہے، جلد کیجئے، جلدی، دیر ہو رہی ہے۔ سودا خریدنا نہ ہوا ناک صاف کرنی ہوئی۔ بس جھٹ دامن سے پونچھ ڈالی اور کام میں لگ گئے۔
بزاز۔ (پکارتا ہے) ارے ماما جی کوئی چیز پسند بھی آئی کہ نہیں۔
رحیمن۔ ارے پسند کر رہی ہیں میرے بھائی، تم تو بس منٹ بھر میں گلا پھاڑنے لگے۔
سلمٰی۔ اے اس سے کہو کوئی اس کے تھان لے کے بھاگ نہ جائے گا۔ ہم کوئی ٹھگ اٹھائی گیرے نہیں ہیں۔ کوئی اس کی گاڑی چھوٹی جاتی ہے کہ اسے اس قدر جلدی ہے؟
رحیمن۔ تو بی بی اسی تھان کا پاجامہ بنا ڈالیے۔
سلمٰی۔ اس کا؟ یہ جو بوٹیوں والا ہے؟ ہے تو اچھا مگر مجھے اس کا رنگ کچا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا سوچو مٹھی بھر روپئے صرف کر دوں۔ اے ہاں آج کل تو ہر چیز میں آگ لگی ہے۔ جس چیز کو دیکھو اس کے دس گنے بیس گنے دام ہیں۔ ہاتھ جلتا ہے کوئی نیا کپڑا اٹھاتے۔ بڑے دل گردے کے ہیں وہ لوگ جو اس مہنگی کے سمے میں بھی نئے کپڑے

خریدتے ہیں۔ نا بی بی ہماری اتنی ہمت نہیں کہ خالی چمک بھڑک پر جائیں اور دھوبی کے ہاں سے جو پلٹ کر آئے تو معلوم ہو پوتڑے دھل کے آئے ہیں۔

بزاز۔ اے ماماجی، بڑی دیر ہو رہی ہے۔ خالہ!

رحیمن۔ اے تیری کھالہ کو کالا دیو لے جائے موئے۔ مجھے کھالہ پکارتا ہے جیسے میں ساٹھ برس کی کوئی بوڑھی کھوسٹ ہوں اور یہ سولہ تیرہ برس کا اینلا جوان۔

سلمیٰ۔ ہے ہے رحیمن تم تو اس سے لڑنے لگیں۔ ذرا ان کپڑوں کو تو دیکھو، کچھ رائے صلاح کرو۔ کچھ مشورہ دو بی۔ تم تو اس طرح منہ میں گھنگنیاں بھرے کھڑی ہو جیسے تمھیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ واہ بوا، واہ تم تو بازار میں نکلتی ہو۔ اپنی آنکھوں سے سیکڑوں ہزاروں تھان تم نے دیکھے ہوں گے۔

رحیمن۔ اللہ بنائے رکھے بی بی آپ سی سرکاروں کو سیکڑوں ہجاروں دیکھے بھی اور کھریدے بھی، پر.......

سلمیٰ۔ ہاں۔ ہاں تو میں خود بھی تو وہی کہتی ہوں، اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس بوٹی دار کا پاجامہ بناؤں، لگے گا کوئی گیارہ گز اور پھر اس پہ نکلا وہ کچا ہی تو پھر تو میں کہیں کی نہ رہی۔ بھلا بخشیں گے وہ مجھے۔ بس اٹھتے طعنہ دیں گے، "بیٹھتے لہنا۔" تو بی بی اس طرح کے طعنے کون سنے۔ یوں ہی کلیجا پکار رکھا ہے ان کی باتوں نے، اس پہ

بیٹھے بٹھائے میں ان کو ایک اور بہانہ دے دوں ہنانے کا۔ نا بی بی مجھ سے اس بزاز سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے، لے جائے اپنے ایسے سڑے گلے تھان اور بیچ لے اپنی ہوتیوں سوتیوں کے ہاتھ.....

رحیمن۔ تو دے آؤں اس کو؟ (اٹھانے لگتی ہے)

سلمیٰ۔ ہے ہے ذرا ٹھہر دتو اور تھان تو دیکھ لوں معلوم ہوتا ہے تم کو بھی اس موئے خفقانی بزاز کی ہوا لگ گئی۔ تم بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگیں (رحیمن گھبرا کر تھان رکھ دیتی ہے۔ سلمیٰ دوسرا تھان اٹھا لیتی ہے) وضع تو اس کی بھی اچھی ہے، مگر کپڑا ابھی سے بہا جا رہا ہے۔ بھلا یہ مشین پہ کیا چڑھے گا اور کسی طرح سنبھال کے دبا کے سی بھی لو تو پہنتے ہی تار تار الگ، کہیں مونڈھا کھسکا، کہیں بغل نکل گئی، کہیں دامن میں پھوسڑے نکل آئے۔

رحیمن۔ تو بی بی اسے ہرگز نہ لیجیے کوئی اور پسند کیجیے۔

سلمیٰ۔ ہاں اسے تو رہنے ہی دو، وہ سا اٹھاؤ، ہاں ہاں وہی جس پہ چارخانہ سا بنا ہے، ارے یہ تو بالکل کمل ہے۔ میں کہتی ہوں ان بنانے والوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ ذرا سوچتے کہ کوئی اس ٹاٹ کا پائجامہ بنا کر کیا کرے گا۔ نہ ناف پہ ٹھہرے گا، نہ کولھے پہ رکے گا۔ بس کوئی اسے پہنے تو یوں پہنے کہ ایک ہاتھ سے ہر وقت نیفہ تھامے رہے نہیں تو پھسل کر نیچے اور بی بی بالکل ویسی کھڑی ہیں جیسا اللہ نے بنایا۔ تو بی بی یہ تو وہی گنوارو مثل ہوئی "دکھیوا بھی دیا اور بعہ بھی گئے"

بزاز۔ ارے بوا، کچھ لیا جائے گا کہ میں یوں ہی بیٹھا رہوں۔

سلمیٰ۔ لو بھئی، اس کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ وہ سمجھتا ہے ہم نے اس کے تھان مار لیے۔ بس اب ہم دیکھتے ہی دیکھتے دیکھتے اسے کھا جائیں گے، پی ڈالیں گے، ہضم کریں گے۔ اے لوج کوئی ان بزازوں جیسا ہو، یہ خود بے ایمان ہیں تو ساری دنیا کو بے ایمان سمجھتے ہیں۔

رحیمن۔ تو بی بی کوئی پسند بھی کیجیے۔

سلمیٰ۔ اے لو تم بھی اسی کی سی کہنے لگیں۔ ارے بوا پسند تو کر ہی رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ اب جو تم چاہو کہ یہ گھوڑے پر ڈالنے والا کمل لے لوں یا یہ دری کا ٹکڑا خرید لوں تو میں یہ نہیں کرنے کی۔ اب چاہے اس میں تم ناخوش ہو یا تمھارا وہ چھیتا خالہ پکارنے والا بزاز۔ میں تو چیزیں لوں گی تو دیکھ بھال ہی کے۔

رحیمن۔ اچھا تو سرکار ذرا اسے دیکھیے یہ تو بڑا بہار دار ہے۔

سلمیٰ۔ ہاں ہے تو اچھا، ذرا اس کے دام تو پوچھو (رحیمن تھان لے کر باہر کی طرف چلتی ہے۔) مگر دیکھو ذرا اس بزاز سے سمجھا کے کہہ دینا کہ خواہ مخواہ دام نہ ہانکے۔ ہم نے ایک سے ایک کپڑا دیکھا ہے، کوئی انیلے نہیں ہیں۔

(رحیمن جلدی سے باہر چلی جاتی ہے) اے لو وہ چل دیں۔ ان ماماؤں کو بھی سودے سلف والوں سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے۔ بس مالک کو چاہے جتنا ٹھگ لو۔ ہمیں روپے میں دونی دے دینا۔ یہ بڑھیا بھی کسی سے کم (رحیمن آتی ہے)، کیا دام بتائے بوا، اس نے؟

رحیمن۔ کہتا ہے پانچ روپے گز سے کم نہ ملے گا۔

سلمیٰ۔ وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ ایک کے دس مانگے گا۔ لے بتاؤ ابھی پارسال ہی تو اس کے دام چودہ آنے تھے، آج یہ خدائی خوار پانچ مانگتا ہے۔ واہ بوا واہ تم نے کہا نہیں کہ جب تو مانگنے ہی پر آیا ہے دس روپیہ گز مانگ۔ اے ہاں جب اس طرح بے تکی اڑاتا ہے تو پھر تھوڑا کیوں بتاؤ۔

رحیمن۔ تو کیا کہہ دوں اس سے بیوی؟

سلمیٰ۔ اے تم اس سے کہو کہ ہم چودہ آنے گز لیتے تھے وہی لیں گے۔ اس کو سو مرتبہ غرض ہو تو گیارہ گز دے دے، نہیں تو جھک مارے، اپنی گٹھری سنبھالے اور دوسرا گھر دیکھے۔ (رحیمن جاتی ہے) اچھا آیا وہاں سے لوٹنے والا۔ پانچ روپے گز لیں گے۔ جیسے ہیرے جواہرات ٹکے ہیں اس کے تھان میں اور ہمارے روپیوں میں کیڑے پڑے ہیں۔

رحیمن۔ سرکار وہ اپنے تھان واپس مانگ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے چودہ آنے میں چودہ برس نہ دوں گا۔

سلمیٰ۔ اخاہ بڑا ایک بات والا آیا ہے بن کے وہ! جیسے کوئی بڑا سیٹھ ہے۔ اے گلی گلی تو مارا مارا پھرتا ہے اور اس پہ یہ دماغ کہ چودہ برس نہ بیچوں گا۔ معلوم ہوتا ہے بزاز نہیں کوئی پوترڈوں کا رئیس ہے......

بزاز۔ ارے بوا لاؤ میرے تھان، بڑی دیر ہو رہی ہے۔

سلمیٰ۔ دے آؤ بھئی دے آؤ، اس لارڈ گورنر کو اس کے تھان۔ اسے دیر ہو رہی ہے۔ کچہری کرنا ہے اسے، اہل کار، چپراسی، مقدمہ والے

سب بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اسے جو پانچ منٹ کی دیر ہو جائے گی تو سیکڑوں کام بگڑ جائیں گے۔ حاکم جو ہے وہ اس دیس کا ہم اس کی رعایا پرجا ہیں۔ ہم اس کے کپڑے دیکھ تھوڑے سکتے ہیں۔ اور نہ ہم اس سے مول بھاؤ کر سکتے ہیں۔

رحیمن۔ تو ہجور آپ بھی تو ایسے دام لگاتی ہیں کہ ....

سلمیٰ۔ اے بی بی، تو مجھ کو کیا معلوم تھا کہ تم سچ مچ کی اس کی خالہ ہو۔ نہیں تو چپ مارے بیٹھی رہتی۔ زبان نہ ہلاتی۔ وہ ایک کے دس مانگتا تو میں کان بھی نہ ہلاتی۔ بس دام تمہارے ہاتھ میں لا کے چھنا چھن گن دیتی۔ تم نے اشارے کنایے میں بتا دیا ہوتا۔ تمہیں تو الٹے اس پر بگڑنے لگیں۔

رحیمن (جھلا کے سارے تھان سمیٹتی ہے) لیے جا رہی ہو نہ سب؟ ذرا اس کو گن دینا اور اچھی طرح دکھا دینا کہ دیکھ لے بابا کہیں سے تیرا ایک انگل بھی کم نہیں ہے، نہ کسی نے کھا لیا، نہ کوئی ہضم کر گیا۔

رحیمن۔ (تھان دے کر پلٹتی ہے) پھٹ پھٹ میں ہلکان کر مارا، نہ لینا نہ دینا کھاک!

سلمیٰ۔ واہ بوا واہ، تم نے بھی اچھی کہی۔ یہ جو اسی بہانے دو گھڑی دل بہل گیا وہ؟

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار موجودہ دور کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے مضامین سات جلدوں میں "مضامین فرحت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مرزا صاحب کے تین مضامین خاص طور پر بہت مشہور ہوئے (۱) شاہی زمانہ میں پھول والوں کی سیر (۲) نذیر احمد کی کہانی خود انھیں کی زبانی (۳) ۱۸۶۲ھ کا یادگار مشاعرہ۔

پنکھے کا جلوس

(یہ اقتباس مرزا صاحب کے مشہور مضمون "پھول والوں کی سیر" سے منتخب کیا گیا ہے۔ پورا مضمون انتہائی دل چسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دلی کی ٹکسالی، شگفتہ اور رواں زبان میں مناظر کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ دہلی کی گزشتہ تہذیب و تمدن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے)

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو، اس سرے سے اس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئی

مزید مطالعہ کے لیے :- دنیائے افسانہ   عبدالقادر سروری

سوالات

۱- سلمیٰ نے ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے کن کو کہا ہے ؟
۲- مگر اس دیس کی ریت نرالی ہے - یہ جملہ کس سلسلہ میں استعمال ہوا ہے ؟
۳- سلمیٰ نے کس بہانے اپنا دل بہلایا ؟

مشقیں

۱- 'تیری آواز مکے اور مدینے' ذوق کے ایک مشہور قطعہ کا یہ آخری مصرعہ ہے - تم اس قطعہ کو اپنے استاد سے سنو -
۲- اس واقعہ کو بزاز کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کرو - لکھنا اس طرح شروع کرو - آج میں برا پھنسا - ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے سے گذرا تو ایک عورت نے آواز دی . . . .
۳- اس سبق میں مستورات کی بول چال کے بہت سے فقرے اور محاورے استعمال ہوئے ہیں - ان کی فہرست مرتب کرو -
۴- ان محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو -
بات نکالنا ، ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہونا ، کلیجے میں ٹھنڈک پڑنا ، کلیجا نکال لینا ، پتھر کھینچ مارنا ، پورے دن ہونا ، کلیجا پکار رکھنا
۵- فعل کے بارے میں تم کئی باتیں جان چکے ہو اب فعل کی ان شکلوں پر غور کرو
پڑھائے ، سونے والے کو دیکھو ، نہ لیجیے ، بیٹھی رہتی ،
پڑھائے — میں حال اور مستقبل دونوں زمانے پائے جاتے ہیں - یہ مضارع ہے
دیکھو — میں دیکھنے کا حکم ہے - یہ امر ہے -
نہ لیجیے — میں لینے کی ممانعت ہے - یہ نہی ہے -
بیٹھی — فعل رہتی کو پورا کرتا ہے - یہ فعل امدادی ہے
فعل کی ان قسموں کی مثالیں سبق سے چھانٹو

فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلی کے رہنے والے تھے، عرصہ سے بسلسلۂ ملازمت حیدرآباد میں قیام تھا۔ وہاں ہائی کورٹ میں رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے۔ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔

مرزا صاحب پُرانے لوگوں کی صحبت میں پلے اور بڑھے مگر تعلیم نئی پائی، اس طرح آپ کی شخصیت کی تعمیر میں مشرقی روایات اور مغربی تہذیب نے پہلو بہ پہلو کام کیا۔ مشرق و مغرب کا یہ حسین امتزاج آپ کی عام تحریروں میں نمایاں ہے۔ وہ دلی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔ روزمرہ اور ہر طبقہ کے محاوروں پر عبور تھا۔ قدیم رسم و رواج، وضع قطع اور تہذیب معاشرت کا ذکر بڑے لطف سے کرتے تھے۔ اندازِ بیان بے حد شگفتہ اور رواں ہوتا تھا۔

آپ کی تحریر میں اکثر جگہ مولوی نذیر احمد کا رنگ جھلکتا ہے۔ اپنے اُستاد مرحوم کی طرح خاص خاص فقرے اور ٹکسالی محاورے خوب استعمال کرتے ہیں مگر موقع و محل کا خیال ضرور رکھتے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں فقروں اور محاوروں کا مبتذل استعمال کہیں نہیں ملتا۔

مرزا صاحب کا شمار اردو کے مزاحیہ نگاروں کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ آپ کی تمام تحریروں میں ایک لطیف شوخی اور ظرافت ہوتی ہے مگر اکثر ان میں طنز نہیں ہوتا۔ ظرافت کے ساتھ طنزیہ نگاری رشید صاحب کے حصہ میں آئی ہے۔ مرزا صاحب کے مضامین اعلیٰ درجہ کی مزاح نگاری کے دل چسپ نمونے ہیں۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ اور نذیر احمد کا حلیہ وغیرہ آپ کے شاہکار مضامین میں سے ہیں۔ "مضامین فرحت" آپ

کر رہے ہو۔ اس کا حال اپنے الفاظ میں بیان کرو۔

۲۔ ان مرکبات کی تشریح کرو اور ان کی قسمیں بتاؤ۔

کرۂ ارض، گرویدۂ احسان، راہ راست، حیرت انگیز تجربہ، حج اکبر، کشش قمر، قلب و نبض، مسامات، انسانی، عجیب و دل کش، سخت چیز۔

۳۔ فعل کی قسموں سے تم واقف ہو۔ اب سبق میں آئے ہوئے فعل کی ان شکلوں پر غور کرو۔

جگا دیا، یاد آیا، دیا ہے، گیا ہے، چل رہی تھی، نظر آنے تھے، کرتا جاتا تھا، جاری رہتا، پیدا کرتا وغیرہ یہ سب ماضی کی قسمیں ہیں۔

ماضی مطلق، جس میں زمانے کے دور و نزدیک کی قید نہ ہو جیسے جگا دیا، یاد آیا۔

ماضی قریب، جس میں زمانہ قریب میں ہو جیسے دیا ہے، گیا ہے۔

ماضی بعید، جس میں دور کا زمانہ پایا جائے جیسے رہی تھی، گیا تھا۔

ماضی ناتمام، جس میں کام جاری رہے، تمام نہ ہو۔ جیسے آنے تھے، کرتا جاتا تھا۔

ماضی تمنائی، جس میں تمنا یا آرزو پائی جائے جیسے جاری رہتا، پیدا کرتا۔ تمنائی کو شرطی بھی کہتے ہیں۔

ماضی شکیہ، جس میں فعل واقع ہونے میں شک پایا جائے جیسے آیا ہو گا، گیا ہو گا۔

سب بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اسے جو پانچ منٹ کی دیر ہو جائے گی تو سیکڑوں کام بگڑ جائیں گے۔ حاکم جو ہے وہ اس دیس کا ہم اس کی رعایا پرجا ہیں۔ ہم اس کے کپڑے دیکھ تھوڑے سکتے ہیں۔ اور نہ ہم اس سے مول بھاؤ کر سکتے ہیں۔

رحیمن۔ تو حضور آپ بھی تو ایسے دام لگاتی ہیں کہ ....

سلمیٰ۔ اے بی بی، تو مجھ کو کیا معلوم تھا کہ تم سچ مچ کی اس کی خالہ ہو۔ نہیں تو چپ مارے بیٹھی رہتی۔ زبان نہ ہلاتی۔ وہ ایک کے دس مانگتا تو میں کان بھی نہ ہلاتی۔ بس دام تمھارے ہاتھ میں لا کے چھناچھن گن دیتی۔ تم نے اشارے کنایے میں بتا دیا ہوتا۔ تم تو الٹے اس پر بگڑنے لگیں۔ (رحیمن جھلا کے سارے تھان سمیٹتی ہے) لیے جا رہی ہو نہ سب؟ ذرا اس کو گنا دینا اور اچھی طرح دکھا دینا کہ دیکھ رے بابا کہیں سے تیرا ایک انگل بھی کم نہیں ہے، نہ کسی نے کھا لیا، نہ کوئی ہضم کر گیا۔

رحیمن۔ (تھان دے کر پلٹتی ہے) مفت میں ہلکان کر مارا، نہ لینا نہ دینا کھاک!

سلمیٰ۔ واہ بوا واہ، تم نے بھی اچھی کہی۔ یہ جو اسی بہانے دو گھڑی دل بہل گیا وہ؟

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار موجودہ دور کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے مضامین سات جلدوں میں "مضامین فرحت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مرزا صاحب کے تین مضامین خاص طور پر بہت مشہور ہوئے (۱) شاہی زمانہ میں پھول والوں کی سیر (۲) نذیر احمد کی کہانی خود انھیں کی زبانی (۳) ۱۲۶۱ھ کا یادگار مشاعرہ۔

پنکھے کا جلوس

(یہ اقتباس مرزا صاحب کے مشہور مضمون "پھول والوں کی سیر" سے منتخب کیا گیا ہے۔ پورا مضمون انتہائی دل چسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دلی کی ٹکسالی، شگفتہ اور رواں زبان میں مناظر کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ دہلی کی گزشتہ تہذیب و تمدن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے)

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو، اس سرے سے اس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئی

تھیں۔ میوے، مٹھائیاں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں، کچوریاں، بیوڑیاں، سہال اور اندرسے تلے جا رہے تھے تو دوسری طرف کبابوں، پراٹھوں، بریانی، مزعفر اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار پڑا مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لیا، کھایا، پتے وہیں پھینک، آگے بڑھے۔ پان لیے، خود کھائے، دوسروں کو کھلائے، پیک تھوکی، پھول والوں کی دکانوں سے گجرے لیے، گلے میں ڈالے۔ ساقی کے پاس ٹھیر، دو دم حقّے کے مارے، ایک دو پیسے دیے، آگے قدم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے۔ حقہ کیا ہے ایک تماشا ہے۔ کوئی گز بھر اونچا نیچا، اس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمبا کو آئے۔ نَے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نَے کو سنبھالنے کے لیے کئی کئی گھوڑیاں دے رکھی ہیں۔ نے پر خس چڑھا ہے۔ اور موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں۔ گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں۔ خود بھی سفید کپڑے پہنے، سبز بنارسی سیلا باندھے، لال پٹکا لپیٹے، کھڑے حقہ پلا رہے ہیں۔ کوٹھے والوں کو پلانا ہوا تو نَے سیدھی کر دی انھوں نے بھی دو کش کھینچ لیے۔

شام ہوتے بازار اتنا بھرا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جائے۔ مغرب کی نماز کے بعد جھرنے سے نفیری کی آواز آئی، لیجیے! پنکھا اٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنے کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں، کچھ واپس آ رہے ہیں۔ ریلے پر ریلا پڑ رہا ہے۔ جو ذرا

دم خم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینے اور پشت پر سہ رہے ہیں۔ جو کم زور ہیں وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ ارے بھئی جانے بھی دو۔ کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چل کر پنکھا دیکھ لیں گے۔
پنکھا جھرنے سے اٹھا۔ شمسی تالاب سے ہوتا ہوا، مہرولی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں، لالٹینیں، گلاس، ہانڈیاں، فانوس اور دیوار گیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گذرنا شروع ہوا۔ آگے ڈھول تاشے والے، روپہلی ٹھپّا ٹکے ہوئے سبز کرتے، لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں، کسی کے گلے میں ڈھول، کسی کے گلے میں تاشا۔ ہاتھوں میں چوبیں، دھوں دھوں کرتا اس طرح گزرا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے، زربفت کے پھریرے، مُقیّش کے پھندنے، کلابتوں کی ڈوریاں، جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لال ٹینیں۔ ایک لال ٹین کے سرے پہ سنہرا ہلال، دوسرے پر روپہلی چکر، ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا۔ اردلی میں پولیس والوں کا پہرا۔ ان کے پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے خاصی بارہ دری ہے۔ تختوں کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر، اوپر کھپچیوں کا نصف گنبد بنا، کپڑا منڈھ، پنی لگا، کاغذوں کے پھولوں سے سجا، دروں میں گیندئی پردے ڈال، ڈوریوں سے کس دیے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں نے اٹھایا اور یہ خاصا مکان کا

مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانے کے پیچھے دلی کے اکھاڑے۔ ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک استاد، بیس بیس پچیس پچیس شاگرد، بنے ہوئے تیار جسم، چوڑے چوڑے سینے بھرے بھرے ڈنڈ، پھری ہوئی مچھلیاں، پتلی پتلی کمریں، جسم پر چست جانگیے، گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ، کوئی بنیٹی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے، کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے۔ کہیں پھری گتکے سے مقابلہ ہو رہا ہے، کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلی کے سقے، سفید براق کپڑے پہنے، لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے، سبز سیلے سروں پر باندھے، ہاتھوں میں منجھے منجھائے پیتل کے کٹورے لیے، نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آرہے تھے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے، پندرہ بیس کا حلقہ، بیچ میں طبلہ سارنگی والے۔ تال سر پہ ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ، عجیب مزا دے رہی تھی۔ ان کے پیچھے تخت رواں۔ ان کے بعد انگریزی باجا اور ترک سواروں کا رسالہ، سرخ بانات کی وردیاں، ان میں سفید بانات کے کف اور کالر، شانوں پر فولادی جال، پاؤں میں کالی برجسیں، لک کے چمڑے کے اونچے بوٹ، سر پہ سرخ منڈاسے، ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لیے، گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے، آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی

اور سیلانیوں کا اژدحام ۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے، کارچوبی ٹوپیاں داخل ٹکے ہوئے، نیچے چولی کے انگرکھے، ایک بر کے پیجامے، سلیم شاہی جوتیاں ۔ ان کے بعد پچھیر[1] اپلٹن کی چار قطاریں ۔ کم عمر گورے گورے لڑکے، سر پر دھانی منڈاسے، منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں، سبز اطلس کے کوٹ، سفید اطلس کی کسی ہوئی برجسیں، سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے، ہاتھوں میں سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے نیزے، بڑی آن بان سے قدم ملائے چل رہے ہیں ۔ ان کے پیچھے دلی کے شرفا اور عمائد کا ہجوم، نیچی نیچی قبائیں اور چغے ۔ ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گیندی پگڑیاں، مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور چوگوشہ ٹوپیاں، ہاتھوں میں رنگ رنگ کی جریبیں، ہشاش بشاش چہرے، گلے میں پھولوں کے کنٹھے، ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں موسم کا لطف اٹھاتے، میلے کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں ۔ ان کے بعد شاہی شہنائی نوازوں کا گروہ نفیری کے کمال دکھاتا، موسم کی چیزیں بجاتا، خود بھی اپنے کمال کے مزے اٹھاتا، پنکھے کے ساتھ ہے ۔ سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول ۔

---

[1] شرفائے دہلی کے لڑکوں، کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی ۔ تھے تو لڑکے مگر غدر میں باوٹے کے نیچے سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے ۔

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا، پنّی چڑھا، آئینے لگا، پھولوں سے سجا ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوشِ محبت اور یگانگت کا نشان تھا جس نے چھوٹے بڑوں، ہندو مسلمانوں، غربا، امرا غرض ہر قوم، ہر ملت اور ہر طبقے کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعے سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا اُن کے پروانے۔

غرض خلقت کا یہ ہجوم، پھولوں میں بھیگتا، خس کے پنکھے جھلتا آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گذرا۔ باجے والے اور نفیری والے ہر کمرے کے سامنے ٹھہرتے، ایک آدھ چیز سناتے، انعام لیتے اور آگے بڑھتے ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری میں برآمد ہوئے۔ بیگمات کے لیے چلمنیں پڑ گئیں۔ اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر بابِ ظفر کے سامنے آگئی پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا۔ یہاں باجے والوں نے اپنے کمال دکھائے۔ اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ سقوں نے کٹورے بجائے۔ ڈنڈے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ سب کو حسبِ مراتب انعام ملا۔ کسی کو دوشالہ ملا، کسی کو مندیل، کسی کو کڑے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آگیا۔ شہر کے شرفا اور امرا مجرا بجا لائے۔ اوپر

سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑا چھڑکا گیا۔ عطر اور پان سے تواضع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولی عہد بہادر نیچے اتر گئے۔ لوگوں کے گلوں میں پھولوں کے کنٹھے ڈال کر سب کو رخصت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہو گئے۔ کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ پنکھا جوگ مایاجی پہنچ گیا۔

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے۔ بڑی لمبی چار دیواری ہے۔ کونوں پر برجیاں ہیں۔ احاطے کے اندر بیس بائیس عمارتیں اور بیچ میں دیوی کا استھان ہے۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ باب ظفر کے سامنے آکر ٹھہرا۔ بعض مصاحبوں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح لے چلیں مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ کہاں "نہ اماں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب میں جوگ مایاجی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا۔ تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ تمھارے ہندو بھائی کیا خیال کریں گے کہ مسلمان تھا، مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہو گیا۔ ہم کو غیر سمجھا۔ اس لیے جھروکوں سے نیچے بھی نہیں آئے۔ نا اماں، نا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے اب بھی جائیں گے۔ آتش بازی میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہیں وہاں ہم بھی چلیں گے۔"

اور اس کے چند نمایاں پہلو ایسے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے جو سننے والے کے ذہن کو ان تمام تفصیلوں تک پہنچا دیتے ہیں جنھیں شاعر نے چھوڑ دیا تھا۔ مگر ہر ذہن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ صرف انہی لوگوں کا حصہ ہے جو دنیا کا مزاج پہچانتے ہیں، جو فطرت انسانی کے ماہر ہیں، جو شاعرانہ انداز بیان کو سمجھتے ہیں، جنھوں نے بڑے بڑے شاعروں کے کلام کا ایک مدت تک غور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور جن کے دل میں درد ہے۔ مرزا غالبؔ فرماتے ہیں ؎

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ سے ملیے

(یہ نیا اقتباس مرزا صاحب کے مشہور مضمون "۱۲۸۶ھ کا ایک یادگار مشاعرہ" سے منتخب کیا گیا ہے یہ ایک خیالی مضمون ہے اور بہ قول مرزا صاحب مولانا محمد حسین آزاد کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ اس فرضی مشاعرے کا حال مرزا صاحب نے کریم الدین بانیِ مشاعرہ کی زبانی اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا ہے۔ اس اقتباس میں نہ صرف اردو کے تین مایۂ ناز اساتذہ کا مختصر تعارف دل چسپ انداز میں ملے گا، بلکہ ان معاصرانہ چشمکوں کا حال بھی معلوم ہو گا جن کی وجہ سے اس وقت مشاعروں میں گرمی رہا کرتی تھی۔

کریم الدین صاحب حضرت ظل سبحانی بہادر شاہ ظفرؔ سے مشاعرہ کرنے کی اجازت حاصل کر چکنے کے بعد اساتذہ کے پاس مشاعرے میں شرکت کی منظوری لینے کے لیے جاتے ہیں آگے کا حال اس مضمون میں پڑھیے)

(۱)

استاد ذوقؔ

کابلی دروازے کے پاس ہی ان کا مکان ہے۔ بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا

کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اس کے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ان کے چاہتے شاگرد حافظ غلام رسول ویرآن بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں اور انھی سے ہوشیار رہنے کے لیے حضرت جہاں نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں۔ رنگ اچھا سانولا ہے، چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے، اس وقت سفید تنگ پائجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے، سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی تھی۔ میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویرآن نے چونک کر کہا "کون ہے؟" میں نے کہا، کریم الدین، استاد ذوقؔ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ استاد نے اپنا نام سن کر کہا "آئیے آئیے، اندر تشریف لائیے۔" میں نے آداب کیا، انھوں نے فرمایا "بیٹھو، بھئی بیٹھو" میں حافظ ویرآن کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمائیے کیسے تشریف لانا ہوا۔" میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے، ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے اگر حضور بھی از راہ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔ میرا اتنا کہنا کہ حافظ ویرآن تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے، "جائیے جائیے، کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ استاد کو فرصت

نہیں ہے۔ ان مرزا ے پالک[1] کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آ کر دق کرتے ہو"۔ استاد نے کہا بھئی ویراؔن۔ تمھاری زبان نہیں رکتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو۔ حافظ ویراؔن کہنے لگے "استاد جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ آپکے ناوڑا کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے، ان کی سات پشت کو تو م ڈالا" استاد ہنس کر فرمانے لگے "نا بھئی نا۔ تم میری وجہ سے کیوں بلائیں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو بھی جی چاہے کہے، میں نے تو ان سب کا جواب ایک رباعی میں دے دیا ہے۔

ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
کیوں برا کہنے سے اس کے تو برا مانتا ہے

نو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ
اور جو خود ہی برا تو ہے تو وہ سچ کہتا ہے

میں نے عرض کی کہ میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا۔ حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوقؔ سے بھی کہہ دیں گے، وہ بھی مشاعرے میں

---

[1] ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالبؔ) مرزا عبد اللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ انھوں نے ان کو پال لیا ہے اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں حافظ ویراؔن نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے حسب و نسب میں انھوں نے کیڑے ڈالے۔ استاد ذوقؔ کو شہر بھر نائی کہتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ آزادؔ مرحوم نے ان کے ہاتھ میں استرے کے بجائے تلوار دے کر ان کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

ضرور آئیں گے۔ یہ سن کر حافظ ویراں تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ استاد نے فرمایا۔ ہاں بھئی مجھے یاد آگیا۔ کل شام حضرت پیرو مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔" مگر یہ تو بتاؤ ،،طرح،، کیا رکھی ہے" میں نے عرض کیا اور کہا کہ "حضرت ظل سبحانی نے ،،طرح،، کا جھگڑا ہی نکال دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے آکر غزل پڑھے۔" استاد تو" بہت خوب بہت خوب،، کہتے رہے مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے، برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ اللہ خیر کرے۔ دیکھیے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت پیرو مرشد بھی بیٹھے بیٹھے اشغلے[1] چھوڑا کرتے ہیں، وہ کہے گئے، میں تو اٹھ سلام کر چلا آیا۔

(۲)

مرزا غالبؔ

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالبؔ پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے قاسم جان کی گلی گئی ہے، بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے، اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ، محل سرا کا ایک راستہ مردانہ مکان میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دہنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گذر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

---

[1] معلوم نہیں کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے مگر دہلی میں عام طور پر ،،شگوفے،، کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی، حسین اور خوش رو آدمی۔ قد اونچا، ہاڑ بہت چوڑ چکلا، موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے۔ لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے، داڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے۔ ایک بر کا سفید پائجامہ، سفید ململ کا انگرکھا، اس پر ہلکے زرد زمین کا جامہ دار چغہ۔ میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا۔ سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آ گئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں افشاںؔ اور فارسی میں نیّرؔ تخلص کرتے ہیں۔ کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشا پردازی، جغرافیہ، تاریخ علم انساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، خلاقی آنکھیں، چگی داڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوب صورت آدمی ہیں۔ ایک بر کا سفید پائجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے۔ قالب چڑھی ہوئی، چوگوشیہ ٹوپی سر پہ تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دو زانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالبؔ بھی لکھنے سے فارغ ہوئے پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے، میاں نیّرؔ تم کس وقت آ بیٹھے! بھئی اس مرزا تفتہؔ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر لحظہ آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔ میری طرف دیکھ کر کہا۔ آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب

ہیں۔ میں نے کہا، "جی ہاں۔ فرمانے لگے۔ "حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا، کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے آپ کے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیرؔ تم بھی چلو گے"۔ نواب صاحب نے کہا جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ میں بھی ضرور ہم راہ ہوں گا۔ مرزا صاحب نے پوچھا۔ "مگر بھئی، اب تک علائی نہیں آئے مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو، آ ہی گئے بھئی بڑی عمر ہے، ابھی میں تم کو ہی پوچھ رہا تھا۔

(۳)

مومن خاں مومنؔ

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے۔ راستے میں مولوی امام بخش صاحب صہبائیؔ مل گئے۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ ہے۔ منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹے ہیں۔ بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں، کوئی چالیس سال کی عمر ہو گی۔ ایک بر کا سفید پائجامہ سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ پہنتے اور سر پر چھوٹا صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے "کہاں جاتے ہو"؟ میں نے کہا، حکیم مومن خاں مومنؔ کے پاس۔ پوچھا، کیا کام ہے، میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں"۔ حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف صحن چیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا

صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر[1] بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مودب دو زانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی۔ کشیدہ قامت تھے، سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھوئیں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی ڈاڑھی، بھرے بھرے بازو پتلی پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پہ گھونگھر والے لمبے لمبے بال، زلفیں بنا کر پشت اور شانوں پر بکھیرے ہیں۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پائجامہ، مہریوں پر سے تنگ اور اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک بر کا پائجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔

---

[1] میں نے خود یہ مکان ۲۲، ۲۰ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی سامنے کا حصہ قائم تھا، معلوم نہیں کہ اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی، اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے، ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا، خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی۔
"دست و بازو بشکست"۔

چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئیں کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹا کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کناروں پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھکر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے، غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔

حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا سلام لے کر کہا، بیٹھیے، بیٹھیے، ہم بیٹھ گئے، حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "ارے بھئی صہبائی تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ مولوی صاحب کون ہیں؟" مولوی صہبائی نے کہا یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا "بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجیے۔ اب دہلی کے شاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ[1] اپنی امت کو لے کر چڑھ آتے ہیں۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں واہ واہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ۔

صائب دو چیز می سکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں، وہ ہد ہد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں پہ حملہ کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں، اپنے نا اہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اس روز جب اس جانور نے یہ پڑھ کر کہ

مرکز محور گردوں بہ لب آب نہیں ناخن قوس قزح شبہۂ مضراب نہیں

---

[1] یہ استاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناخوش گوار گذرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا ان کے استاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب تو ان کی بات تو دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ اس مشاعرے میں استاد ذوقؔ اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئے گی۔ فرمایا "ہر شخص مختار ہے، چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے میں تو نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا۔ ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے۔" میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا کہ مجھے تو اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے۔ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارفؔ کا ہے جو بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اب ان کو زندگی کی امید نہیں رہی۔ ان کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے۔ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ "افسوس ہے، کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا" میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھا بھئی تم جاؤ۔ میری طرف سے عارفؔ سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا

تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا کہ نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہم راہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔ حکیم صاحب کہنے لگے ''میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ۔ تو واپس جاتے جاتے راستے میں ان سے بھی کہتے جاؤ۔ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے۔ مشاعرہ کہاں ہوگا اور ''طرح'' کیا ہے۔ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتا دیا۔ ''طرح'' کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوتی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے'' ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں۔ جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں ''طرح'' نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی، بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو شعر کہنے میں جی نہیں لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

عروس البلاد

(یہ اقتباس قاضی عبدالغفار صاحب کی کتاب "نقش فرنگ" سے منتخب کیا گیا ہے جس کا ذکر تبصرے میں آچکا ہے۔ زبان کی سلاست اور شگفتگی اور انداز بیان کے حسن نے سفر کے حالات کو کتنا دل کش بنا دیا ہے)

انگلستان آتے ہوئے ہم نے انگلش چینل میں موسم اچھا پایا تھا حالاں کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ساحل فرانس سے ساحل انگلستان تک آنے میں سمندر کے تلاطم سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ گو یہ سفر ایک دو گھنٹے سے زیادہ کا نہیں لیکن اسٹیمر چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں سمندر ہمیشہ کم و بیش متلاطم رہتا ہے۔ اسٹیمر بہت زیادہ جھکولے کھاتا ہے اور مسافروں کی طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے۔ گو میں کسی سمندر کے سفر میں جہاز کی حرکت اور پانی کے تلاطم سے بدمزہ نہیں ہوتا، نہ کبھی متلی ہوتی ہے، نہ قے آتی ہے مگر واپسی کے وقت انگلستان کے ساحل سے فرانس کے ساحل تک پہنچنا دو بھر ہو گیا۔ سمندر کی موجیں اسٹیمر کے بالائی عرشہ تک آتی تھیں اور اسٹیمر کا یہ حال تھا کہ بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا۔ رکابیاں میز پر ٹھہرنے سے قطعاً انکار کرتی تھیں اور میں نے تو سمندر کا ایک ایسا طمانچہ کھایا کہ عمر بھر یاد رہے گا۔

ہم اپنے چھوٹے [illegible] کمبل وغیرہ اوپر عرشہ پر چھوڑ آئے تھے۔ میں کھانا کھا [illegible] خیال سے اوپر گیا کہ اپنا [illegible] اور ذرا

مزید مطالعہ کے لیے :- دلی کا یادگار مشاعرہ   از فرحت اللہ بیگ

سوالات

۱- اکھاڑے کا کیا نقشہ مضمون نگار نے کھینچا ہے؟
۲- بادشاہ نے پنکھے کے جلوس میں شامل ہونا کیوں منظور نہیں کیا؟
۳- مرزا اور ذوق کے متعلق دلی والوں نے کیا بات اڑا رکھی تھی؟
۴- مومن نے مشاعرہ میں شرکت نہ کرنے کا کیا عذر پیش کیا؟

مشقیں

۱- پہلے مضمون میں جلوس کی تفصیلات پر غور کرو اور کسی دیکھے ہوئے جلوس کی تفصیلات بیان کرو۔

۲- ذوق، غالب اور مومن کا کیا حلیہ مضمون نگار نے بیان کیا ہے۔ اس کو غور سے پڑھو اور اسی انداز سے اپنے کسی دوست کا حلیہ بیان کرو۔

۳- ان مضامین سے ان مخصوص فقروں اور محاوروں کو چھانٹو جو دلی کی ٹکسالی زبان کا جز ہیں۔

۴- عربی الفاظ کی جمع میں جب واحد کا وزن سالم رہتا ہے تو اُسے جمع سالم کہتے ہیں۔ جاندار کی جمع میں ، ون یا ین لگاتے ہیں جیسے مظلومون ، مقتولون ، مظلومین ، مقتولین بے جان کی جمع میں ، ات لگاتے ہیں۔ جیسے مکانات ، حالات ، خیالات ۔ اپنے سبق سے ایسے الفاظ چھانٹو ان کے واحد و جمع پر غور کرو

قاضی عبدالغفار

اعلیٰ درجے کے صحیفہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بلند مرتبہ ادیب تھے۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ آپ کی صحافی تربیت مولانا محمد علی کے زیر نگرانی ہوئی۔ کلکتہ سے جمہور دہلی سے صباح اور حیدر آباد سے پیام اخبار نکلتے رہے۔ موخر الذکر اخبار نے اردو صحافت کو ایک نیا رنگ دیا اور اس میں ادبی شان پیدا کی۔

ملک کی تقسیم کے بعد انجمن ترقی اردو ہند پر بڑی تباہی آئی اور اس کا کاروبار بالکل معطل ہوگیا۔ اس وقت قاضی صاحب نے بڑی دانش مندی اور جرأت سے اس کی باگ ڈور سنبھالی۔ انجمن کا دفتر حیدر آباد سے علی گڑھ منتقل ہوا اور قاضی صاحب نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام شروع کیا اور انجمن کے جسد بے روح میں نئی روح پھونکی۔ انجمن کی موجودہ سرگرمیاں قاضی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی چند سال ہوئے علی گڑھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

صحیفہ نگاری ادب لطیف اور علمی مقالہ نگاری میں قاضی صاحب بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ وہ تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا مطالعہ کر کے اپنے خیالات کو ادبی صناعی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے طرز بیان میں بلا کی دل کشی اور رنگینی ہوتی ہے جو ان کی منفرد شخصیت کا اظہار ہے۔ ان کی مشہور تصانیف 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' موجودہ سماجی زندگی پر بھرپور ادبی طنز ہیں ان کی تصانیف 'آثار جمال الدین' اور 'آثار ابوالکلام آزاد' سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

نقش فرنگ میں آپ نے سفر یورپ کے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ زبان کی شگفتگی اور انداز بیان کی رنگینی نے اس میں ادبی حسن پیدا کر دیا ہے

جدید اردو ادب میں قاضی عبدالغفار کا مقام بلند اور منفرد ہے۔

تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا کہ نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدر الدین صاحب اور نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہم راہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔ حکیم صاحب کہنے لگے "میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ۔ تو واپس جاتے جاتے راستے میں ان سے بھی کہتے جاؤ۔ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے۔ مشاعرہ کہاں ہوگا اور "طرح" کیا ہے۔ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتا دیا۔ "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوتی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے" ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں۔ جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی، بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو شعر کہنے میں جی نہیں لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہوگئے اور میں سلام کرکے رخصت ہوا۔

عروس البلاد

(یہ اقتباس قاضی عبدالغفار صاحب کی کتاب ''نقش فرنگ'' سے منتخب کیا گیا ہے جس کا ذکر تبصرے میں آچکا ہے۔ زبان کی سلاست اور شگفتگی اور انداز بیان کے حسن نے سفر کے حالات کو کتنا دل کش بنا دیا ہے)

انگلستان آتے ہوئے ہم نے انگلش چینل میں موسم اچھا پایا تھا حالانکہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ساحل فرانس سے ساحل انگلستان تک آنے میں سمندر کے تلاطم سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ گو یہ سفر ایک دو گھنٹے سے زیادہ کا نہیں لیکن اسٹیمر چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں سمندر ہمیشہ کم وبیش متلاطم رہتا ہے۔ اسٹیمر بہت زیادہ جھکولے کھاتا ہے اور مسافروں کی طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے۔ گو میں کسی سمندر کے سفر میں جہاز کی حرکت اور پانی کے تلاطم سے بدمزہ نہیں ہوتا، نہ کبھی متلی ہوتی ہے، نہ قے آتی ہے مگر واپسی کے وقت انگلستان کے ساحل سے فرانس کے ساحل تک پہنچنا دوبھر ہو گیا۔ سمندر کی موجیں اسٹیمر کے بالائی عرشہ تک آتی تھیں اور اسٹیمر کا یہ حال تھا کہ بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا۔ رکابیاں میز پر ٹھہرنے سے قطعاً انکار کرتی تھیں اور میں نے تو سمندر کا ایک ایسا طمانچہ کھایا کہ عمر بھر یاد رہے گا۔

ہم اپنے چھوٹے بیگ اور کمبل وغیرہ اوپر عرشہ پر چھوڑ آئے تھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد اس خیال سے اوپر گیا کہ اپنا چھوٹا بیگ اٹھا لاؤں اور ذرا

سمندر کے تلاطم کا لطف بھی دیکھوں۔ مگر عرشہ پر پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ ایک موج زور سے آکر ٹکرائی، میں وہیں گر گیا اور اگر دو چار قدم اور آگے بڑھا ہوتا تو تعجب نہ تھا کہ وہ موج مجھے کھینچ کر سمندر میں لے جاتی۔ اس صورت میں دنیا کی آبادی تو کچھ کم نہ ہوتی مگر یہ اوراق شروع سے آخر تک سادہ رہ جاتے۔ بہر حال ملازمین نے سنبھالا، سارے کپڑے شرابور ہو گئے اور اس چڑیا کی طرح جس کو کنوئیں سے نکالا گیا ہو ہم آتش دان کے پاس سوکھنے لگے!

ولے بخیر گذشت۔

شام کو ۷ بجے پیرس کے اسٹیشن پر پہنچے، جہاں اپنے دوست موسیو والدام کو موجود پایا، سیدھے ہوٹل گئے اور ترک احباب کو اپنے وہاں پہنچنے کی اطلاعیں دیں۔ ہم نے اپنے پروگرام میں ایک ہفتہ پیرس کے لیے رکھا تھا یہ ہفتہ اس طرح گذرا کہ گذرتا ہوا معلوم بھی نہ ہوا۔ لندن کے بعد یہ ۳۰ لاکھ کی آبادی اور اس کی نسبت سے شہر کی عمارتوں اور بازاروں کی چہل پہل ہمارے لیے کوئی بڑی عجیب بات نہ تھی۔ تاہم برطانوی دارالسلطنت کی تاریکی اور سردی سے نکل کر پیرس کی آب وہوا بے حد خوش گوار معلوم ہوئی۔ یا لندن کی سر بفلک عمارتیں ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی شاہ راہ پر چلنے والوں کو چاروں طرف سے گھیر کر کچل دیں گی یا پیرس کے خوب صورت بازار اور محلے ہیں کہ وہ اتنے کشادہ بھی نہ ہوں، مگر صاف اور ستھرے ہیں۔ اس "جنت نگاہ" میں برطانوی اور فرانسیسی قوموں کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ نہ صرف عمارتیں اور شہر کی دل چسپیاں بلکہ فرانسیسی اخلاق بھی ایک بالکل دوسری چیز ہے مجھے تو یہ محسوس ہوا کہ اگر یورپ میں کوئی قوم ہے جو بہ لحاظ فطری مذاق کے ایشیا سے کچھ ربط رکھ سکتی ہے تو وہ فرانسیسی قوم ہے۔ تصنع نہیں ہے،

معائب اور محاسن دونوں صاف نظر آتے ہیں۔ عیبوں پر اس غرض سے ملمع نہیں کیا جاتا کہ وہ ہنر معلوم ہوں۔ سچائی اور خوش اخلاقی بے لاگ ہے۔ اسی طرح گناہ بھی عریاں ہے۔ ہر عیب و صواب سب بے پردہ ہے۔ برا کہیے یا اچھا، شاید یورپ کی تمام دوسری اقوام اس خصوصیت سے محروم ہیں۔

شام کو بلوآر د پر چہل قدمی کیجئے یا توئیریز کا نظارہ دیکھیے یا شب کو کسی اوپرا میں یا فائز میں جائیے، وہی بے تکلفی اور رسم و راہ کی آزادی نظر آئے گی جو معصیت سے تو پاک نہیں مگر مکر سے پاک ہے۔ مومارٹ میں تھوڑا وقت گذاریے تو انسانیت کے عجیب عجیب نمونے نظر آئیں گے۔ یہ مقام رسم و رواج کی آزادیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ایک ایشیا نژاد جب سورج کی روشنی میں مردوں اور عورتوں کی بے تکلفیوں کو سر راہ دیکھتا ہے، تو ایک سرسری نظر کے بعد اس کا دل اس سے پوچھتا ہے کہ اگر بد اخلاقیاں اور عیش پرستیاں قوموں کی تباہی کا بڑا سبب ہوتی ہیں تو پھر یورپ کیوں زندہ ہے۔ پیرس میں دو ہی قسم کے لوگ زندہ رہ سکتے ہیں۔ یا تو وہ جوان چیزوں کے عیب و صواب پر غور کرنے کی حدود سے آگے نکل گئے ہو یا وہ جو فلسفیانہ نظر سے ان تماشوں کو دیکھ کر سکیں۔ تھیٹروں اور ناچ گھروں میں جانے کی زحمت کیوں گوارا کیجئے۔ شب کو سر راہ رقص کی محفلیں جمی ہوتی ہیں۔ ایک دو نہیں سارے شہر میں سیکڑوں۔ ان میں رقاصہ کا ہلکا ریشم کا لباس اس کے جسم صندلین سے بغاوت کرتا ہے اور پھر گویا ملک کا کوئی قانون نہیں جو حوا کی ان بیٹیوں پر عائد ہو سکے۔ لباس کا ہر تکمہ سوئی کے ٹانکوں سے جھگڑا کرتا ہے۔ موزوں کی باریکی اور جسم کی رنگت میں تمیز کرنا ممکن نہیں۔ لباس کی تیاری میں اگر کفایت شعاری یوں ہی بڑھتی رہی تو عجب نہیں کہ یورپ کی

صنف نازک پھر ایک دفعہ فطرت کے اس لباس سے آراستہ نظر آئے جس کا نہیں سیدھا الٹا۔"

آج تک ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ترکوں کی بداخلاقی کو ان کی تباہی کا باعث بناتے ہیں۔ شاید سچ ہو۔ مگر کسی فرانسیسی کے سامنے ایسا نہ کہئے گا۔ مفلس ہندوستانیوں کے طبائع کیوں کر ان گرم بازاریوں سے مانوس ہو سکیں۔ میرا تو یہ حال تھا کہ تخیل دو چیزوں میں الجھا ہوا تھا۔ دن میں شہر کے اکثر مقامات دیکھتا تھا، جہاں گذشتہ جنگ کے خوف ناک نقش و نگار ابھی تک موجود ہیں۔ گولوں کے گرنے کے نشان، ٹوٹی ہوئی عمارتیں، گری ہوئی دیواریں۔ میرا رہ نما ہر چیز کو ٹھہر ٹھہر کر دکھاتا تھا۔ یہ کب ہوا، کیسے ہوا۔ جب جرمنوں کا گولہ گرا تو اس محلہ کا کیا حال تھا؟ کتنے آدمی مارے گئے تھے۔ کتنے زخمی ہوئے تھے۔ غرض ساری تفصیل بتاتا تھا۔ مگر شام کو بازاروں میں اور لب سڑک رقص و سرود کے ہنگامے کچھ ایسے ہوتے تھے۔ کہ گویا اس شہر میں کبھی کوئی مصیبت ہی نہ آئی تھی۔ ہر شخص کا ایک قدم (کم از کم) بالکل بہشت کی چوکھٹ پر اور دوسرا قدم دنیا میں! یہ عالم میرے لیے ایک معمّا تھا! انسان کس قدر جلد مصیبتوں کو بھولتا ہے۔ اور ہمارے ایشیا میں جس چیز کو عبرت کہتے ہیں، وہ کیا ہے۔ کچھ ہے یا محض ڈھکوسلا ہے! اس ہنگامۂ عیش میں سارا پیرس اور فرانس کی شہری آبادی غرق ہے!

گو کہ فرانسیسی قوم کا شمار جنگ جو اقوام میں نہیں ہے، تاہم قومی شجاعت کے نشانات ہم کو ہر جگہ نظر آئے۔ نپولین کا نام تو پیرس کے در و دیوار پر موجود ہے۔ کہیں کوئی کتبہ لگا ہوا ہے، کہیں نپولین کے

نام کا فوارہ نصب ہے ۔ کہیں بڑے بڑے مینار اور دروازے بنائے گئے ہیں ، جن پر نپولین کی فتوحات کے مختلف مرقعے نقش ہیں ۔ خود نپولین کا بنایا ہوا مینار واندرم کالم اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ نپولین نے ۱۲ سو توپوں کو جو وہ دشمن سے چھین کر لایا تھا گلایا اور اس کے لوہے سے یہ ۱۴۲ فٹ اونچا مینار بنایا گیا ۔ جس کے اوپر خود نپولین کا ایک مجسمہ نصب ہے ۔ ایک فوارہ " فاؤنٹین دی لا دکتور " بھی فرانسیسی صناعی اور اس سے زیادہ فرانسیسی تخیل کا ایک اچھا نمونہ ہے ۔ اس کو نپولین اول نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر بنایا تھا ۔ فوارہ کی وضع یہ ہے کہ چار مجسموں پر فوارہ کا طشت رکھا ہوا ہے ۔ ہر مجسمہ حکومت کی ایک خاص صفت کا مظہر ہے ۔ ایک وفاداری کی تصویر ہے دوسرا باخبری کا مرقع ہے ۔ تیسرا انصاف کا بت ہے ۔ چوتھا طاقت کا دیوتا ہے ۔ ان سب سے اوپر " فتح " کا ایک انسانی تخیل مجسمہ کی صورت میں نصب ہے ۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد اب اگر تہذیب جدید کی یادگار قائم کرنی ہو تو اس فوارہ کو پانچ مجسموں کی ضرورت نہیں ۔ صرف دو کافی ہیں ۔ نیچے طاقت کا دیوتا اور اوپر فتح کا ایک پیالہ ، جس سے خون کا فوارہ چل رہا ہو ۔

پیرس کے نواح میں وارسائی ایک مشہور مقام ہے ۔ جس کی گزشتہ تاریخ نے مجھے بھی دعوت نظارہ دی ۔ پیرس سے وہاں تک موٹر میں گیا ۔ بلحاظ قدرتی خوب صورتی شادابی اور سبزے کے میں نے سوئزرلینڈ کے سوا اور کہیں اس قدر خوب صورت سڑک نہیں دیکھی ۔ میلوں تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک سرسبز باغ ہے جو پھولوں سے لدا ہوا ہے ۔ وارسائی کی تاریخی عظمت کا سب سے بڑا سبب (میری نظر میں)

یہ ہے کہ اسی کے رقبے سے سب سے پہلے انقلاب فرانس کا شعلہ بلند ہوا تھا اور وہ تلواریں سب سے پہلے وہیں بے نیام ہوئی تھیں جنھوں نے استبداد کے زہریلے درخت کو سرزمین فرانس سے کاٹ کر پھینک دیا۔ اس وقت سب سے زیادہ قابل دید شاہی محل سمجھا جاتا ہے۔ جس کو انقلاب کے بعد کوئی ایسا مکین میسر نہ آیا جس کے سر پر تاج ہوتا۔ اور اب تو سوائے ایک دو بوڑھے دربانوں کے جو آنے جانے والوں کو عمارت کی سیر کرا دیتے ہیں اور اس بہانے سے ان کی روٹیاں چلتی ہیں۔ اس شاہی محل کے در و دیوار خاموش ہیں۔ جس کی تعمیر و آرائش میں ۱۵ کروڑ صرف ہوا تھا۔ ایک قبرستان ہے جس کی ایک ایک اینٹ میں فرانسیسی تاج داروں کی بلند اقبالی دفن ہے۔

محل کے اکثر کمرے اسی حالت میں رکھے گئے ہیں، جو حالت کہ شاہ لوئی چہارم کے زمانے میں تھی۔ اس عہد کا مورخ کہتا ہے کہ وارسائی کا محل حسن و رعنائی کا ایک نگارخانہ تھا اور آج بھی بہت سے ایسے نقوش وہاں نظر آتے ہیں۔ تصویریں، قالین اور بہت سی ایسی چیزیں اپنے گذرے ہوئے مالکوں کی قدر دانی کی یادگار موجود ہیں۔ عمارت کے ایک حصے میں تقریباً تمام شاہان فرانس کی تصاویر آویزاں ہیں۔ لوہے اور پتھر کے مجسموں سے سارا پائیں باغ پُر ہے۔ دس دس قدم پر فرانسیسی مجسمہ ساز کی صنعت کے بہترین نمونے نصب ہیں۔ یونان و روما کے تمام دیوتاؤں کے مجسمے، صناعوں کی تخیل کے بہترین نمونے، بلا مبالغہ تعداد میں اتنے ہی ہیں جتنے کہ اس باغ میں درخت ہیں۔ وہ سب مصور کی صنعت اور انسانی حسن کا ایک ویران خانہ ہے۔ جس کی در و دیوار نے شاہان فرانس کی عیش پرستیوں کے کیسے کیسے ہنگامے دیکھے ہوں گے۔ ہم ہندوستان

ہیں ایک جان عالم واجد علی شاہ اور محمد شاہ پیا کی بزم آرائیوں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ وہاں کتنے ہی جان عالم اور پیا گذر گئے ہیں اور آج ہر شخص بجائے "خود جان عالم" اور "پیا" ہے۔ شاید فرانس کی سیاسی آزادیوں کا یہ بھی ایک اقتضا تھا کہ جب بادشاہوں کی استبدادیت کا قلع قمع کیا گیا، تو ان کے حقوق شاہانہ جس میں تعیش بھی شامل ہے ان سے چھین کر عامۃ الناس کے اندر بدرجہ مساوی تقسیم کر دیے گئے، تاکہ اس جمہوریت میں ہر شخص بادشاہ ہو۔

جب سنہ ۱۸۷۰ء میں جرمن اور فرانس کی لڑائی ہوئی تھی اور جرمن فوج نے پیرس کا محاصرہ کر لیا تھا، تو اسی محل میں جرمن شاہزادے اور افسر مقیم تھے۔ یہ واقعہ بھی عبرت آموز ہے کہ تیس برس سے جس محل میں جرمن افسروں نے فاتح کی حیثیت سے قیام کیا تھا، اسی محل میں گذشتہ جنگ یورپ کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں جرمنوں نے مغلوب پسپا ہو کر صلح نامہ پر دستخط کئے اور میز بھی دیکھی جس پر صلح نامہ رکھا گیا تھا اور وہ قلم بھی موجود ہے جس سے دول کے نمائندوں نے دستخط کئے تھے۔ وہی ایک محل ہے جس میں فاتح بھی آئے اور مفتوح بھی۔ جو کل غالب تھا آج مغلوب ہو کر آیا، اور معلوم نہیں کل پھر کیا ہونا ہے۔ اینٹ اور پتھر کی یہ دیواریں کیا کیا تماشا دیکھتی ہیں؟

مزید مطالعہ کے لیے :- سفر نامہ مصر و روم و شام از شبلی نعمانی

سوالات

۱۔ ولے بخیر گذشت، فقرہ کس بلا کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے ؟

۲۔ یورپ کی کون سی قوم فطری مذاق میں ایشیا سے ربط رکھتی ہے ؟

۳۔ وار سائی کہاں ہے اور کیوں مشہور ہے ؟

مشقیں

۱۔ یہ مضمون بھی سفر نامے کا اقتباس ہے طرز بیان کے لحاظ سے اس کا مقابلہ سفر بغداد سے کرو۔

۲۔ ان جملوں کی تشریح کرو

ا رکابیاں .... رہے گا۔

ب اگر یورپ .... محروم ہے۔

ج لباس کی تیاری .... سیدھا الٹا۔

د شاید فرانس ...... بادشاہ نہ ہو۔

۳۔ عربی کی جمع سالم کے بنانے کا قاعدہ تمھیں بتایا جاچکا ہے۔ عربی میں ایسی بھی جمع آتی ہے جس میں واحد کا وزن سالم نہیں رہتا، اسے جمع مکسّر کہتے ہیں جیسے طالب کی جمع طلبہ، شریف کی شرفا، حکم کی احکام، عمل کی اعمال روح کی ارواح، یہ سب جمع مکسر ہیں۔ اپنے سبق سے جمع مکسر کی مثالیں چھانٹو۔

مشقیں

۱۔ یہ مضمون ایک قلمی تصویر ہے، جس سے وحید الدین سلیم کی شکل و صورت اور سیرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ تم بھی کسی جانے پہچانے شخص کا حال اسی طرز پر لکھنے کی کوشش کرو۔

۲۔ مضمون سے ان فقروں اور جملوں کو چھانٹو جن سے مضمون نگار نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ ان محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

نشانہ ہونا، گل ہو جانا، رشک آنا، نام زندہ کرنا، آنکھ لگنا، کھل جانا، ٹھنڈا کرنا، نرم پڑنا،

۴۔ فعل کے بارے میں تم کئی باتیں جان چکے، اب فعل کی ان شکلوں پر غور کرو۔

خدا بخشے، ہم کو دیکھو، کچھ نہ پوچھو، بحث ہوتی رہی۔

بخشے ۔۔۔ میں حال اور مستقبل دونوں زمانے پائے جاتے ہیں یہ مضارع ہے۔

دیکھو ۔۔۔ میں دیکھنے کا حکم ہے، یہ امر ہے۔

نہ پوچھو ۔۔۔ میں پوچھنے کی ممانعت ہے۔ یہ نہی ہے۔

ہوتی ۔۔۔ فعل رہی کو پورا کر رہا ہے۔ یہ فعل امدادی ہے۔

فعل کی ان قسموں کی مثالیں سبق سے چھانٹو۔

رشید احمد صدیقی

وطن جون پور تھا مگر علی گڑھ کے ہو کر رہ گئے۔ وہیں یونی ورسٹی میں تعلیم پائی اور پھر شعبہ اردو میں ملازم ہو گئے اور عرصہ تک شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ اب یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں مگر سارا وقت علمی و ادبی مشاغل میں گزرتا ہے۔ مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ زندہ دلی اور شگفتگی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مضامین میں سنجیدہ اور شستہ ظرافت پائی جاتی ہے۔ یہ ظرافت عموماً رمز و کنایہ کے پیرایہ میں ملتی ہے اور اس میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے مضامین نہ تو بالعموم عام فہم ہوتے ہیں اور نہ ہر شخص ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین میں مقامی رنگ بہت ہوتا ہے اور جو شخص علی گڑھ کی زندگی اور وہاں کی خاص اصطلاحات سے واقف نہیں ہے وہ ان مضامین سے خاطر خواہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ تاہم ایسے مضامین کی رشید صاحب کے یہاں کمی نہیں ہے جنھیں پڑھ کر عام لوگ بھی لطف اٹھا سکیں۔ رشید صاحب کے مضامین میں صرف سنجیدہ ظرافت نہیں ہوتی۔ ان میں بلا کا طنز بھی ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں معاشرتی، اخلاقی، سیاسی اور ادبی مسائل پر جو طنزیہ نکات ملتے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ موقع ہاتھ آجانے پر ان کے طنز کا وار بھرپور ہوتا ہے۔

رشید صاحب صرف ایک صاحب طرز انشا پرداز ہی نہیں ہیں۔ وہ بلند پایہ نقاد بھی ہیں۔ شعروادب کے بارے میں آپ کے نکات اکثر نہایت لطیف اور بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ آپ کی تنقیدوں میں اکثر یہ نقص ضرور رہوتا ہے کہ اس میں اکثر غیر متعلق طویل بحثیں ملتی ہیں جن کا نفس مطلب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

رشید صاحب کی اس وقت تک کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں "مضامین رشید" اور "خنداں" ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ" سوانحی مرقعے ہیں اور مزاحیہ نگاری کے لطیف ترین نمونے ہیں۔ "طنزیات ومضحکات" مزاح نگاری کی تاریخ ہے جو ہندوستانی اکاڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ ذاکر صاحب، شیخ نیازی اور 'آشفتہ بیانی میری' آپ کی دوسری تصانیف ہیں۔

رشید صاحب دور حاضرہ کے ممتاز ترین انشا پردازوں میں ہیں اور مزاحیہ نگاری کے میدان میں صفِ اوّل میں جگہ پاتے ہیں۔

بجرو

میں جس گاؤں کے ایک بزرگ کا حال سنانا چاہتا ہوں وہ شہر یا قصبہ کی آبادی سے بہت دور ایک پہاڑی مقام میں واقع تھا جہاں موجودہ زمانہ کی نعمتوں سے اب تک کسی ایک کا بھی گذر نہیں ہوا تھا۔ مثلاً تعلیم، اسپتال، کوتوالی، الکشن، ہندو مسلم فساد، گاؤں سدھار اور اسی طرح کی ریڈیو قسم کی اور اور چیزیں۔ بجرو یہاں کے سردار تھے جن کے بارے میں لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ ان سے زیادہ مفید اور مضبوط آدمی گاؤں بھر میں کوئی اور نہیں ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان سے زیادہ جہاں دیدہ اور کارکردہ آدمی وہاں کوئی اور تھا بھی نہیں۔ اس گاؤں میں نہ کبھی چور آئے اور نہ وبا پھیلی۔ چور اس لیے نہیں آتے تھے کہ بجرو خود کسی زمانہ میں ڈاکو رہ چکے تھے، ایسے ڈاکو کہ ان کی زندگی میں چور اور تھانہ دار دونوں نے عہد کر لیا تھا کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے گی جس سے بجرو سے سابقہ پڑنے کا امکان ہو اور نہ بیماری یوں پاس نہیں آتی تھی کہ بجرو کے حکم سے نہ کوئی شخص گاؤں میں بے کار رہ سکتا تھا اور نہ سورج نکلنے اور سورج چھپنے کے درمیان گھر کے اندر قدم رکھتا تھا۔

بجز و بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے سخت کام کرنے کے بجائے اب اُنھوں نے یہ مشغلہ اختیار کیا تھا کہ گاؤں بھر کے لوگ دن میں کھیتی باڑی کے کاموں میں مصروف ہو جاتے تو یہ گاؤں والوں کے



چھوٹے چھوٹے بچّوں کا چارج لے لیتے۔ ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے کسی کے ساتھ کھیلتے، کسی کو کھلاتے پلاتے، کسی کو قصّے سناتے اور کسی کی گوشمالی کرتے، شام کو ان کی مائیں واپس

آکر اپنے اپنے بچے ساتھ لے جاتیں اور مرد بیٹھ کر بجرو کو دن بھر کے کاموں کی تفصیل سناتے، یہ یہ ہوا، یہ یہ دقتیں ہیں۔ یہ یہ ہونے والا ہے۔ ہر ایک کام اور ہر ایک کے کارکردگی سے بجرو واقف تھے۔ بجرو ہوں ہوں کرتے جاتے اور جہاں کسی نے واقعات میں گرہ لگانی شروع کی بجرو نے آنکھ اُٹھا کر اس طور سے گھورا گویا وہ اس کے بیان کو سمجھنے سے معذور ہیں اور معذور ہی نہیں بلکہ اس کو سزا دینے پر آمادہ ہیں۔

ایک دن برسات کے موسم میں جب کہ کئی دن مسلسل بارش ہو چکی تھی بعض نوجوان دیہاتیوں نے بجرو سے کہنا شروع کیا۔ بجرو دادا سُنا ہے یہاں سے بہت دور ایک دیس ہے جہاں انوکھی باتیں ہوتی ہیں۔ بغیر کنوئیں یا تالاب کے پانی ملتا ہے، بغیر دیے کے روشنی ہوتی ہے، بغیر جانور کے سواریاں ہیں۔ بغیر خط پتر کے حال حوال معلوم ہو جاتا ہے، بغیر کھیتی باڑی کے غلہ ترکاری مل جاتی ہے۔ عورت مرد ہر وقت کھیلتے کودتے رہتے ہیں، بھوت پریت پکڑ لیے گئے ہیں جو ناچا گایا کرتے ہیں۔ ایک آدمی کسی کو مار ڈالے تو دس آدمی اُسے مار ڈالتے ہیں اور پھر ان دسوں کو مارنے والا کوئی نہیں ملتا، کھیتی کوئی نہیں کرتا، کھاتے سب ہیں۔ بجرو دادا ایک دن ہم کو بھی لے چلو، ہم بھی دیکھ آئیں۔

بجرو دادا پہلے تو چپ رہے پھر تمبا کو کا ایک نہایت آب دوز قسم کا کش لے کر چلم کو دوسرے کے حوالہ کیا اور بولے بیٹا ٹھیک ہے ہمارا سب دیکھا بھالا ہے ۔ اس بستی کو شہر کہتے ہیں ۔ ان شہروں کا عجیب حال ہے ۔ میں یہاں کے لوگوں کے ساتھ رہا ہوں اور انھیں خوب جانتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے ناواقف نہیں ۔ ان کے مکانات بڑے مضبوط، بڑے خوب صورت اور بڑے تکلیف دہ ہوتے ہیں ۔ ان کو کھلی ہوا اور روشنی میسر نہیں آتی ۔ یہ کوٹھری میں نہاتے ہیں اور جہاں سوتے ہیں وہیں پاخانہ پھرتے ہیں، یہ کام نہیں کرتے ورزش کرتے ہیں ۔ ان کے ہاں کھانا کھانے پکانے کا برتن بھی گندہ ہوتا ہے ۔ اس سے زیادہ گندی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں یہ کھانا کھاتے ہیں ۔ شہر کی دکان پر کھانا پکتا دیکھو تو تم کو کئی کئی دن بھوک نہ لگے اور ان کے یہاں کے غل غپاڑے سن پاؤ تو رات کو نیند نہ آئے ۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں درجنوں گھسے پلے سوتے جاگتے جیتے مرتے رہتے ہیں لیکن ہر روز ان میں کوئی نہ کوئی تھپل کچلا کر مر جاتا ہے ۔ جتنا کام نہیں کرتے اس سے زیادہ دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ خود لڑتے ہیں دوسرے صلح کراتے ہیں اس لئے ہر صلح دوسرے جھگڑے کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔

ان کے عجیب عجیب کھیل ہیں ۔ تم کو تھوڑی دیر میں سارا حال کیسے بتاؤں ؟ کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں ؟ اچھا آؤ تم کو

ان کے لڑنے کا حال سُناؤں۔ ان کے ہاں لڑائی ایسے شروع ہوتی ہے۔
کسی نے کہا میں اُلو، دوسرے نے کہا میں چمگادڑ، تیسرے نے کہا میں نیل کنٹھ مہادیو! ان میں سے ایک اس پر لڑنا جھگڑنا شروع کرتا ہے کہ دنیا میں سب کے سب اُلّو کیوں نہیں ہو جاتے۔ دوسرا کہتا ہے جہاں چمگادڑ ہو وہاں اُلّو اور چمگادڑ کو جینے کا کب حق حاصل ہے؟ کوئی ان احمقوں سے پوچھے کہ جس جنگل میں صرف اُلو، چمگادڑ اور نیل کنٹھ مہادیو ہی ہوں وہاں سادھارن سے رہن سہن کیسے ہو سکتی ہے۔ اُلّو کو اس پر اصرار کہ ویرانہ میرا، چمگادڑ کہتا ہے ویرانہ تیرا ہو بسیرا میرا ہو اور نیل کنٹھ مہادیو کا دھرم یہ کہ ویرانہ یا بسیرا اسے مجھے سروکار نہیں۔ نرم چارا میرا، اس پر ان میں خوب خوب جنگ ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ایک چیز ہوتی ہے جس کا نام انھوں نے اخبار رکھ چھوڑا ہے۔ سارے رگڑے جھگڑے کا گھر یہی ہے۔ جس طرح وبا کے کیڑے ایک جگہ سے دوسری جگہ لائے لے جائے جاتے ہیں، اسی طرح جھگڑے فساد کے کیڑے مکوڑے ان اخبارات سے ہر ہر جگہ پھیلائے جاتے ہیں۔
تم کو وہ مثل تو یاد ہو گی، ایک نے کہا کہ کوا کان لے گیا۔ اب یہ کوئی نہ دیکھے گا کہ کان موجود بھی ہے یا نہیں۔ ہاتھ دھو پنجے جھاڑ کوّے کے پیچھے ہو لیں گے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوّے کے پیچھے جانے سے پہلے کان موجود تھا لیکن کوّا گو ہار کے بعد دیکھتے ہیں تو کان تو غائب ہی ہیں اس کے ساتھ کسی کی ناک کٹی ہوئی ہے کسی کا ہونٹ کٹا ہوا ہے کسی کی ایک آدھ ناک

گھلوے میں گئی اور کسی کی دُم بٹے کھاتے ہیں۔

اس کوّا گوہار پر خوب بغلیں بجائی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ میں بھی اس میں پھنس گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے تمہیں الّو پسند ہے یا چمگادڑ یا نیل کنٹھ مہادیو۔ میں نے کہا اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ کہنے لگے جنگل کی سرداری کا چناؤ در پیش ہے۔ میں نے کہا ظاہر ہے میں اُلّو کا ساتھی ہوں۔ اس پر چمگادڑ نے کہا اُلّو کیوں بنتے ہو میرا ساتھ دو، میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگے مجھ میں خاصیت اُلّو کی ہے اور ولولہ نیل کنٹھ کا۔ اتنے میں نیل کنٹھ مہادیو ٹائیں ٹائیں کرتے آئے اور میری پگڑی جھپٹ کر چل دیے۔ اُلّو نے یہ دیکھا تو لپک کر ایک ٹھنٹھ پر جا بیٹھا، چمگادڑ اُلٹا لٹک گیا اور میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

ان کے یہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں بعض تو ایسی ہیں جنھوں نے سورج اور آسمان بھی نہیں دیکھے ہیں۔ گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں بچے پالتی ہیں اور چکّی پیستی ہیں، یہاں تک کہ ایک دن دردولوا کی چکّی خود انھیں پیس ڈالتی ہے۔ بعض ایسی ہیں جو صرف پان کھاتی ہیں، چھالیہ کرتی ہیں، شوہر کو گالی دیتی ہیں اور اپنے میکے والوں کی پرورش کرتی ہیں۔ لیکن اب اس میں ایک اور قسم پیدا ہوگئی ہے۔ یہ انگریزی بولتی ہیں، ساری پہنتی ہیں۔ اور سینما دیکھتی ہیں، شوہر ان کی خدمت کرتے ہیں اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہیں۔

شہروں میں ایسے ایسے گھر بنتے ہیں، جہاں ہر قسم کے جنگلی جانور اور

پرند پکڑ پکڑ کر رکھے گئے ہیں۔ جن کو یہ چڑیا گھر یا جانوروں کا عجائب خانہ کہتے ہیں میں ان شہر والوں کی تعریف کروں گا کہ انھوں نے ہر چوپایہ یا پرند کے لیے ایسی جگہ بنادی ہے گویا وہ اسی حالت میں اور اسی مقام پر ہیں جہاں کہ وہ پکڑے جانے سے پہلے تھے۔ جانوروں کو شہری بنانے کی کوشش کرتے کرتے ان کے دل میں یہ سما گئی ہے کہ شہریوں کو جنگلی بنایا جائے۔ ان میں جو سب سے زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ اب تک جو لوگ خیالات کے ننگے تھے ان کو جسم کا بھی ننگا ہونا چاہیے، چنانچہ ان شہریوں میں جو سب سے زیادہ مہذب ہے وہ سب سے زیادہ ننگا ہے۔ ان کے مرد عورتوں نے کپڑے اُتار کر پھینک دیے ہیں اور اب جنگلوں میں ننگے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سے تن درستی بڑھتی ہے۔ ننگا پن سات سمندر پار سے آیا ہے۔ اب تک ہندوستان میں بھوکوں کی کیا کمی تھی کہ اس میں ننگوں کا اور اضافہ ہوا۔ یہ ننگوں کا عجائب خانہ ہوا۔

لیکن ان سب سے زیادہ انوکھا عجائب خانہ وہ ہے جس کو ان شہریوں نے اسکول کالج، یونی ورسٹی یا بورڈنگ ہاؤس کا نام دے رکھا ہے اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ جو اصول انھوں نے چڑیا گھر میں ملحوظ رکھا تھا اس کو انسانوں کے اس عجائب گھر میں بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں یہ ان کو ایک قسم کا منتر پڑھاتے ہیں اور ایک ہی قسم کے سانپ کھیلنا سکھاتے ہیں۔ اس عجائب گھر کے عجوبے اپنا نظیر

نہیں رکھتے۔ ان انسانی جانوروں کو ان کے نگراں ایک ہی طرح کی فضا میں رکھتے ہیں، ایک ہی قسم کا راتب دیتے ہیں، ایک ہی قسم کا کام لیتے ہیں اور ایک ہی قسم کے مداری رکھتے ہیں، جو ایک ہی قسم کے کرتب سکھاتا ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے، اے احمقو! جو جانور اپنے اصلی گھر میں شکار پر زندگی بسر کرتا تھا اُسے مردار کیوں کھلاتے ہو۔ جو میدان میں گھومتا پھرتا تھا، چاند سورج، پھل، پھول، گرمی، سردی، محنت مشقت کی گردش میں پلا ہے اس کو کالی انچھر بھینس برابر کا سبق کیوں پڑھاتے ہو۔ جو نقش و نگینے کا کام کرتا تھا، اس سے مگدر کیوں ہلواتے ہو۔ جو کھیت جوتتا تھا اسے گورکنی کیوں سکھاتے ہو۔ جو تیل بیچتا تھا اُسے فارسی کیوں پڑھاتے ہو۔ جو مہابھارت میں شریک تھا اس سے شکنتلا کا ناٹک کیوں کھلواتے ہو۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہو اُسے یورپ کا خواب کیوں دکھلاتے ہو۔ ہرن پر گھاس لادنے سے کیا حاصل، مجنوں کو منطق سے کیا سروکار، لیکن یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔

البتہ اب جب کہ اس کو انسانوں کے اس چڑیا گھر سے نکل کر روٹی کی تلاش ہوئی تو معلوم ہوا کہ تیلی کا بیل بجلی کی طاقت نہیں بن سکتا۔ اب بھوکوں مرتے ہیں، روتے ہیں کہ روزگار نہیں ملتا۔

چڑیا گھر والے چونکے تو معلوم ہوا کہ چڑیاں جگ گئیں کھیت! امرض کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اب ان کو کون بتائے، بھوک کا مرض تحقیقات سے نہیں خوراک سے جاتا ہے لیکن چڑیا خانہ کا روگ ان کو اس طرح لگا ہے

کہ روٹی سے پیٹ بھرنے پر اکتفا نہ کریں گے۔ جب تک روٹی کے ساتھ بوٹی نہ ہو کیوں کہ تم جانتے ہو حرکا یا گھر میں ہاتھ پاؤں ہی شل نہیں کر دیے جاتے، ذائقہ بھی خراب ہو جاتا ہے۔ چٹخارے کا لپکا پڑ جاتا ہے اور تم جانو پیٹ تو بھرا جا سکتا ہے لیکن ذائقہ بہت دیر میں سدھرتا ہے۔

شہر والے اس پر بڑا ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی کلیں ایجاد کر لی ہیں کہ ہم کو اپنے جسم کے کل پرزوں کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں، چنانچہ اب ہر چیز کل سے بنائی جاتی ہے، ہاتھ لگانا حرام ہو گیا ہے۔ بونا، جوتنا، کاٹنا، بننا، بنانا، بھرنا، لانا، لے جانا، ہنسنا، بولنا، لڑنا، جھگڑنا، بگڑنا، سنورنا، مرنا، جینا سب مشین سے ہوتا ہے۔ جو ہاتھ پاؤں سے کام کر سکتے تھے ان کو کام نہیں ملتا جن کو کام مل سکتا ہے ان کو ہاتھ پاؤں چلانا نہیں آتا۔ شرافت اور ذلت، عفت و عصمت بہادری و بزدلی قابلیت اور ناقابلیت ہر ایک کی پشت پناہ مشین بن گئی ہے۔ مجھے اس وقت ہنسی آتی ہے جب شہر والے ہمارے حال پر ترس کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گاؤں والے جاہل ہوتے ہیں۔ ہماری بیوقوفی اور غریبی نے ہمیں تباہ کر رکھا ہے ان کو کون بتائے کہ جب تک وہ ہماری فکر میں رہیں گے ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود ان کے حال پر ترس کھائیں اور ذہن و دماغ کی گم راہیوں نے انھیں جس تاریک دلدل میں پھنسا دیا ہے اُسے ہم اپنے ہاتھ پاؤں کی فیض بخشیوں سے ان کو نجات دلائیں۔

ان میں بڑے بڑے ودوان لوگ ہیں جن کے سامنے آکاش اور پاتال کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کی نت نئی ایجاد نے قدرت کے کھیلوں کو ماند کر دیا ہے۔ لیکن زندگی کے کھیل نے ان کو زچ کر دیا ہے، وہ زندگی کے کھیل کو بے ایمانی سے جیتنا چاہتے ہیں۔ ہم دیہاتی زندگی کا کھیل کھیلتے ہیں، وہ کھیل کی زندگی پر مرتے ہیں۔ وہ ایجاد کر سکتے ہیں، ایثار سے محروم ہیں۔ ہم ایثار کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ایجاد کے چکر میں نہیں پھنستے۔

ان کی ایک بڑی ایجاد روپیہ ہے، جس کو انھوں نے یہ خاصیت دے رکھی ہے کہ اس سے ضروریات کی تمام چیزیں خرید سکتے ہیں۔ پیدا کرنے کو تو انھوں نے روپیہ پیدا کر لیا، لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ اس کو خرچ کیسے کیا جائے بلکہ روپیہ کا کیا کیا جائے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ روپیہ کے اعتبار سے غلہ کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے حالاں کہ چاہیے یہ تھا کہ غلہ کے اعتبار سے روپیہ کی قیمت گھٹتی بڑھتی، غلہ کاشت کاروں کی چیز ہے اور روپیہ دولت مندوں کی اور تم جانتے ہو کہ اس کھیل میں کس کا پلہ بھاری رہے گا۔ روپیہ کا حال یہ ہے کہ اس کا گھٹنا بھی برا اور بڑھنا اس سے برا۔ شہر والے اب تک کوئی تدبیر ایسی نہیں سوچ سکے ہیں جس سے پیداوار اور روپیہ میں تعلقات ہموار رکھے جا سکیں۔ ہماری تباہی اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم غلہ پیدا کرتے ہیں، ہم مریض یا جاہل ہیں۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ شہر والے روپیہ ایجاد کیا کرتے ہیں۔ اب تک ہم کو صرف اس مصیبت سے سابقہ تھا کہ بارش وقت پر نہیں ہوتی، یا سیلاب آگیا۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت

اب یہ ہے کہ شہر والے جب چاہتے ہیں روپیہ کا رُخ بدل دیتے ہیں اور ہماری تمام کوششیں اس پر صرف کرتے ہیں کہ غلّہ پیدا کرنے کے جتنے اُصول ہیں ہم ان کو کام میں لائیں۔ ان کو کون سمجھائے کہ ان کو پوری کوشش اس پر صرف کرنی چاہیے کہ روپیہ ایجاد کرنے کے جتنے جدید ترین اُصول ہیں انھیں بھول جائیں۔ ہم کو وہ ہمارے فرائض طرح طرح سے ریڈیو پر سُناتے ہیں اور اس ہنسی دل لگی سے اپنا اور بعض دوسروں کا جی بہلاتے ہیں۔ لیکن ان کے فرائض دوسرے جب ہوائی جہاز اور مشین گن سے سُناتے ہیں تو ہم کو ان پر بڑا ترس آتا ہے۔

ان شہر والوں نے ہماری دیکھا دیکھی اپنے گرد آلود، دھواں دھار شہروں میں چھوٹے بڑے باغ اور پارک بنا رکھے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کو صاف ہوا اور کھلی جگہ مل جایا کرے۔ ان کے پھل پھول کی کیاریاں بھی اتنی ہی مصنوعی ہوتی ہیں جتنا کہ انکے مرد وعورت اپنی زندگی، اپنی رہن سہن، اپنے لباس اور وضع اور اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے مصنوعی ہوتے ہیں۔ ان کو وہ تفریح کہاں نصیب جو گاؤں والو کے حصّہ میں آئی ہے۔ ہم محنت کرتے ہیں اور اپنے کھیت خود بناتے ہیں اور پھر ان کی شادابی، نمو اور فراوانی پر خوش ہوتے ہیں۔ یہ خوشی ہمارے جسم اور روح دونوں کو تازہ کرتی اور قوی بناتی ہے۔ ہمارے پیڑ پودے ہمارے رنج وراحت سے متاثر ہوتے ہیں۔ شہر والوں کو شہر کے پارک میں یہ چیزیں کہاں نصیب! ان میں وہ ربط اور وابستگی کہاں پیدا ہوسکتی ہے

جو زندگی کے دھارے پر ہم کو اُبھارے رہتی ہے؟

ہم بیمار پڑتے ہیں تو اپنے ہی گھاس پات سے اپنا علاج کرتے ہیں۔ یہ بیمار ہوں تو جب تک ولایت کی دوائیں اور ولایت کے اسلحے میسّر نہ آئیں یہ اچھے نہیں ہو سکتے۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی وجہ سے ولایت سے یہ چیزیں آنی بند ہو جائیں تو شہر والے کتنے دن تک زندہ رہیں۔ یہ ہماری بیماری پر بڑا شور مچاتے ہیں اور ہر روز ہمیں بیماری سے بچنے کی ترکیبیں بتایا کرتے ہیں لیکن ان کو نہیں معلوم ہوگا کہ ہم میں تندرستوں کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے۔

شہر والوں کو سب سے بڑا فخر اس پر ہے کہ وہ مہذب ہیں اور انھوں نے دنیا کی ترقی میں بڑے کارنمایاں کیے ہیں۔ ان کے علمأ ان کے ادبأ ان کی سائنس نے دنیا کی نعمتوں میں اضافہ کیا ہے اور ہم دیہاتی جہاں کے تہاں پڑے ہوئے ہیں اور دنیا کی لذّتوں سے بے خبر ہیں۔ یہ دیہات کا قصور نہیں ہے۔ ممکن ہے دیہاتیوں کا ہو، وہ بھی ہندوستان کے دیہاتیوں کا۔ لیکن انجام کے اعتبار سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون خسارہ میں ہے اور کون فائدہ میں کون غلط راستہ پر اور کون صحیح راستہ پر۔ دنیا کی تاریخ اور دنیا کے تمدن دونوں پر ابھی اتنی مدت نہیں گزری کہ ہم زندگی کے نیک انجام نافرجام ہونے پر کوئی صحیح حکم لگا سکیں۔

مزید مطالعہ کے لیے :۔ خنداں، ذاکر صاحب، شیخ نیازی آشفتہ بیانی میری کے اقتباسات۔

مشقیں

۱۔ اس مضمون میں شہری زندگی کے کئی پہلوؤں پر طنز ہے۔ تم ایک شہری کی زبان سے دیہاتی زندگی پر طنزیہ مضمون لکھنے کی کوشش کرو۔

۲۔ ان فقروں اور جملوں پر غور کرو جن سے مضمون نگار نے مزاح پیدا کیا ہے۔

۳۔ مندرجہ ذیل سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے الفاظ بناؤ۔

سابقے۔ نا، بے، بد، ہم، خانہ،
لاحقے۔ مند، کش، کار، ور، پناہ۔

۴۔ تم جملہ کے دو بڑے اجزا پڑھ چکے ہو۔ اب جملوں کے اقسام سمجھ لو۔

ا۔ بجرو بوڑھے ہو چکے تھے۔

اس جملہ میں فعل ناقص ہے، اس لیے یہ جملہ اسمیہ ہوا۔ اس میں "بجرو" مبتدا ہے اور بوڑھے، خبر۔

ب۔ یہ کوٹھری میں نہاتے ہیں۔ اس میں فعل لازم ہے اس کا فاعل "یہ" ہے، "کوٹھری میں" متعلق فعل ہے۔ جب کسی جملہ میں فعل لازم یا متعدی آتا ہے تو وہ جملہ فعلیہ ہوتا ہے۔

جگرؔ صاحب (اقتباس)

جگرؔ صاحب اردو کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ ایک زمانے میں
یہ شراب بہت پیتے تھے اور نشہ سے سرشار ہو کر بڑے جوش سے

اپنا کلام سناتے تھے۔ آج سے ۱۵، ۲۰ سال پہلے شہرت اور مقبولیت میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ رشید صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ان کا حلیہ بیان کیا ہے۔ یہ اسکیچ (حلیہ) رسالہ نقوش کے "شخصیات نمبر" سے اختصار کے بعد منتخب کیا گیا ہے۔ انداز بیان میں رشید صاحب کی تحریر کی تمام خصوصیات موجود ہیں)

بالکل یاد نہیں آتا کہ جگرؔ صاحب سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی ممکن ہے الہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغرؔ صاحب مرحوم ہندوستانی اکیڈمی یوپی میں صیغۂ اردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغرؔ صاحب کے یہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگرؔ صاحب پر شراب کا بڑا تسلط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی رسم و راہ ہو گئی کہ جگرؔ صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے ہاں ٹھہرتے، یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے عزیز اور محترم دوست بن گئے۔

الہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے جگرؔ صاحب اس طرح خاموش مودب اور آنکھیں نیچی کئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی صرف ہاں نہیں میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ کبھی کبھی وہیں جگرؔ صاحب مل جاتے، ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ خود نہ آئے ہوں بالکل کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مہم پر چلے جائیں ان کے مواجہہ میں اصغرؔ صاحب مجھ سے

تفصیل سے گفتگو نہ کرتے میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اٹھ کر چلے جاتے۔

میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یونی ورسٹی اور شہر میں بھی جگر صاحب محبوب و مقبول تھے۔ اس زمانے میں بھی شراب کا بڑا زور رتھا۔ اکثر غافل اور بدمست شہر سے لائے جاتے۔ یونی ورسٹی کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا جو انھیں میرے یہاں لاتا میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرے میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔ یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ اور بھائی کی خدمت کر رہا ہو، یا کوئی نرس سرسام میں مبتلا مریض کی نرسنگ کرتی ہو اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بانکوں سے کم نہ تھے جن کے قصے ہم تاریخوں اور داستانوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ میں آجاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور مودب ہو جاتے۔ لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے رہ رہ کر سمندر کی تہ میں کوئی طاقت ور موج ابل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر یک بہ یک زور ختم کرکے واپس چلی جاتی ہو۔ یہ باتیں میں اس لیے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے۔ میری نیت ہوتی تو بھی میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقے سے اس کی نمائش کرتا۔ جگر صاحب سے مجھے یہی تو شکایت ہے کہ وہ میرے سامنے مودب کیوں ہو جاتے ہیں۔

مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی الجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت "گارڈ آف آنر" دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔

جگر صاحب اپنے حلقے کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے میں پرہیز کرتا ہوں۔لیکن اتفاق یا ضرورت سے پہنچ جاؤں تو وہ اسی طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جائیں گے۔ جیسے مکتب کے چھوٹے بچے ہنس بول یا ادھم مچا رہے ہوں اور دفعتہً مولوی صاحب نمودار ہو جائیں۔

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے۔ یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ سمجھتا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر آئے گی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوٹتیں۔سوچتا یہ تھا کہ جب میں اپنی معمولی بری عادتوں کو چھوڑنے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے، جس میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوشش گریہ میں غالب کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا۔

جگر صاحب شراب سے کیوں اور کیسے تائب ہوئے مجھے اس کا علم نہیں۔اس بارے میں ان سے کبھی ذکر نہیں آیا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوتی جسے بتذل کہہ سکیں۔وہ کبھی لوٹتے پوٹتے دندمچاتے نہیں پائے گئے، مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیف و سرخوشی بخشنے کے بجائے

شراب ان کو انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو ان پر تھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہو اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی الحس ہیں اور تھوڑی سے تحریک بھی بہت ہو جاتی ہے۔ شاعری میں بھی ان کا یہی حال ہے، جیسے خیال یا جذبہ برتی رو بن کر ان کے جسم و جان کو جھن جھنا دیتا ہو۔ کچھ دنوں سے ان کے کلام میں یہ بات بہ ظاہر کم ہو گئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے اس میں تاثرات کی شدت ہے لیکن ان کو پیش کیا گیا ہے زیادہ نرم اور مدھم آواز میں۔

جگرؔ صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد کرنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری اور مہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کہیں کوئی خلل نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔

جگرؔ صاحب عالم فاضل نہیں ہیں اور نہ ان کی گفتگو مُتقنِّنانہ اور فلسفیانہ ہوگی۔ ان کا احساس جتنا سریع اور شدید ہے اتنا ان کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارے میں تفصیل سے گفتگو نہیں کیا کرتے، وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے اور شاید غور کر بھی نہیں سکتے۔ جس کے جذبات

تند اور تیز ہوں وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

جگرؔ صاحب میں مروت اور وضع داری بہت ہے۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لیے وہ تمام عادات برتتے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اٹھائے۔ تکریم اور تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے ہیں، سامان قیمتی رکھتے ہیں، جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چرا لیتا ہے ورنہ کہیں کھو آتے ہیں۔ جگرؔ صاحب جب کبھی میرے ہاں آئے میں نے سوال کیا "جگرؔ صاحب سفر میں کیا کھو آئے" اور تقریباً ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے۔

جگرؔ صاحب جس کے مہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں۔ میں نے غصہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا۔ حکم چلاتے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کبھی ان کی زبان پر نہ آئی۔ دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈھے اور نہ ان کی تشریح کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لیے ایسا نہ کرتے ہوں۔ جگرؔ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعرا کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سنا سنا کر اسے ادھموا کر دیں۔

جگرؔ صاحب کو معصوم بچوں سے کھیلتے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگرؔ صاحب کو نہ معلوم ہو کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچے سے کہیں زیادہ معصوم وہ خود نظر آتے ہیں۔ جگرؔ صاحب کا

چہرہ بشرہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچہ ان کے سامنے بے تکلف ہو سکے۔ اس کی کمی جگر صاحب طرح طرح سے پوری کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بچے کا کھلونا بنا دیتے ہیں، ایسا کھلونا جس کو بچہ نہ کھیلے تو کھلونا خود کھیلنے لگے۔

بعض شعرا بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتا فقرہ زبان پر ضرور آجاتا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ فقرہ اور پھبتی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے۔ لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرے میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں۔ مشاعروں میں اب یہ بات عام ہو گئی ہے، بالخصوص دہلی کے عام مشاعروں میں۔ آج کل شاید ہی کوئی تقریب ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور آبروریزی کے ایسے مناظر دیکھے جاتے ہوں جیسے دہلی کے اس طرح کے مشاعروں میں۔ مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دور نہیں جب دہلی کا کوئی من چلا سرمایہ دار شاعروں کی کوئی سرکس کمپنی بنالے اور امریکن فری اسٹائل میں ان کے کرتب اور کرتوت شہر شہر دکھاتا پھرے۔

خلوت ہو یا جلوت جگر صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرتے نہیں پایا۔ مشاعرے میں ان کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔ ان کی زبان سے

کوئی فقرہ اگر نکلے گا بھی تو تحسین اور ہمت افزائی کا۔ یہاں مجھے ثاقبؔ اور صفیؔ مرحومین بے اختیار یاد آتے ہیں۔ لکھنؤ کے یہ باکمال شعرا مشاعرے میں جس ادب اور احترام سے بیٹھتے اور مناسب مواقع پر تحسین کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وہ اب کہیں نہیں نظر آتا۔

جگرؔ صاحب میرے یہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔ اول یہ کہ جگرؔ صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی اس لیے اپنے عزیزترین ڈاکٹروں کو بلواتا ہوں جو ان کا مکمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگرؔ صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگرؔ صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے، چادر، غلاف، تولیہ کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلواکر کپڑے ان کے حوالہ کردوں گا۔

تیسرے یہ کہ جگرؔ صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لیے نائی بلاؤں گا تاکہ وہ جگرؔ صاحب کو نوک پلک سے درست کردے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگرؔ صاحب کے عشاق ان کو علی گڑھ میں گھسیٹتے نہ پھریں اور میرے یہاں نہ اپنا کلام ان کو

سنائیں اور نہ ان کا کلام خود سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگرؔ صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپیہ اس طرح خرچ نہ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگرؔ صاحب جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لیے نہیں موجود ہوتا۔ اس لیے کہ جگرؔ صاحب کچھ اس گداز قلب کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کو میری زندگی کا بھروسا ہے اور نہ اپنی زندگی کا اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

مزید مطالعہ کے لیے:۔ مضامین خنداں، شیخ نیازی، آشفتہ بیانی میری
از رشید احمد صدیقی

سوالات

۱۔ نوجوانوں نے شہر کے بارے میں بجر ذ دادا سے کیا کہا ؟
۲۔ مضمون نگار نے شہری زندگی کے کن پہلوؤں پر طنز کیا ہے ؟
۳۔ رشید صاحب کو جگر صاحب سے کیا شکایت ہے ؟
۴۔ جگرؔ صاحب کے آنے پر رشید صاحب کن کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں ؟

پطرس بخاری

احمد شاہ نام مگر ادبی دنیا میں 'پطرس' کے نام سے مشہور ہوئے۔ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے پھر دہلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کے اسسٹنٹ کنٹرولر ہوگئے۔ اس وقت پاکستان میں ہیں۔

موجودہ دور کے بہترین مزاح نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ مضامین میں خوش طبعی، شوخی اور ظرافت زیادہ اور طنز کم ہوتا ہے۔ انگریزی ادب اور انشا کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ پطرس نے بہت جلد اپنے لیے اردو ادب میں جگہ پیدا کرلی۔ عرصہ ہوا آپ کے آٹھ دس مضامین کا ایک مجموعہ 'مضامین پطرس' کے نام شائع ہوا تھا۔ اتنے مختصر ادبی سرمایہ سے ادب میں ایک مستقل جگہ پیدا کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مضامین اعلیٰ پایہ کے ہیں۔

وہ معمولی واقعات کو لیتے ہیں اور ان کو اس طرح ترتیب دے کر پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مشقیں

۱۔ انجام کے اعتبار سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون خسارہ میں ہے اور کون فائدہ میں، مضمون نگار کے اس خیال پر تبصرہ کرو۔

۲۔ اس مضمون میں شہری زندگی کے کئی پہلوؤں پر طنز کیا گیا ہے تم ایک شہری کی زبان سے دیہاتی زندگی پر طنزیہ مضمون لکھنے کی کوشش کرو۔

۳۔ دوسرے مضمون میں جگر صاحب کی افتادِ طبع اور سیرت کے جو پہلو ابھرتے ہیں انھیں بیان کرو۔

۴۔ مندرجہ ذیل سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے الفاظ بناؤ

سابقے: نا، بے، بد، ہم، خانہ۔ لاحقے: مند، کش، کار، ور، پناہ

۵۔ تم جملہ کے دو بڑے اجزا پڑھ چکے۔ اب جملوں کے اقسام سمجھ لو۔

ا۔ بجرو بوڑھے ہو چکے تھے۔

اس جملہ میں فعل ناقص ہے اس لیے یہ جملہ اسمیہ ہوا، اس میں بجرو، مبتدا ہے اور بوڑھے ہو چکے تھے خبر۔

ب۔ یہ کوٹھری میں نہاتے ہیں، اس میں فعل لازم ہے اس کا فاعل یہ ہے کوٹھری میں، متعلق فعل ہے۔ جب کسی جملے میں فعل لازم یا متعدی آیا ہو تو وہ فعلیہ ہوتا ہے۔

پطرس بخاری

احمد شاہ بخاری نام تھا، مگر ادب کی دنیا میں "پطرس" کے نام سے مشہور ہوئے۔ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے آل انڈیا ریڈیو دلی میں اسسٹنٹ کنٹرولر تھے۔ ریڈیو میں آنے سے پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔

پطرس یہاں سے پاکستان چلے گئے اور وہاں پاکستان ریڈیو کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان کی طرف سے اقوام متحدہ میں مستقل نمائندہ ہو کر گئے تھے۔ وہیں ۱۹۵۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

پطرس نے بہت جلد اردو ادب میں اپنے لیے جگہ پیدا کی۔ عرصہ ہوا کہ آپ کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "مضامین پطرس" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں آٹھ دس مضامین ہوں گے۔ مگر انشاپردازی کے نقطۂ نظر سے یہ مضامین اتنے بلند پایہ ہیں کہ انھیں کی بدولت آپ کو اردو ادب میں ایک مستقل جگہ مل گئی اور آج آپ کا نام بھی اردو ادب کے ممتاز ترین مزاحیہ نگاروں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

پطرس کے مضامین میں انگریزی ادب اور انشا کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ آپ کے مضامین پڑھ کر انگریزی کے مزاحیہ نگار انشاپرداز یاد آجاتے ہیں۔ مگر یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آپ کے مضامین انگریزی

انشا پردازی کا محض چربہ ہیں۔ پطرس کے مضامین میں کافی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ تحریر کی شوخی، شگفتگی اور روانی ہر جگہ نظر آتی ہے مضامین کے پلاٹ، ان کی افسانویت، ان کی نفسیاتی تحلیل، ان کی ظرافت اور اسلوب بیان ہر چیز معیاری اور دل چسپ ہے۔

پطرس مرحوم نے ویسے تو عرصہ سے اُردو میں لکھنا تقریباً بند کر دیا تھا مگر ان کے انتقال سے اردو ادب کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔

پطرس نے اپنے چند مضامین سے جو شہرت حاصل کر لی وہ کم ادیبوں کے حصّے میں آئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مضامین کس قدر بلند پایہ ہیں۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

(ذیل کے مضمون میں ایک معمولی سا واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر مصنف کے طرز بیان اور واقعہ کو پیش کرنے کے طریقے نے اسے انتہائی دل چسپ اور پر کیف بنا دیا ہے)

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے، ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہم چاری سے بہ سبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں آپ سحر خیزی میں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیجیے گا۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نقلوں کے بھوکے بیٹھے تھے دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تو ہم سمجھے کہ خواب ہے، ابھی سے کیا فکر کرنا، جب جاگیں گے لاحول پڑھ لیں گے، لیکن گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی اور صاحب، جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹ کھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آبا و اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ بھی جاگ اٹھی ہو گی۔ بہتیری آوازیں دیتا ہوں ..... اچھا..... اچھا..... تھینک یو.... جاگ گیا ہوں.... بہت اچھا نوازش ہے.... آں جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے۔ یہ سوئے ہوئے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں۔ اور حضرت عیسیٰؑ بھی تو واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے، زندہ ہو گیا تو ہو گیا، نہیں تو چھوڑ دیا، مردے کے پیچھے لٹھ لے کر تھوڑا ہی پڑ جاتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغتے تھے؟ یہ تو ہم سے

کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ بس اہل ذوق خود ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھا۔ اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں۔ سوچا کہ آج پتا لگائیں گے یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے، لیکن جب گھوم گھام کر کھڑکی اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی نظر نہ آتی تو فکر سا ہو گیا کہ آج سورج گرہن نہ ہو؟ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی،

لالہ جی! ...... لالہ جی! جواب آیا۔ "ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آج کیا بات ہے کہ اندھیرا اندھیرا سا ہے۔"

کہنے لگے۔ "تو اور کیا تین ہی بجے سے سورج نکل آئے۔"

تین بجے کا نام سن کر ہوش اڑ گئے چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "تین ..... تو ..... نہیں ..... کچھ ..... سات ..... ساڑھے ..... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ارے او کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے، میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا، یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی

ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو آج دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے؟ تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں کہ کوئی مذاق ہے، لاحول ولاقوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیرباد کہہ دوں، مگر پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکا تو کوئی ہم نے نہیں رکھا ہے، ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسبِ معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنا دس بجے اٹھے، بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے، شام کا ارمان انگیز وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی، ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ اتنے میں ایک پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر" ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے، بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے، ارشاد ہوا "آپ گا رہے ہیں؟" زور "آپ" پر۔

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں، لیکن خیر، فرمائیے؟

بولے "ذرا...... وہ ...... میں ...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں ...."

بس صاحب موسیقیت کی روح ہم میں فوراً مر گئی دل نے کہا۔

"او نابکار انسان، دیکھ پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔"

صاحب، خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ خدا یا ہم بھی اب باقاعدہ

مطالعہ شروع کرنے والے ہیں، ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پوچھ اور دل کو مضبوط کرکے میز کے سامنے آ بیٹھے، دانت پیس لئے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھالیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار پڑا تھا، اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علاحدہ رکھ دیا، چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ کھڑا کر دیا، ایک نوٹ پیپر پر کتاب کے صفحوں کی تعداد کو لکھ کر سب کو جمع کیا، پھر پندرہ اپریل تک کے دن گنے، صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر منقسم کیا ساڑھے پانچ سو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے، دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے، لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ پر ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے تو لغویات ہے، البتہ پانچ چھ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی، ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سونا چاہیے، کھانا باہر ہی کھا آئے تھے، بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں، یوں تو ہماری قوت ارادی کافی زبردست ہے، جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر

بھی کیا حرج ہے، ڈرتے ڈرتے آواز دی" لالہ جی!"

انھوں نے پتھر کھینچ مارا۔ "بس"!

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں، تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں، کل ذرا مجھے چھ بجے، یعنی جس وقت چھ بجیں ۔۔۔۔۔۔۔

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا، "جب چھ بج چکیں ۔۔۔۔۔ سنا آپ نے؟"

چپ۔

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔"

ہم نے کہا۔ "ب، ب، ب بہت اچھا، یہ بات ہے۔"

توبہ، خدا کسی کو محتاج نہ کرے!

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں، اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا، ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لو ابھی جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ہی ایک دو منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انھوں نے اس صورت میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات

میں ذرا اختلاف ہے۔ بہر حال اس کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں، پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا اور پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پہلے دیباچہ کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی اور پھر کا نہیں پتا۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا، یا شاید سر کو اس میں لپیٹ لیا، یا شاید کھانسا، کہ خدا جانے خراٹا لیا، یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے، یا شاید سو رہے ہوں، بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے، جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ ہم۔ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو، یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں؟ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو، محض اس شبہے کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا، مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں، ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو حد درجہ کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ آج بھی اور دنوں کی طرح دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی، صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجب چیز پیدا کی ہے، یعنی اگر صبح کے بجائے صبح شام ہو جایا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا؟"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔
"تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا۔" ہاں ہاں، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعے کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علٰحدہ رکھ دیں، کرسی کو چارپائی کے نزدیک سرکا لیا، اور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا، کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے، دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا، تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل ہی میں نہایت ہی نیک ارادہ کرکے سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈ مارننگ" کہا اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا، لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے، دل سے کہا کہ "دل' بھیا، صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے، ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔" دل نے کہا۔" اور نہیں تو کیا، تمھارے یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔" ہم نے کہا" سچ کہتے ہو۔ یار، یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی مجال کیا ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت لاہور میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا اور مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے، اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔

بھی کیا برخوردار اور سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔"

ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے۔۔۔۔ "خوب، تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں، بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے، ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسولؐ کا خوف، سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبرؔ بچارا یہی کہتے کہتے مر گیا، مگر ہمارے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ (لحاف کانوں پر سرک آیا)۔۔۔۔ تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں۔۔۔۔ بہت پہلے۔۔۔۔ کیا بات ہے؟ خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے۔۔۔۔ (لحاف سر پہ)۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے، عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔۔۔۔ (آنکھیں بند)۔۔۔۔ تو اب چھ بجے ہیں، تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے، سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں، شکسپیر یا ورڈز ورتھ؟ میں جانوں شکسپیر بہتر ہوگا، اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر کیا چیز ہو سکتی ہے؟" پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستاں سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں، اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان

میسر ہوگا اور دل و دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے...... لیکن شکسپیر..... نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا...... مگر شکسپیر..... ہیملٹ ...... لیکن ورڈزورتھ..... لیڈی میکبتھ...... دیوانگی.... سبزہ زار..... سنجر سنجر، باد بہاری...... صید ہوس...... کشمیر میں آفت کا پرکالہ ہوں......"

یہ معمّا اب فلسفہ ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے باہر سر نکالا اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو دہی دس بج رہے تھے، اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے۔"

کالج ہال میں لالہ جی ملے، کہنے لگے، مسٹر صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی آپ نے کوئی جواب نہ دیا؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا۔" اوہو لالہ جی! یاد نہیں میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔

بولے۔" وہ تو ٹھیک ہے، لیکن بعد میں...... اس کے بعد...... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ بولے ہی نہیں۔"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا، گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائی اور غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔

پھر یکایک ایک مجوبانہ انداز سے مسکرا کر کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

میں اس وقت ...... اے ...... اے نماز پڑھ رہا تھا۔ لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد و اتقا کی مسکینی میں سر نیچے ڈالے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہ ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا، جاگنا نمبر ایک چھ بجے، جاگنا نمبر دو دس بجے، اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

مزید مطالعہ کے لیے :۔ مضامین پطرس

سوالات

۱۔ کس واقعہ کو مضمون نگار نے اپنی شامت بتایا ہے ؟

۲۔ عدم تشدد کو خیر باد کہنے کا خیال کیسے پیدا ہو ؟

۳۔ "یہ معمّا اب فلسفہ سے ہی تعلق رکھتا ہے" یہاں کس معمّے کی طرف اشارہ ہے ؟

مشقیں

۱۔ ان فقروں اور جملوں کو چھانٹو جن سے مضمون نگار نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔

۲۔ تم نے اب تک تین مزاح نگاروں کے مضامین پڑھے ہیں ان کی تحریر کی خصوصیات پر تبصرہ کرو۔

۳۔ لفظ کی قسمیں تمھیں تفصیل سے معلوم ہیں، جملے کے اقسام سے تم واقف ہو۔ جملے کے الفاظ کا الگ الگ تجزیہ کرنے کو تحلیل کہتے ہیں جیسے تم نیچے درجوں میں پڑھ چکے ہو اور جب جملہ کے اجزا کا تجزیہ کرتے ہیں تو اسے ترکیب نحوی کہتے ہیں۔ ان جملوں کی ترکیب نحوی پر غور کرو اور کچھ جملے لے کر ان کی ترکیب نحوی کرو۔

ا۔ لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔

مسند الیہ (مبتدا)	مسند (خبر)		
	موصوف	تفصیل نفسی صفت	فعل ناقص
لالہ جی	آدمی	بہت شریف	ہیں

جملہ اسمیہ

ب۔ عیدگاہ میں ایک جملہ آیا ہے۔ امینہ نے چھاتی پیٹ لی اس کی ترکیب نحوی اس طرح ہوگی۔

مسند الیہ		مسند	
فاعل	علامت فاعل	مفعول	فعل
امینہ	نے	چھاتی	پیٹ لی

جملہ فعلیہ

مجنوں گورکھپوری

احمد صدیق نام ہے مگر ادب کی دنیا میں مجنوں گورکھپوری کے نام سے اس طرح مشہور ہوئے اُن کا اصل نام کم لوگ جانتے ہیں اور گورکھپوری نام کا جز سا بن گیا ہے سینٹ انڈریوز کالج گورکھپور میں اردو کے پروفیسر رہے اب علی گڑھ میں ہیں۔ مجنوں نے مشرقی علوم کی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے الٰہ آباد گئے۔ وہاں فراق گورکھپوری کی صحبت اور مغربی ادبیات کے مطالعہ نے اُن کی شخصیت پر گہرے اثر ڈالے

۔ ادب میں ان کا مخصوص رنگ ہے۔ افسانہ ہو یا تنقید، خطوط ہوں یا ادبی مضامین مجنوں کا طرز بیان کسی دوسرے ادیب سے میل نہیں کھاتا۔ ان کا نظریہ حیات خیال افروز طرز استدلال اور زور بیان ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔ وسیع مطالعہ کی چھاپ ہونے کی وجہ سے ان کے مضامین میں گہرائی بھی ہوتی ہے اور گیرائی بھی۔

افسانہ نگاری میں انھوں نے انگریزی کے مشہور افسانہ نگار ٹامس ہارڈی سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ ان کے افسانے بیشتر المیہ فضا پیدا کرتے ہیں اور ان میں خیر و شر جبر و اختیار اور زندگی و موت کے متعلق سوالات پر ان کے خیالات بکھرے رہتے ہیں۔

افسانہ نگاری کے بعد ان کی شہرت تنقید کے میدان میں ہوئی۔ انھوں نے اردو کے دامن کو مغربی اصول تنقید سے مالا مال کیا اور مختلف نظریات کی وضاحت بڑی خوبی سے کی۔

ان کا رجحان ترقی پسندی کی طرف مائل ہے ان کی تنقیدوں میں دھار ہوتی ہے ان میں وہ اعتدال، توازن اور مصلحت آمیزی نہیں ہوتی جو آل احمد سرور کے یہاں ملتی ہے۔

مجنوں نے مختلف موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔
افسانوں کے مجموعے خواب و خیال اور سمن پوش مشہور ہیں تنقیدی مقالات، ادب اور زندگی' اور تنقیدی حاشیے کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

جگر صاحب میرے یہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اول یہ کہ جگر صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی اس لیے اپنے عزیز ڈاکٹروں کو بلواتا ہوں جو ان کا مکمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگر صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگر صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے، چادر، غلاف، تولیہ کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلواکر کپڑے اس کے حوالہ کردوں گا۔

تیسرے یہ کہ جگر صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لیے نائی بلاؤں گا تاکہ وہ جگر صاحب کو نوک پلک سے درست کردے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگر صاحب کے عشاق ان کو علی گڈھ میں گھسیٹتے نہ پھریں اور میرے یہاں نہ اپنا کلام ان کو سنائیں اور نہ ان کا کلام خود سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کرلیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپیہ اس طرح خرچ نہ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگر صاحب جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لیے نہیں موجود ہوتا اس لیے کہ جگر صاحب کچھ اس گداز قلب کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کو میری زندگی کا بھروسا ہے نہ اپنی زندگی کا۔ اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

تنقیدی میلانات

(یہ مضمون مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مضامین "ادب اور زندگی" سے لیا گیا ہے۔ اس دور میں سیاسی نظریوں کے تصادم کے اثر سے ادب میں بھی مختلف نظریے قائم ہو گئے ہیں۔ اس مضمون میں ان نظریوں سے بحث کر کے ادب و تنقید کا ایک جامع تصور پیش کیا گیا ہے۔ اصل مضمون سے تمام مشکل حصے حذف کر دیے گئے ہیں)

ادب آئینہ ہے زندگی کا۔ اب یہ سوال ہوتا ہے کہ ادب کی صحیح تعریف کیا ہے؟ زندگی اور ادب میں جو تعلق ہے وہ کس قسم کا ہے اور ادب اور زندگی میں امتیاز کیا ہے؟ کیا ادب کے معنی صرف زندگی کی تکرار یا نقل کے ہیں؟ اگر زندگی کے محض اعادہ یا مثنیٰ کو ادب کہتے ہیں، تو پھر اصل اور اس مثنیٰ میں کیا فرق ہے؟ اور اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے؟

ادب یا حسن کاری اگر زندگی کی محض ایک سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک فعل عبث ہے جو زیادہ سے زیادہ تفریح کا ذریعہ بن سکتا ہے اور افلاطون نے اگر اس کو اپنی جمہوریت سے خارج کر دیا تو بہت ٹھیک کیا۔ لیکن دوسروں کے فیصلے سے مرعوب ہو کر بہک جانا خطرے سے خالی نہیں۔ جمالیات (AESTHETICS) کے جتنے نظریے مختلف زمانوں میں مرتب کیے گئے ہیں ان پر ہم کو غور کرنا چاہیے اور تحقیق و تنقید کے بعد خود اپنی رائے قائم کرنا چاہیے۔

تنقید کا ایک معصومانہ دور وہ بھی تھا جب کہ بلا شرح و تفصیل اور

بغیر فکر و استدلال کے ایک چیز کے موافق یا اس کے مخالف ایک حکم لگا دیا جاتا تھا اور لوگ اس کو مان لیتے تھے۔ مثلاً شاعری کو پیغمبری کا ایک جزو بتا دیا گیا اور شاعر قلم بند رحمٰن مان لیا گیا، یا اسی شاعر کو شیطان کا شاگرد سمجھ لیا گیا لیکن اب اس قسم کی الہامی تعریف سے کام نہیں چلتا۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ فنون لطیفہ اور بالخصوص ادبیات تمام تشریح و تجزیہ کے بعد بھی اپنا پورا راز ہم پر روشن نہیں ہونے دیتے اور الہامی دنیا کی چیزیں بنے رہتے ہیں۔ انیسویں صدی یورپ میں تنقید ادب کا دور رہا ہے اور اس صدی میں شعر و ادب کی طرح طرح سے تعریفیں کی گئی ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ شعر و ادب کو علم و حکمت کے برابر لاکر کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن اس کے لیے جس جنچے تُلے طرز استدلال کی ضرورت تھی وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ سب مجذوبوں کی باتیں کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ادب کی جس نے معقول تعریف کی اور ادب اور زندگی میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی وہ میتھو آرنلڈ تھا ادب کی جو اس نے تعریف کی ہے وہ آج تک ضرب المثل ہے۔ اس نے ادب کو زندگی کی تنقید بتایا تھا۔ یہ تعریف اگرچہ مبہم ہے لیکن ہے بہت گہری اور اس جدید میلان کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس نے اسی زمانے میں کارل مارکس سے اشتراکی اعلان لکھوایا۔

اسی زمانے میں "حسن کاری برائے حسن کاری"، "یا ادب برائے ادب" کا خالص جمالیاتی نظریہ وجود میں آیا جس کی ابتدا کیٹس سے ہوتی ہے۔ کیٹس کو ایسی شاعری سے نفرت تھی جو کوئی محسوس غایت یا کوئی خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہو۔ اس کے لیے حسین چیز بجائے خود ایک ابدی

مسرت تھی وہ کہتا ہے کہ "حسن حقیقت ہے اور حقیقت حسن۔ بس اتنی ہی بات ہے اور ہم کو اسی قدر جاننے کی ضرورت ہے" اس کے بعد یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے اس خیال کی حمایت اور اشاعت کی۔ سب نے ایک آواز ہو کر یہی کہا کہ حسن مقصود بالذات ہے اور نیکی اور بدی کے حدود سے بالکل باہر ہے۔ شعر و ادب کا کام ہمارے اندر حسن کا احساس پیدا کرنا اور اس کو قائم رکھنا ہے۔ یہ احساس حسن ہماری ابدی مسرت کی ضمانت ہے۔ زندگی میں جتنی کریہ اور بدصورت چیزیں ہیں ان کو بھی حسین بنائے رہنے کا نام "حسن کاری" ہے۔

یہ خالص تخیلیت (IDEALISM) انسانی معاشرت کے لیے خطرات سے خالی نہیں۔ بدی کو نیکی، جھوٹ کو سچ، بدصورتی کو حسن، غم کو راحت بنانے کی عادت جب ضرورت سے زیادہ پڑ جاتی ہے تو بیماری ہو جاتی ہے اور انسان اس کے ہاتھوں کاہلی، تعیش اور مجہولیت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تخیلیت نے اگر دنیائے واقعات سے منہ پھیر لیا تو وہ دنیائے انسانیت کی تہذیب و تحسین میں کوئی حصہ نہ لے سکے گی اور ایک قسم کا فالج یا جنون بن کر رہ جائے گی۔ دنیا کو اس فالج یا جنون سے محفوظ رکھنا ہے۔

تخیلیت یا رومانیت انسانی تمدن کو جس خطرے کی طرف لے جا رہی تھی اس کا احساس ہونے لگا اور دھیرے دھیرے یہ احساس ساری دنیا پر چھا گیا۔ سب سے پہلے مارکس اور اینگلز نے ہم کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ حسن کاری اور ادب ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن کی خدمت میں آلۂ نشر و تبلیغ ہوتے ہیں اور چوں کہ تہذیب و تمدن کا اجارہ اب تک طبقۂ اعلیٰ یا سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہا اس لیے ہمارے ادیب اور شاعر اب تک جس تہذیب کی نمائندگی

کر رہے تھے وہ اقلیت کی تہذیب تھی اور صرف ایک کم تعداد، فراغت نصیب جماعت کی پیدا کی ہوئی چیز تھی جس کو جمہور کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب چوں کہ تمدن کی دنیا میں شدید انقلاب کی ضرورت ہے اور سرمایہ داری کی سر بہ فلک عمارت منہدم ہورہی ہے اور اس کی جگہ جمہوریت اور مزدور شاہی کی نئی تعمیر لے رہی ہے اس لیے ادب کے رسوم و روایات میں بھی انقلاب کی ضرورت ہے۔ اب تک ادیب سرمایہ داری کی عشرت گاہ کا مزدور تھا اور چیدہ جماعت کے حرکات و سکنات اور اس کے نفسیات و میلانات اس کی کل کائنات تھی، اس لیے ضروری ہے کہ واقعہ کو تخئیل پر ترجیح دیں اور مادی دنیا پر اپنی نظر جمائے رہیں ورنہ ہم جمہور کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔

مارکس کے بعد اس کے شاگرد اس نظریے کو اتنی دور لے گئے کہ اس کا اصل مقصد کچھ سے کچھ ہوگیا۔ آج اشتراکیت، ادب سے جو مطالبات کر رہی ہے وہ ادب کو ادب نہیں رہنے دے گی۔ اب ادب کو بھی جماعت کا ایک آلۂ جنگ سمجھنے کی تحریک ہورہی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں خارکاف کے مقام پر جو اشتراکی کانگریس ہوئی تھی اس میں ایک مقرر نے کہا تھا: "قلم بہ کف ہم لوگ بین الاقوامی مزدوروں کی جماعت کی ناقابل شکست فوج کے سپاہی ہیں۔" اس کانگریس میں جو باتیں طے پائی تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے (۱) حسن کاری جماعت کا ایک ہتھیار ہے (۲) حسن کاروں اور ادیبوں کو انفرادیت ترک کر دینا چاہیے (۳) جمالیات کی اجتماعی تنظیم ہونا چاہیے اور اس کو فوج اور دفاتر کی طرح ایک مرکزی سرکار اور مرکزی قوانین کے ماتحت ہونا چاہیے اور یہ سب اشتراکی جماعت کے ماتحت انجام پائے گا۔

آپ نے سنا؟ اشتراکیت، سپاہیوں کی طرح اپنے ادیبوں اور شاعروں کو

بھی سرخ وردی پہنانا چاہتی ہے، اس لیے کہ ان سے بھی قواعد لی جائے گی۔ لیکن یہ ہونا تھا۔ فرعون اور موسٰی دنیا میں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ خالص جمالیت (AESTHETICISM) نے جو افراط کی تھی اس کا جواب اسی تفریط سے دیا جاسکتا ہے۔ "ادب برائے ادب" کے نظریے نے ادب کو محض ایک من کی موج اور امیروں کے لیے ایک تفریح کی چیز بنا کر رکھ دیا تھا۔ لوگ دنیا میں رہ کر دنیا سے بیگانہ ہو رہے تھے۔ ایک مشہور روسی ادیب کا خیال بہت صحیح ہے کہ "ادب برائے ادب" کا میلان اس بات کی دلیل ہے کہ ادیب اور اس کے ماحول کے درمیان تصادم ہے۔ مادی دنیا سے انسان اس وقت بھاگتا ہے جب کہ وہ مشکلات کا سامنا کرنے کی تاب اپنے اندر نہیں پاتا۔ خالص جمالیت کے حامیوں نے ایک پرانی مثل سے بہت غلط فائدہ اٹھایا اور اس کی تاویل میں بڑی زبردستی کی۔ کہا گیا ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہے گا۔ اس میں سب سے اہم لفظ "صرف" ہے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں تھے کہ انسان بغیر روٹی کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ادب بھی ایک جدلیاتی حرکت ہے اور اس کے بھی دو متضاد رخ ہیں۔ ایک تو خارجی یا عملی یا افادی۔ دوسرا داخلی یا تخیلی یا جمالیاتی۔ حسن کار یا ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ ان دو بظاہر متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قائم کیے رہے۔ ورنہ ان میں سے جہاں ایک کا پلہ بھاری ہوا وہیں فساد و انتشار پیدا ہونے لگے گا۔ مارکس نے جو کچھ کہا تھا اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ادیب کو زمانے کے پیچھے نہ ہونا چاہیے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ ادیب زمانے کا غلام ہے۔ ادب حال کا آئینہ دار ضرور ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مستقبل کا اشاریہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے بہ یک وقت واقعیت اور تخئیلیت،

افادیت اور جمالیت، اجتماعیت اور انفرادیت سب کی ضرورت ہے۔ ماحول ادیب کو پیدا کرتا ہے مگر ادیب ماحول کی از سر نو تعمیر میں مدد کرتا ہے۔ ادیب بہ یک وقت حال کی آواز اور مستقبل کی بشارت ہے۔ سب سے بڑا ادیب وہ ہے جو حال اور مستقبل کو ایک آہنگ بنا کر پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے ادیب اور شاعر گذرے ہیں وہ سب واقعات کی کثیف دنیا میں گردن تک ڈوبے کھڑے ہیں مگر ان کے ہاتھ ستاروں کو پکڑنے کے لیے آسمان کی طرف بڑھے ہوئے ہیں۔

ادب ایک آلۂ نشر و اشاعت ایک ذریعۂ تحریک و تبلیغ ضرور ہے لیکن ہر ایسا آلہ اور ہر ایسا ذریعہ ادب نہیں ہوتا۔ اخباروں سے بڑھ کر نشر و اشاعت اور تحریک و تبلیغ کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے مگر اخباروں کو ادب میں شمار کرنے کی جرأت انقلابی تنقید بھی مشکل ہی سے کر سکی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اخبارات میں سوا روح عصر کے کچھ نہیں ہوتا اور ادب میں علاوہ "روح عصر" کے بھی ایک عنصر ہوتا ہے جس کا تعلق ماورائے عصر سے ہوتا ہے اور جس کی بہ دولت وہ ادب ہر زمانے کی چیز بن جاتا ہے۔

میتھو آرنلڈ نے ادب کو جو زندگی کی تنقید کہا تھا اس کا مطلب یہی تھا۔ ادب جماعت اور افراد کی زندگی کی نہ صرف تصویر ہے بلکہ اس کی تنقید ہے اور مارکس کے نظریے کا مطلب بھی اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اس کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ فلسفہ اور ادب دونوں صدیوں تک دنیا کی یا تو بجنسہ تصویریں پیش کرتے رہے ہیں یا اس کی تاویلیں کرتے رہے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور اس کو بدلا جائے اور بہتر سے بہتر بنایا جائے۔

لیکن اگر ادب زندگی کی تنقید ہے تو وہ محض حال پر بھی نہیں اکتفا کر سکتا۔ تنقید کا مقصد ہمیشہ نئی تعمیر کا ہوتا ہے اور نئی تعمیر کے لیے ہمیشہ ایک استقبالی میلان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا دوسرا نام تخئیل ہے۔ کام یاب ادب قدما کے نزدیک بھی دو متضاد عنصروں سے مرکب ہے۔ محاکات اور تخئیل۔ محاکات کا تعلق حال سے ہوتا ہے اور تخئیل کا تعلق مستقبل سے۔ واقعہ کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک تو واقعی یا ساکن اور دوسرا امکانی یا متحرک اور ادیب کی بصیرت ان دونوں کو ایک کر دیتی ہے۔ گویا خواب اور حقیقت کے امتزاج کا نام ادب ہے۔

مارکس کے نظریے پر تبصرہ کرتے وقت ہم کو ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ اس وقت پیدا ہوا جب کہ حکما کائنات کا مرکز مادی سطح سے ایک دم ہٹا کر روحانی سطح پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ مادے سے انکار کر رہے تھے اور صرف ایک جوہر اعلیٰ یا روح کو اصل حقیقت مانتے تھے۔ مارکس کی مادیت اس تعلیم کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ زندگی کی ابتدا تصور سے نہیں بلکہ وجود سے ہوتی ہے اور اس کی بنیاد مادی قوتوں پر ہے۔ ہیئت اجتماعی میں آکر یہ مادی قوتیں زیادہ تر اقتصادی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زندگی کے اقتصادی پہلو پر مارکس نے جو زور دیا وہ ایک خالص عصری چیز ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب اقتصادیات کی غلامانہ پیروی کرتا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اقتصادیات کل زندگی نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ایک عنصر ہے جو لاکھ اہم سہی لیکن کسی دوسرے عنصر پر غالب نہیں ہو سکتا۔ یہ سچ ہے کہ بغیر روٹی کے کوئی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن پھر وہ صدیوں پرانی مثل بھی آج تک بہ دستور ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا۔

آخر میں دو سوالات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ادب میں انفرادیت کی گنجائش ہے یا نہیں ؟ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ حسن کار (ARTIST) کو اپنی شخصیت قربان کر دینا چاہیے۔ دوسروں کی رائے ہے کہ نہیں۔ حسن کار کی اپنی شخصیت اگر اس کے کام میں نہیں جھلکتی تو یہ شدید نقص ہے۔ اگر غور کیا جائے تو در پردہ یہ سوال پہلے ہی حل کیا جا چکا ہے۔ ادب یا حسن کاری کے دو متضاد پہلو بتائے گئے ہیں ایک تو میلاناتی دوسرا جمالیاتی۔ جہاں تک ادب میلاناتی ہے وہاں تک اس کا تعلق اجتماعی ذہنیت اور معاشری میلانات سے ہے۔ لیکن اس کا جمالیاتی پہلو یقیناً ادیب کی انفرادیت کا ممنون ہوتا ہے۔ آخر اس کا کیا سبب کہ ایک ہی ملک، ایک ہی زبان اور ایک ہی معاشرتی دور کے دو مختلف شاعروں کے کلام اس قدر مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح دوسرا سوال بھی ایک ضمنی سوال ہے یعنی یہ کہ ادب میں صورت اور اسلوب زیادہ ضروری ہیں یا موضوع اور مواد؟ موضوع اور مواد معاشرتی میلانات سے ملتے ہیں اور ادب کے خارجی یا اجتماعی عناصر ہوتے ہیں۔ صورت اور اسلوب کو ادیب کی انفرادیت مہیّا کرتی ہے اور وہ ادب کے جمالیاتی عناصر ہوتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ادیب کی انفرادیت خود معاشری حالات اور اجتماعی میلانات کی ساختہ و پرداختہ ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے لیکن پھر یہ انفرادیت، معاشرت اور ہیئت اجتماعی پر بھی اپنا اثر ڈالتی ہے۔ انفرادی مزاج اور اجتماعی میلانات، عمل اور ردّ عمل کا

ایک ایسا باہم مربوط سلسلہ ہے جس کو کہیں سے توڑا نہیں جا سکتا۔

مختصر یہ کہ کام یاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو، جس میں واقعیت اور تخیلیت، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اب اس کو یہی ہونا ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے:۔ تاریخ اور تنقید ادبیات اردو — حامد حسن قادری
ادب اور زندگی — از مجنوں گورکھپوری

سوالات

۱۔ ادب کی صحیح تعریف کیا ہے؟
۲۔ خالص تخیلیت سے انسانی معاشرت کے لیے کیا خطرات پیدا ہوئے؟
۳۔ ادب کے بارے میں مارکسی نظریہ کیا ہے؟

مشقیں

۱۔ ادب کے بارے میں اس مضمون میں جن نظریات سے بحث کی گئی ہے ان کی وضاحت کرو۔
۲۔ مجنوں گورکھپوری اور آل احمد سرور کے طرز تنقید کا مقابلہ آزاد، حالی اور شبلی کے طرز تنقید سے کرو
۳۔ مرکبات ذیل کی تشریح کرو۔
حسن کاری، فنون لطیفہ، مقصود بالذات، ہیئت اجتماعی، جدلیاتی حرکت، آئینہ دار، آلہ نشر و اشاعت، متضاد رخ، عصری چیز ذوق حسن اور ذوق عمل۔
۴۔ ان جملوں میں غور کرو کون جملہ اسمیہ ہے اور کون فعلیہ، اور ان کی ترکیب نحوی کرو۔

وہ میتھو آرنلڈ تھا۔ سب مجذوبوں کی باتیں کرتے ہیں۔
وہ آج تک ضرب المثل ہے۔ یہ احساس ساری دنیا پر چھا گیا۔ وہ اقلیت کی تہذیب تھی۔ تمدن کی دنیا میں شدید انقلاب کی ضرورت ہے۔ حسن کاری جماعت کا ایک ہتھیار ہے۔

منشی جی ۔ (بھرّائی ہوئی آواز میں) غور سے پڑھو سلیم ۔
بیوی ۔ ہائے یہ میری رضو کے مرنے کا تار ہے ۔

[روتی ہے]



سلیم ۔ بھابی جان صبر کیجیے ۔
منشی جی ۔ لوگو میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں ۔ ارے مجھے پکڑو ۔

مشقیں

۱۔ جس طرح شوکت تھانوی نے ہلکے پھلکے انداز میں قلمی تصویر (اسکیچ) پیش کیے ہیں، اسی طرح تم بھی چھوٹے اسکیچ لکھنے کی کوشش کرو۔

۲۔ لاٹری کے ٹکٹ کا خلاصہ پہلے منشی جی کی بیوی اور پھر سلیم کی زبانی بیان کرو۔

۳۔ منشی جی۔ لینا سلیم میاں۔ دیکھو، رقم کتنی ہے؟

کدھر گیا میرا چشمہ؟

سلیم۔ ارے!

منشی جی۔ کیوں، کیا بات ہے؟

ان جملوں میں جو اوقاف استعمال ہوئے ہیں ان پر غور کرو۔ اوقاف کے مناسب استعمال سے جملہ کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ پہلے ان کا رواج نہ تھا۔ اب انگریزی کے اثر سے ان کا استعمال زیادہ ہونے لگا ہے۔ اہم اوقاف کے نشانات یہ ہیں۔

، سکتہ، ہلکے وقفہ کے لیے۔ ۔ خاتمہ، پورے وقفہ کے لیے۔

؟ سوالیہ ! فجائیہ " " واوین۔ مقولہ درج کرنے کے لیے۔

( ) قوسین، تحریر میں آئے ہوئے کسی امر کو واضح کرنے کے لیے۔

:۔ تفصیلیہ، تفصیل ظاہر کرنے کے لیے۔

^ سہویہ۔ چھوٹے ہوئے لفظ یا عبارت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جو بعد میں لکھی گئی ہو۔

منشی جی۔ لینا سلیم میاں۔ دیکھو رقم کتنی ہے کدھر گیا میرا چشمہ
سلیم۔ ارے
منشی جی۔ کیوں کیوں کیا بات ہے؟
سلیم۔ محمود بھائی کا تار ہے، کل شام بھابی جان نے انتقال فرمایا۔
منشی جی۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) غور سے پڑھو سلیم۔
ہائے یہ میری رضو کے مرنے کا تار ہے۔

[روتی ہے]

سلیم۔ بھابی جان صبر کیجیے۔
منشی جی۔ لوگو میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں۔ ارے مجھے
پکڑو رگر پڑتا ہے

آل احمد سرور

سرور صاحب اس وقت [redacted] یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ان کا شمار نئی نسل کے مشہور ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید نگاری کا اپنا ایک مخصوص طرز ہے۔ ان کے خیالات میں انتہا پسندی اور افراط و تفریط نہیں ہوتی۔ ان میں توازن، اعتدال اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ انداز بیان صاف سلجھا ہوا اور خیال آفریں ہوتا ہے۔ طرز نگارش پر حالی اور اقبال کا بہت گہرا اثر ہے۔ وہ شعر و ادب کا تجزیہ کرتے وقت انگریزی ادب اور اردو کی قدیم ادبی روایات سے بے حد کام لیتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ترقی پسندی کے خلاف اور قدامت پرستی کے قائل ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے چار مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں "تنقیدی اشارے"، "نئے اور پرانے چراغ" بہت مشہور ہوئے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اس بات کی شاہد [illegible] ادبی حلقوں نے ان کے طرز نگارش اور تنقیدی نظریات کی پذیرائی کی ہے۔

شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ اردو ادب ابھی آپ سے بہت سی امیدیں لگائے ہوئے ہیں۔

ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ

(یہ مضمون ان کی کتاب "تنقیدی اشارے" سے ماخوذ ہے۔ طلبہ

کے معیار کا خیال رکھتے ہوئے کچھ حصے حذف کر دیے گئے ہیں۔ اس مضمون سے تنقید کے نئے طرز کا اندازہ ہوگا)

اردو ادب میں حالی کا کیا درجہ ہے۔ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ حالی کے کارنامے بہت ہیں اور ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نثار بھی، نقاد بھی اور صاحب طرز بھی، وہ صرف مسدس ہی کے شاعر نہیں، انھوں نے اور بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ وہ غزل کے خلاف ہیں، لیکن ان کی بہت سی غزلیں اردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ ان غزلوں میں ہجر اور وصل بھی ہے اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی مگر صرف یہی نہیں، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ ان کی نظموں اور رباعیوں میں اخلاقی تعلیم اور اصلاحی پیغام ہے مگر تاثیر اور شیرینی بھی کم نہیں۔ وہ واعظ بھی ہیں اور مصلح بھی، ناصح بھی اور حکیم بھی مگر دراصل وہ شاعر ہیں۔ اسے غالبؔ نے بھی تسلیم کیا تھا اور آج بھی ہر صاحب فہم مانتا ہے۔

نثر میں ان کے کارنامے کچھ کم روشن نہیں۔ وہ تین بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں جو اردو ادب میں کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید سوانح عمریاں بھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔ ان کے علاوہ حالی نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ اپنی نظموں پر دیباچے اور اپنے دیوان پر مقدمے تحریر کیے ہیں، تقریریں کی ہیں، مقالے پڑھے ہیں، دوستوں اور رشتہ داروں کو خط لکھے ہیں اور آج یہ سب چیزیں ارباب نظر

کی آنکھوں کا سرمہ ہیں۔

انھوں نے مقدمۂ شعر و شاعری کے ذریعہ اردو میں تنقید کی بنیاد ڈالی۔ شعر و شاعری کے متعلق ایک مکمل اور حیات آفریں نظریہ مرتب کیا۔ پھر اس نظریے کی روشنی میں اردو شاعری پر تبصرہ کیا۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی پر علیحدہ علیحدہ ناقدانہ نظر ڈالی۔ ہماری تنقید کے جو سانچے ہیں وہ حالیؔ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہم جن چیزوں پر آج زور دیتے ہیں ان کی طرف سب سے پہلے حالی نے اپنے مقدمہ میں توجہ دلائی تھی۔ انھوں نے اسلوب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے جتنے رفیق اور ہم عصر تھے سب صاحب طرز تھے لیکن زندگی صرف حالیؔ کے طرز کو نصیب ہوئی باقی یا تو ختم ہو گئے یا ان کی کارفرمائی محدود ہو گئی۔ آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زور بیان، سرسید کی سادگی، شبلی کی رنگینی سب اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آج کا رجحان کیا ہے؟ یہ بتانے کی ضرورت ہے؟ حالیؔ نے ہوش سنبھالا تو ہمارا ادب ایک خاص منزل پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ شاعری چونکہ آزاد کے الفاظ میں "فارسی کے پروں سے اڑتی تھی" اس لیے اس میں ویسی ہی باتیں آ گئی تھیں جس ماں کا اس نے دودھ پیا تھا اس کی خاصیت پیدا ہو چلی تھی۔ روشنی تھی گرمی نہ تھی، حسن تھا، تندرستی نہ تھی، بلند آہنگ نغمے تھے، مگر اس میں تاثیر ناپید، نقالی عام تھی، ایجاد کو پسند کرنے والے کم تھے۔ ذوقؔ، غالبؔ سے بہتر شاعر سمجھے جاتے تھے، محاورہ کی خاطر شعر کہا جاتا تھا، شاعری صرف غزل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، نثر اگرچہ نظم سے کم عمر تھی مگر اس میں صحیح و صالح رنگ پیدا ہو چلا تھا۔

سرسید کی ابتدائی تصانیف اور غالبؔ کے خطوط میں عام رنگ کے خلاف صاف اور سادہ زبان استعمال کی گئی تھی۔ حالیؔ "غالبؔ کے معتقد اور میرؔ کے مقلد اور شیفتہؔ سے مستفید تھے"۔ غالبؔ کی شاعری سے متاثر نہ ہوئے ان کی نثر سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے مسدس سے پہلے جو کچھ لکھا اس کی اہمیت عام طور نظرانداز کی جاتی ہے۔ غالب اور شیفتہؔ کی صحبت، عرب شعرا کا مطالعہ اور خود شاعر کی سادگی اور دردمندی، ان سب باتوں کی وجہ سے حالیؔ کی غزلوں میں بھی بہت سے نشتر موجود ہیں۔ ان کی جوانی داغؔ و مومنؔ کی طرح دیوانی نہ تھی مگر اس میں جوانی کی ساری امنگ اور ترنگ موجود ہے۔ ان کی غزلوں کے چند شعر دیکھیے، ان میں سادگی ہے، مگر حسن اور شیرینی بھی، الفاظ دھیمے ہیں مگر وہ کسک اور کھٹک ہے جو نشتر میں ہوتی ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت　　نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل　　کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب　　بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اور جو لوگ انھیں صرف رونے اور بسورنے والا شاعر سمجھے ہیں وہ ذرا یہ اشعار سنیں۔

اک بزرگ آئے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار

یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے

غرض حالی نے جب لاہور کے مشاعروں میں برکھا رت اور حب وطن کا راگ گایا تو اس وجہ سے نہیں کہ انھیں غزل کہنا نہ آتی تھی اور نہ اس وجہ سے کہ وہ غزل سے بے زار تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ شاعری کو صرف غزل نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ اسے اتنا وسیع کرنا چاہتے تھے کہ وہ آفاقی ہو جائے۔ وہ بعد میں بھی غزلیں لکھتے رہے اور ان سے وہ تمام کام لیتے رہے جو نظموں سے لیتے تھے لیکن ان کی توجہ نظم پر رہی۔ برکھا رت اور حب وطن سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راگ بالکل نیا تو نہ تھا کیوں کہ اس سے پہلے نظیر اکبرآبادی بھی اسے الاپ چکے تھے مگر ان کی آواز کسی نے نہ سنی تھی۔ حالی نے جب یہ نغمہ چھیڑا تو اس کا اثر ہوا اور ان کی اور آزاد کی کوششوں سے مقامی رنگ، منظر نگاری، وطن کی محبت اردو شاعری میں اپنی بہار دکھانے لگی۔ لاہور سے واپسی پر سرسید سے ملاقات ہوئی اور بہت جلد سرسید کی اصلاحی تحریک کے روح رواں بن گئے۔

مسدس سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی اور سرسید اسے اپنی نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے

مسلمانوں کو بھی پستی سے نجات ملی۔ یہ نظم اپنے طرز کی انوکھی اور نئی ہے اور اس کی مقبولیت اس کی خوبی کی دلیل ہے۔ اس میں حالیؔ نے اپنی قوم کا مرثیہ لکھا ہے۔

مسدس کے بعد حالیؔ نے بہت سی نظمیں لکھیں، ان میں سے شکوہ ہند، مناجات بیوہ اور چپ کی داد زیادہ مشہور ہیں۔ حالیؔ کی شاعری کا مقصد قوم کو خیال بندی اور خیال آرائی کی دنیا سے نکال کر حال کی دنیا میں لانا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شاعر کا مقصد کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں کہیں پستی اور جہالت دیکھی، تو قوم کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ خصوصاً چپ کی داد میں حالیؔ نے عورتوں کی عظمت اور اہمیت کو جو قدامت اور رواج پر قربان ہو چکی تھی پھر زندہ کیا۔ اس نظم کا آغاز کس قدر غیر شاعرانہ ہے مگر آگے چل کر شاعر کی دیوی سارے مصنوعی زیور اتار کر صرف اپنی معصومیت اور سادگی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ بقول فراقؔ کے "اس کے سکوت میں لہریں ہیں اور لہروں میں سکوت"۔ مناجات بیوہ میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی بے مثل انداز میں کی گئی ہے۔ زبان وہ ہے جو شہری اور دیہاتی امیر غریب، عالم اور عامی سب سمجھ لیں۔ انداز وہ ہے کہ ہر لفظ دل میں بیٹھتا چلا جائے، لہجہ وہ ہے جو کہیں ناصحانہ نہیں ہونے پاتا، حالاں کہ اس میں حالیؔ دنیا کی محبت کو خدا کی محبت میں محو کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا

ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے

اسی کے متعلق مولوی عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اگر اس بدقسمت ملک کی ایک زبان ہوئی تو وہ مناجات بیوہ کی زبان ہوگی۔ حالیؔ کی رباعیات میں ناصحانہ انداز کہیں کہیں زیادہ ہے لیکن کام کی بات ضرور بیان کی گئی ہے۔ نثر میں جو کتابیں حالیؔ نے لکھی ہیں وہ پہلے سوانح نگاری، پھر تنقید کے ماتحت آتی ہیں۔ حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب دونوں میں سوانح بھی ہیں اور تنقید بھی حیاتِ جاوید جو سب کے بعد اور سب سے زیادہ مکمل ہے صرف سوانح سے متعلق ہے۔ زندگی کے حالات بیان کرنے پر حالیؔ کبھی بہت زیادہ زور نہیں دیتے۔ تینوں کتابوں میں بہت کم صفحے حالات کی نذر کئے گئے ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ شخصیت اور اس کے کارنامے نمایاں کرنے پر رہتی ہے۔

غالبؔ کی شاعری اپنے زمانے میں خواص ہی میں مقبول رہی۔ عوام تک اسے پہنچانے اور غالب کی عظمت کا نقش ہر دل میں بٹھانے میں یادگار کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال ہے۔ وہ نہ بجنوری کی طرح غالبؔ کو آسمان پہ بٹھا دیتے ہیں۔ نہ لطیفؔ کی طرح ان پر غیر ہم آہنگی کا الزام لگاتے

ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کی جو جو خصوصیات گنائی ہیں وہ سب اپنی جگہ صحیح ہیں اور تمام نقادوں حتیٰ کہ اکرام کا بھی فیصلہ ہے کہ غالبؔ کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید یادگار میں ملتی ہے۔ انھوں نے غالبؔ کے مشکل اشعار کی شرح کر کے غالبؔ کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے اور فارسی کے بعض شعرا سے ان کا موازنہ یک طرفہ نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے۔ غالبؔ کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھیں حالیؔ جیسا سوانح نگار اور نقاد ملا۔

مگر حیات جاوید ان دونوں کتابوں سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آگئی ہے۔

حالیؔ نے تمام مواد سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہم دردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالیؔ کے یہاں یہ چیز موجود ہے۔ حیات جاوید اتنی مقبول نہیں ہوئی جتنی کہ یادگار غالب۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کی شخصیت سرسید کی شخصیت سے زیادہ دل چسپ ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں حالیؔ نے شعر کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ ان کی شاعری میں پوری طرح پائی جاتی ہیں۔ سادگی، اصلیت اور جوش ان تینوں کی ضرورت حالیؔ نے بڑے دل نشیں انداز سے سمجھائی ہے۔ پھر اس معیار پر انھوں نے اردو شاعری کو پرکھا ہے۔ غزل کے خلاف انھوں نے بڑے بڑے اعتراضات کیے ہیں اور بہت سے اشخاص اسی وجہ سے ان کے خلاف ہیں۔ مگر دراصل ان کا اعتراض لکھنؤ اسکول

پر ہے جس نے شاعری کو غزل میں اور غزل کو رعایت لفظی اور نازک خیالی میں محدود کر دیا۔ انھوں نے قدما کی اس وجہ سے تعریف کی ہے کہ وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں بلکہ دل کی بات سنا کر انسان کو مسحور کرتے ہیں۔ قصیدے سے چوں کہ مبالغہ، جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کو ترقی ہوتی ہے اور ان سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے اس لئے حالؔی اس کی مذمت کرتے ہیں اور مرثیہ اور مثنوی نے چوں کہ اردو شاعری میں رزمیہ بزمیہ دونوں رنگ پیدا کیے اس لئے انھیں سراہتے ہیں۔

غرض وہ شاعری کو شخصی اور صنعتی کوچوں سے نکال کر زندگی سے قریب لانا چاہتے ہیں۔ ان کی تنقید سے رہ نمائی اور اصلاح دونوں کام انجام پاتے ہیں۔ وہ اس مے کدے میں جہاں شراب کا دور ختم ہو چکا تھا نگمہ ہائے ہو جاری تھی جا کر ہوشیاری کا پیغام سناتے ہیں۔ آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں بلکہ اخلاق کی خاطر، زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی خاطر، اسے حرکت، بلندی اور عظمت پیدا کرنے کی خاطر چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جو آسان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ حالؔی سے پہلے ادب ایک خاص طبقے کے لیے تھا، اسی طبقہ کے لئے وہ نغمۂ شادی اور نوحۂ غم کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں غدر کے بعد یہ بساط الٹی۔ جماعت کا مفہوم وسیع ہوا۔ انفرادیت کے بجائے قومی نقطۂ نظر آیا۔ اس وقت

لکھنے والوں کو یہ خیال ہوا کہ بات اسی زبان میں ہو جو سب سمجھیں، جس میں قابلیت کا زور اور انشا پردازی کی شان نہ ہو، بلکہ خلوص کی جھلک اور ایک بڑے مقصد کی چاشنی ہو۔ سرسید کی نثر اور حالیؔ کی شاعری سے یہ مقصد پورا ہوا۔ خیالی طوطا مینا بنانے کے بجائے کام کی بات پر زور دیا گیا۔

ادب سے زندگی کے مسائل حل کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنانے کا کام لیا جانے لگا۔ مہدی کا قول ہے کہ "اگر سرسید کے بعد کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے وہ بوڑھے حالیؔ ہیں۔" "ادب کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیے جائیں۔ یہ سلاست اور نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے۔ جو سرسید کے بعد حالیؔ کے حصے میں آئی۔ حالیؔ نے سرسید کے رنگ کو ترقی دی۔ سرسید کا رنگ بہت مفید ہونے کے باوجود کبھی کبھی بے رنگ سپاٹ ہو جاتا تھا۔ حالیؔ نے اس میں ادبیت پیدا کی۔ ان کا سبو مٹی کا ہے مگر ان کی مے میں شمشیر کی تیزی ہے اور یہ زبان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے موزوں اور مناسب ہے" آزاد نے بقائے دوام کا دربار آراستہ کر کے نثر میں شاعری کا چٹخارہ پیدا کیا۔ ان کی روح جدید تھی مگر لباس قدیم۔ جس رنگ کے خلاف وہ بغاوت کرتے تھے وہ آخری دفعہ ان کی تصانیف میں نظر آیا۔ یہ خیالی مضامین یا مرقع نگاری کے لیے موزوں تھا لیکن علمی اور تنقیدی مضامین کے لیے اس میں گنجائش نہ تھی۔ نذیر احمد کے طرز میں مذاق کا پہلو بہت

نمایاں ہے اور باوجود بہت جان دار، بہت پر زور اور بہت تن درست ہونے کے محدود ہے۔ کہانیوں اور لکچروں میں مزا دیتا ہے، مذہبی تصانیف میں نظروں سے گر جاتا ہے۔ شبلی نے اپنے ہم عصروں سے بہت کچھ سیکھا۔ آزاد کی رنگینی، حالی کی سادگی، سرسید کا استدلال، نذیر احمد کا زور بیان، سب اپنی اپنی جگہ ان کے ہاں ملتے ہیں۔ مگر یہ رنگ عالمانہ ہے، اس کے قدرداں ہمیشہ رہیں گے بلکہ پڑھے لکھوں میں ہمیشہ مقبول رہے گا۔ مگر حالی کی سی ہمہ گیری اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

وہ جدید شاعری کے پیغمبر اور اردو کے بہترین شعرا میں سے ہیں۔ ان کے زمانے میں ہمارے ادب میں بہت سے باغ لگائے گئے اور بہت سی راہیں کھلیں، مگر سب سے زیادہ پھول پھل ان کے باغ میں اور سب سے زیادہ وسعت ان کے راستہ میں آئی۔ جب انھوں نے دکان لگائی تو اگرچہ ان کا مال نایاب تھا اور اکثر گاہک بے خبر تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب کو خبر ہوتی رہی اور آج جس مال پہ حالی کی مہر نہیں اسے ٹکسال باہر سمجھا جاتا ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے:۔ تنقیدی اشارے از آل احمد سرور
نئے اور پرانے چراغ

سوالات

۱۔ مقدمۂ شعر و شاعری کا کیا اثر اردو ادب پر پڑا؟
۲۔ مسدس حالی کی مقبولیت کا کیا سبب تھا؟
۳۔ اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ حالی شاعری کو زندگی کے قریب لانا چاہتے تھے؟

مشقیں

۱۔ حالی نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کا جائزہ لو اور یہ بتاؤ کہ سرسید کے ادبی رُفقا میں اُن کا کیا درجہ ہے؟
۲۔ اس خیال کی وضاحت کرو کہ آج جس مال پر حالی کی مہر نہیں اسے ٹکسال باہر سمجھا جاتا ہے۔
۳۔ اس مضمون میں کئی شاعروں اور ادیبوں کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں اپنے استاد سے تفصیلی باتیں معلوم کرو۔
۴۔ سکتہ، خاتمہ، سوالیہ، فجائیہ، داویں، قوسین، تفصیلیہ، بہویہ وغیرہ، اوقاف کا مطلب تم سمجھ چکے ہو۔ اب اپنے سبقوں سے ہر ایک کی مثالیں چھانٹو۔
۵۔ آخری پیراگراف میں، جو اوقاف آئے ہیں ان کی تشریح کرو۔

کنھیالال کپور

پوربی پنجاب کے شہر موگا میں اس وقت انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ انگریزی ادب سے اچھی واقفیت نے آپ کے مضامین پر گہرا اثر ڈالا ہے ان میں وہ خوبیاں پائی جاتی ہے جو انگریزی کے اچھے مزاح نگاروں میں ملتی ہیں۔ آپ کا مشاہدہ بڑا تیز ہے۔ سماجی زندگی اور اشخاص کی کمزوری اور بے راہ روی پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے اور وہ اس کے اظہار میں مروت یا رورعایت نہیں کرتے۔ ان کے بہت سے احباب کو ان کی صاف گوئی سے تکلیف پہنچی ہے۔

ان کے مضامین میں فکر ونظر کی گہرائی تو نہیں ہوتی مگر ان میں بے حد تنوع، دلآویزی اور دلکشی ہوتی ہے۔ وہ صرف مزاح نگار نہیں ہیں۔ ان کی تحریر میں بھرپور طنز ہوتا ہے۔ زبان پر انھیں بڑی قدرت ہے۔ اُن کا شمار اردو کے صف اول کے مزاح اور طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس وقت تک ان کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

بے تکلفی

(یہ مزاحیہ مضمون کنہیالال کپور کی کتاب "چنگ و رباب" سے منتخب کیا گیا ہے۔ کپور صاحب کے مضامین کے دوسرے مجموعے ہیں "شیشہ وتیشہ، سنگ وخشت اور نوک نشتر۔
نوک نشتر کا ایک مضمون "برج بانو" خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے)

کہنے کو تو استاد ذوق فرما گئے۔ ع

"اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر"

لیکن یہ غور نہ فرمایا کہ اگر تکلف میں تکلیف ہے، تو بے تکلفی میں کون سی راحت ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ تکلف، وہ تکلف بھی جس کی معراج "پہلے آپ" ہے بے تکلفی سے بدرجہا اچھا ہے۔ فرض کیجئے، آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں اور جہنم کا داروغہ آپ سے کہتا ہے، "تشریف لے چلیے" اور آپ مسکرا کر نہایت لجاجت سے عرض کرتے ہیں" اجی پہلے آپ"۔ تو عین ممکن ہے کہ آپ کے حسن اخلاق سے مرعوب ہو کر آپ کو جہنم کے بجائے جنت میں بھجوا دے۔ اس کے برعکس اگر آپ کی داروغۂ جنت سے بے تکلفی ہے تو ہو سکتا ہے کہ ہنسی مذاق میں وہ آپ کو باغ بہشت کی کسی نہر میں اتنے غوطے دلوائے کہ آپ کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔

تکلف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور

ظاہر داری جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ مثلاً آپ کے گھر کوئی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں، "کچھ منگواؤں آپ کے لیے" وہ فرماتے ہیں "اجی صاحب تکلف مت کیجیے"۔

"چائے پئیں گے؟"

"شکریہ ابھی پی ہے۔"

"سوڈا منگواؤں۔"

"نہیں صاحب آپ تو خواہ مخواہ تکلّف کرتے ہیں۔"

"شربت پیجیے گا۔"

"واہ صاحب۔ آپ تو پھر تکلّف پر اُتر آئے۔"

"ٹھنڈا پانی پیجیے۔"

"اچھا صاحب۔ اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو پی لیں گے۔"

اب اگر انھیں حضرت سے آپ کی بے تکلفی ہو، تو آپ کو کتنی زحمت اٹھانی پڑے۔

"کھانا کھائیں گے آپ؟"

"ہاں ہاں ضرور کھائیں گے۔ لیکن کھانا کھانے سے پہلے چائے پئیں گے۔"

"چائے منگواؤں؟"

"ضرور منگوائیے۔ لیکن پہلے سگریٹ پلائیے۔"

"چائے کے ساتھ کیا کھائیے گا؟"

"اماں یار تمھیں معلوم تو ہے۔ پاؤ بھر گاجر کا حلوا، دو آملیٹ، چار ٹوسٹ چھ سنبوسے۔ دس بارہ کریم رول، اور ہاں ایک آدھ کیک ہو جائے تو سبحان اللہ۔ لیکن جلدی کیجیے۔"

بے تکلفی میں یوں تو ہزاروں قباحتیں ہیں لیکن سب سے بڑی یہ ہے کہ بسا اوقات اس کے طفیل آپ کو سخت خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ آپ چند معزز اشخاص سے نہایت عالمانہ انداز میں کسی مسئلہ پہ گفتگو کر رہے ہیں کہ کوئی صاحب دروازے پہ اس طرح دستک دیتے ہیں گویا دروازہ توڑ کہ ہی دم لیں گے۔ دو ایک منٹ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بلند آواز میں چلانا شروع کر دیتے ہیں۔
"ابے چغد، کہاں ہے تو، دروازہ کھول، ابے ناہنجار! سنتا نہیں ہم کب سے چلا رہے ہیں، ارے کوئی ہے، سب مر گئے کیا؟"
کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ آپ کے احباب پر نگاہ غلط ڈالتے ہیں اور نہایت متانت سے کہتے ہیں "معاف کیجئے گا صاحب میری ان سے ذرا بے تکلفی ہے۔"
یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ دو بے تکلف دوستوں کے درمیان کچھ اس طرح گھر جاتے ہیں کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ ان میں سے ایک دوسرے کو نہایت غلیظ گالی دیتا ہے اور آپ کی طرف عفو طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "برا نہ مانیے گا۔" دوسرا جواب میں ماں یا بہن کی گالی دیتے ہوئے کہتا ہے "معاف کیجئے گا۔ ہم بہت دنوں کے بعد ملے ہیں۔" اس معذرت کے بعد گالیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ آپ کو بے ساختہ اس بے تکلفی کی داد دینی پڑتی ہے۔
ناولوں میں بے تکلف دوستوں کی بڑی دل چسپ مثالیں ملتی ہیں۔ ٹھیکرے ایک کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ صاحب جس دوست کے پاس ٹھہرے رخصت ہوتے وقت اس سے ایک قمیض ضرور مستعار لیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست اس معاملے میں ٹھیکرے کے اس کردار سے بازی

لے گئے ہیں۔ وہ صرف قمیض پہ اکتفا نہیں کرتے، ساری پوشاک کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عموماً ٹیکسی میں سوار ہو کر ہمارے ہاں تشریف لاتے ہیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں۔ ”پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالیے، ڈرائیور کو دفع کر لوں۔ پھر باتیں کریں گے۔“ یہ حضرت ہماری عدم موجودگی میں واپسی کا عزم کرتے ہیں اور وداع ہوتے وقت نوکر سے کہہ جاتے ہیں۔ ”وہ آئیں تو انھیں کہہ دیجیے گا کہ میں ان کا گرم کوٹ، خاکی ٹائی اور کالی پتلون ساتھ لے جا رہا ہوں۔ چند دن استعمال کر کے واپس کر دوں گا۔“

ہمارے ایک اور بے تکلف دوست ہیں وہ جہاں کہیں ہم سے ملتے ہیں مصافحہ کرنے کی بجائے بار بار بغل گیر ہو کر بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک بار انارکلی میں ملاقات ہوئی، بازار کے بیچ انھوں نے یہ عمل جو دہرانا شروع کیا تو راہ گیر دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ گئے۔ ہر دو منٹ کے بعد بغل گیر ہو کر کہتے۔ ”بھئی خوب ملے، یار حد ہو گئی۔“ وہ اس انداز سے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس رہے تھے گویا برسوں کے بعد ملے ہیں۔ حالاں کہ اس ملاقات سے صرف دو دن پہلے مال روڈ پر ملے تھے اور وہاں بھی انھوں نے اسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

بے تکلف دوست کی تو وہی مثال ہے کہ اسے وبال جان سمجھتے ہوئے بھی آپ وبال جان نہیں کہہ سکتے۔ اگر اس کے جی میں آئے تو آدھی رات آپ کے گھر آ دھمکے اور نہ صرف لذیذ کھانے کا مطالبہ کرے بلکہ کہے کہ ”کھائیں گے بھی یہیں اور سوئیں گے بھی

آپ کے ساتھ۔" دوپہر کے وقت آپ سو رہے ہوں تو قینچی لے کر ازراہ مذاق آپ کی دونوں مونچھوں کا صفایا کر ڈالے۔ شدت درد سے آپ کراہ رہے ہوں تو بد تمیزی سے آپ کا منہ چڑانا شروع کرے۔ آپ مضمون لکھ رہے ہوں تو آپ کے ہاتھ سے مضمون چھین کر آتش دان میں پھینک دے۔

بعض اوقات بے تکلف احباب ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں کہ آپ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں "ہائے تکلف! ہائے تکلف!!" ایک دفعہ مجھے دہلی جانا تھا، گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ اتنے میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی، پوچھنے لگے "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "دہلی" کہنے لگے۔ "دہلی جا کر کیا کرو گے چلو ٹاٹا نگر چلیں۔ میں نے معذرت چاہی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ یک لخت انھوں نے کہا "ذرا ٹکٹ دکھائیے تو" میں نے ٹکٹ دکھایا۔ ٹکٹ لے کر انھوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، اور قلی سے کہنے لگے "صاحب کا سامان واپس لے چلو۔ انھوں نے دہلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"

انھیں صاحب نے ایک بار اس سے بھی عجیب حرکت کی۔ ایک دن میں دریا کے کنارے کھڑا ہوا غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا، نہ جانے آپ کہاں سے آ ٹپکے۔ آپ نے نہ آؤ دیکھا اور نہ تاؤ، پیچھے سے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا پانی میں جا گرا۔ آپ نہایت ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر فرمانے لگے۔ "واہ خوب چھلانگ لگائی آپ نے!" جب میں بڑی مشکل سے

تیر کر کنارے کے قریب پہنچا تو ایک اور قہقہہ لگا کر کہنے لگے۔" مجھے معلوم نہ تھا آپ اتنے اچھے تیراک بھی ہیں!"

تکلف کے خلاف آپ جو چاہیں کہیں۔ لیکن آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا، تکلف سراسر نفاست ہے اور بے تکلفی سراسر کثافت۔ تکلف "پہلے آپ" ہے۔ تو بے تکلفی "پہلے ہم اور جہنم میں جائیں آپ" ہے۔ تکلف گز بھر لمبا گھونگھٹ ہے تو بے تکلفی گز بھر لمبی زبان۔ تکلف زیر لب مسکراہٹ ہے تو بے تکلفی خندۂ بے باک۔

اب اگر اس پر بھی استاد ذوق فرمائیں "کہ تکلف میں سراسر تکلیف ہے" تو ہم تو یہی کہیں گے۔" صاحب آپ کو بے تکلف دوستوں سے پالا ہی نہیں پڑا!"

مزید مطالعہ کے لیے:۔ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔ از سجاد حیدر یلدرم

سوالات

۱۔ تکلف کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہے؟

۲۔ مضمون نگار کے خیال میں بے تکلفی میں سب سے بڑی قباحت کیا ہے؟

۳۔ ذوق کے مصرعہ کا کیا جواب مضمون نگار نے دیا ہے؟

مشقیں

۱۔ تم ذوق کے مصرعہ کو عنوان بنا کر تکلف کی حمایت میں مضمون لکھو۔

۲۔ کپور نے اپنے چند بے تکلف دوستوں کا خاکہ اڑایا ہے۔ تم بھی اپنے بے تکلف دوستوں کا حال مزاحیہ انداز میں لکھو۔

۳۔ الفاظ اور جملوں کی ترتیب و ساخت کے بارے میں تم پڑھ چکے ہو الفاظ کے تجزیہ کو تحلیل صرفی کہتے ہیں اور جملوں کی تشریح ترکیب نحوی کہلاتی ہے۔

کلام یا جملہ ایک ہی چیز ہے جس سے پوری بات سمجھی جاتی ہے۔ جملہ میں مسند اور مسند الیہ کا ہونا ضروری ہے۔ جملہ اسمیہ، اکثر فعل ناقص سے بنتا ہے۔ جملہ فعلیہ، فعل لازم یا متعدی سے بنتا ہے جتنے جملے فعل لازم یا متعدی سے بنتے ہیں جملہ فعلیہ کہلاتے ہیں اس میں فعل اور فاعل کا ہونا ضروری ہے۔ جملہ اسمیہ۔ میں تین جز، فعل ناقص، مبتدا اور خبر ہوتے ہیں۔

جملہ فعلیہ۔ جب فعل لازم سے بنتا ہے تو اس کے دو جز ہوتے ہیں فعل اور فاعل اور جب فعل متعدی سے بنتا ہے تو ایک تیسرا جز "مفعول" بھی ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ باقی الفاظ متعلقات کہلاتے ہیں۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا۔

جملے کے تمام اجزا، صرف مسند الیہ اور مسند میں تقسیم ہوتے ہیں۔

اپنے سبق سے جملہ اسمیہ اور فعلیہ کی پانچ پانچ مثالیں چھانٹو

حصۂ نظم

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام شاعر	عنوان	صفحہ
	ا۔ غزلیات (تبصرہ)		
	سودا، درد، میر، آتش، ذوق غالب، مومن، داغ، امیر، شاد، اکبر، چکبست، اقبال، آرزو، ریاض، حسرت، فانی، اصغر، جگر، فراق، مجاز، نشور جذبی	غزلیات	۱
	ب۔ مثنویات (تبصرہ)		
۱۔	میر حسن	داستان، حالت تباہ کرنے ماں باپ کی نو داستان وارد ہونا بے نظیر کا باغ میں مہ رخ کے	
۲۔	دیا شنکر نسیم	حمد و نعت و مناجات آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں، بیاہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کے ساتھ	
۳۔	شوق (نواب مرزا)	آرائش باغ	

نمبر شمار	نام شاعر	عنوان	صفحہ
۴	اقبال	ساقی نامہ	
۵	حفیظ	صحرا کی دعا	
۶	علی سردار	سازِ حیات	

ج۔ قصائد (تبصرہ)

۱	سودا	در مدح نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر	
۲	ذوق	در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم	
۳	غالب	در مدح بہادر شاہ	
۴	منیر	در تہنیت غسل صحت نواب تجمل حسین خاں فرخ آباد	
۵	امیر	در مدح نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور	
۶	جلال	در جشن شادی عروسی ولی عہد بہادر	
۷	محسن	بے بسی کا اظہار	
۸	عزیز	قندیل حرم	

د۔ مراثی (تبصرہ)

۱	غالب	مرثیۂ عارف	
۲	میر انیس	صبح کا منظر، گرمی کا سماں، تلوار، حر کی شہادت، حضرت قاسم کی شہادت، سلام	
۳	دبیر	طلوع صبح، تلوار کی کاٹ، شہادت حضرت امام حسین رض	

نمبرشمار	نام شاعر	عنوان	صفحہ
۴	حالی	مرثیۂ غالب	
۵	چکبست	مرثیۂ گوکھلے	
۶	صفی	مرثیۂ حالی	
۷	جوش	نظم "آوازۂ حق" سے ایک اقتباس	
۸	مجاز	تاج وطن کا لعل بدخشاں چلا گیا (گاندھی جی کی وفات پر)	

ھ۔ قطعات و رباعیات (تبصرہ)

قطعات

۱	غالب	اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل	
۲	حالی	اسراف اور بخل	
۳	شبلی	غربا نوازی	
۴	اکبر	ختم بہار، مشرق و مغرب، نئی روشنی، کش مکش	
۵	سلیم	دعوت انقلاب، وقت سحر	
۶	اقبال	ملا اور بہشت، مستی کردار، نصیحت	
۷	جوش	انتظار، معذرت	
۸	فیض	وقت	
۹	اختر	تاج، ٹیگور کی شاعری، فطرت	

رباعیات

حالی، اکبر، انیس، جوش، فراق، امجد، رواں

و۔ منظومات جدید (تبصرہ)

۱	نظیر	میلے کی سیر	
۲	حالی	اقبال مندی کی علامت	
۳	اکبر	لب ساحل اور موج، رنگ زمانہ	

نمبر شمار	نام شاعر	عنوان	صفحہ
۴	چکبست	آصف الدولہ کا امام باڑا	
۵	بے نظیر شاہ	چاندنی رات	
۶	شبلی	سر سید احمد خاں	
۷	سلیم	آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں	
۸	اقبال	پیرِ فلک، اخترِ صبح، شعاعِ امید	
۹	صفی	بہار	
۱۰	ظریف	جہاز کا ایک دلچسپ سفر	
۱۱	سرور	گلِ خزاں دیدہ	
۱۲	سیماب	تاج شبِ تاریک میں	
۱۳	جوش	آواز کی سیڑھیاں، البیلی صبح	
۱۴	برق	عروسِ بہار	
۱۵	احسان بن دانش	وادیٔ کشمیر کی ایک صبح	
۱۶	حفیظ	تین نغمے	
۱۷	مُلّا	ٹیگور کی یاد میں	
۱۸	افسر	طلوعِ خورشیدِ نو	
۱۹	اختر	نغمۂ زندگی	
۲۰	فیض	اقبال	
۲۱	مجاز	رات اور ریل	
۲۲	علی سردار	ٹوٹا ہوا ستارہ	

ز۔ شاعروں کے حالات

غزلیات

غزل، اردو شاعری کا اہم ترین جزو ہے۔ ہر چند کہ اس پر مختلف قسم کے اعتراضات اور حملے کیے گئے تاہم اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ غزل اردو شاعری کے مزاج میں اس درجہ رس بس گئی ہے کہ اس کے بغیر اردو شاعری کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔

اردو شاعری کی ابتدا فارسی شاعری کی تقلید سے ہوئی۔ فارسی و عربی کے قصائد کی تشبیب میں غزل شامل ہوا کرتی تھی جس کا مطلب ہوا کرتا تھا "حکایت با یار گفتن"۔ رفتہ رفتہ غزل کی ایک علاحدہ صنف قائم ہوگئی اور وہ عشق و محبت کے مضامین تک محدود نہ رہ کے مختلف قسم کے مضامین اور خیالات کے شاعرانہ اظہار کا ایک موثر ذریعہ بن گئی۔

اردو شاعری کا قدیم ذخیرہ غزلیات، قصائد، مراثی اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دور کے دو نام قابل ذکر ہیں۔ ایک گولکنڈہ کے بادشاہ محمد قلی قطب خاں (متوفی ۱۶۱۱ء) کا جس کی کلیات نظم حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ اس میں غزلیں، قصیدے، مرثیے اور رباعیاں سب کچھ ہیں۔

قطب شاہ کے بعد دوسرا مشہور نام ولی اورنگ آبادی کا ہے جس نے دلی آکر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ولی کی بعض غزلیں نہایت صاف اور سلیس ہیں۔ اس دور کے اور مشہور شاعر آبرو۔ ناجی۔ یک رنگ۔ آرزو۔ شاہ حاتم دہلوی۔ مرزا مظہر جان جاناں ہیں۔ اس زمانے میں ایہام گوئی اور رعایت لفظی کا زور شور تھا مگر موخرالذکر دو شعرا نے غزل میں سلاست، واقعیت اور لطف و تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری کو تین ایسے باکمال شعرا ملے جنھوں نے اردو غزل میں چار چاند لگا دیے یہ تھے سودا، درد اور میر۔ ان اساتذہ نے غزل کو ایہام گوئی اور لفظی گورکھ دھندے سے پاک کیا اور اس میں سلاست، روانی اور اثر آفرینی پیدا کی۔ سودا نے اپنے تخیل کی بلندی اور جوش بیان

ے غزل میں کیف ونشاط پیدا کیا۔ دردؔ نے تصوف کی چاشنی دی اور میر تقی میرؔ نے سوز و گداز، یاس انگیزی اور خستگی پیدا کی۔ ان عناصر نے غزل کی زبان میں سادگی اور سلاست اور انداز بیان میں اثر آفرینی اور لوچ پیدا کی۔ اس دور کے آخر میں کچھ اور مشہور شاعر ملتے ہیں جیسے مصحفیؔ۔ میر اثرؔ۔ جرأتؔ۔ انشاؔ اور رنگینؔ وغیرہ لیکن باعتبار منزلت یہ اپنے پیش روؤں سے کم تر درجے پر ہیں۔ ان کے کلام میں غزل کی اکثر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مگر انھوں نے ادنیٰ جذبات اور بازاری معاملات اور طرز بیان کا اضافہ کیا۔ زبان البتہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ منجھ گئی۔

جرأتؔ نے اردو غزل کو ایک نئے موضوع سے آشنا کیا جسے "معاملہ بندی" کہا جاتا ہے معاملہ بندی کا مفہوم ہے محبوب سے نوک جھونک، چھیڑ چھاڑ اور اختلاط کی باتیں۔ اس صنف کا فطری استعمال کبھی کبھی نہایت پر لطف معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا رجحان بالعموم عریانی اور ابتذال کی طرف ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک اور صنف کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا جسے "ریختی" کہتے ہیں۔ اس کی شروعات رنگینؔ اور انشاؔ نے کی مگر جانؔ لکھنوی نے اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ ریختی اس صنف کا نام تھا جس میں عورتوں کی زبان اور لہجے میں زنانہ جذبات اور احساسات نظم کیے جاتے تھے۔

انیسویں صدی کا نصف اول اُردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کے ارتقا میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں مختلف قسم کے تجربے ہوئے۔ ان میں سے بعض تجربے خوش آیند اور روح پرور ثابت ہوئے۔ بعض کی حیثیت محض لفظی گورکھ دھندے کی رہی۔ اسی زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کے دبستان شاعری قائم ہوئے۔ دہلی کے شعراء مومنؔ، ذوقؔ اور بالخصوص غالبؔ نے غزل میں لفظی و معنوی دونوں اعتبار سے نئی وسعتیں بخشیں۔ عشق و محبت کی داخلی کیفیات کی ترجمانی سادہ اور پر اثر زبان میں اور صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کا اظہار، پُر شکوہ اور وقیع پیرائے میں دہلی اسکول کی خصوصیات قرار پائیں۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں خارجیت زیادہ اور داخلیت کم پائی جاتی ہے۔ غزل میں معشوق کے خط و خال، سامان آرائش و زیبائش اور رکیک جذبات نظم کیے جانے لگے۔ مضمون آفرینی، تصنع اور صنائع و بدائع کا زور رہا۔ مرثیت کا بھی رنگ غزل میں جھلکنے لگا۔ گور، کفن، تربت، میّت

اور لاشہ وغیرہ الفاظ شاعری میں کثرت سے مروج ہوگئے۔

آتش، ناسخ، وزیر، رند، صبا اور رشک وغیرہ لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے۔ ان اساتذہ میں آتش کا کلام سب سے بہتر ہے۔ اس میں روانی بھی ہے اور اثر بھی۔ ناسخ کا کلام بالعموم کیف و رنگ سے خالی ہے مگر انھوں نے زبان اور شاعری میں اصلاح کی اور الفاظ کے فصیح و بلیغ ہونے کے قاعدے مقرر کیے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جو ممتاز شعرا سامنے آئے ان میں داغ، امیر، جلال تسلیم، حالی، اکبر، راسخ اور شاد وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کے بعد امیر۔ جلال اور تسلیم کے شاگردوں کا سلسلہ چلتا ہے جن میں بے خود، سائل، سیماب، نوح، ریاض، جلیل، مضطر، آرزو، صفی اور حسرت قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے شعرا میں سے بعض دہلی اسکول کے پیرو ہیں اور بعض لکھنؤ کے دبستان شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ راسخ اور شاد نے عظیم آباد میں شاعری کا ایک نیا اسکول قائم کیا۔ انھوں نے پامال روش کو چھوڑ کر سنجیدہ اور پاکیزہ خیالات کو پر لطف اور شوخ انداز میں ادا کرنا شروع کیا۔ دراصل شاد، صفی اور حسرت غزل جدید کے پیش رو ہیں۔

اس زمانے میں داغ نے غزل گوئی کا ایک مستقل اسکول قائم کیا جس کی بنیاد تمام معاملہ بندی پر ہے۔ اس رنگ کی شروعات جرأت نے کی تھی مگر داغ نے اس میں ایک نکھار پیدا کیا۔ ان کی غزلوں میں ایک پر لطف تیکھاپن اور نشاط انگیز شوخی ہوتی ہے کہیں کہیں اس رنگ میں عریانی بھی نظر آتی ہے۔ اردو شاعری میں حالی نے بھی انتہائی پر کیف اور رنگین غزلیں لکھیں۔ حالاں کہ ان کی شہرت نظم جدید کے بانی کی حیثیت سے ہوئی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف قسم کی سیاسی اور سماجی تحریکوں نے زور پکڑا۔ ان کے اثر سے اردو شاعری میں بھی ایک نیا موڑ آیا۔ چند گوشوں سے غزل سے بے زاری کا بھی اظہار ہونے لگا۔ جدید طرز کی نظمیں فروغ پانے لگیں۔ پرانی روش پر چلنے والے اساتذہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اپنی وضع اور رنگ پر جمے رہے۔ چند شعرا نے غزل میں نیا بانکپن اور جدتیں پیدا کیں۔ ان میں

چک بست اور اقبال اور عزیز لکھنوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چک بست نے مقررہ موضوعات میں قومی اور وطنی جذبات کا اضافہ کیا۔ اقبال نے جرأت عمل، احساس خودداری اور رموز بے خودی کا درس دیا۔

اس زمانے میں سب سے زیادہ مشہور نام حسرت کا ہے جنھوں نے اردو غزل کو نئی زندگی بخشی۔ انھوں نے پرانے پیمانوں میں نئی شراب ڈھالنے کی کوشش کی۔ حسرت کی شاعری میں حسن وعشق کی نفسیاتی کیفیات کی دل کش ترجمانی ملتی ہے۔ ان کے کلام میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے۔ صفائی، شگفتگی، رنگینی اور شوخی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ فانی نے بلندیٔ تخیل کے علاوہ یاس کا لہجہ اور گداز دیا۔ اصغر نے کوثر میں دُھلی ہوئی زبان کے ذریعہ طہارت پاکیزگی اور رنگینی پیدا کی۔ جگر کی سرشاری اور سرمستی نے غزل کے لہجے میں وارفتگی اور والہانہ پن پیدا کیا۔ نئے شعرا پر ان کے رنگ کی گہری چھاپ ہے۔

غزل جدید کے ان عناصر اربعہ کے بعد نئی نسل کے غزل گو شعرا کا نمبر آتا ہے۔ ان میں فراق گورکھپوری، نشور واحدی، مجاز، جذبی، جاں نثار حسین اختر، روش صدیقی، شکیل بدایونی اور مجروح سلطان پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ فراق نے بالخصوص غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے اور اس میں نئی وسعتیں پیدا کی ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکل عظمت کے ساتھ نئے دور کا ادبی شعور بھی جلوہ گر ہے۔ انگریزی ادب کے گہرے مطالعے کا اثر بھی ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ نشور کا بھی اپنا خاص رنگ ہے۔ اس میں رنگینی کے ساتھ ساتھ نئے قسم کی تشبیہات اور مادائیت ملتی ہے۔

مجاز کے کلام میں اساتذہ کی سی پختگی اور صناعی ملتی ہے۔ دور حاضر کے شعرا میں انھیں حرفِ استاد مل چکا ہے۔ جذبی کی کیفیت ایک بجھے ہوئے شعلے کی ہے۔ ان کے کلام میں یاس انگیزی بہت ہے یہ یاس انگیزی خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے لب ولہجے میں بھی ملتی ہے۔ ان چاروں شعرا کا کلام دور حاضر کے نمائندہ غزل گو شعرا کی حیثیت سے اس مجموعہ انتخاب میں شامل ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کا

توڑوں یہ آئینہ کہ ہم آغوشِ عکس ہے
ہووے نہ مجھ کو پاس جو تیرے حضور کا

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہم صفیر! فائدہ ناحق کے شور کا

سودا کبھی نہ مانیو واعظ کی گفتگو
آوازۂ دہل ہے خوش آیند دور کا

جی تک تو دے کے لوں میں جو ہو کارگر کہیں
اے آہ کیا کروں؟ نہیں بکتا اثر کہیں

ہوتی نہیں ہے صبح، نہ آتی ہے مجھ کو نیند
جس کو پکارتا ہوں سو کہتا ہے مر کہیں

خوننابہ یوں کبھو نہ مری چشم سے بہا
اٹکا نہ جب تک آن کے لختِ جگر کہیں

اے دل تو کہہ تو مجھ سے کہ میں کیا کروں نثار
آویں کبھو جو حضرت سودا ادھر کہیں

گدا دست اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے ہے نہ کچھ دیں سے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں! ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

خدا دشمنوں کو نہ وہ دن دکھائے
جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے — ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے
ترا غرور، مرا عجز، تا کجا ظالم — ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
زبان شکوہ سو اب زمانہ میں ہیہات — کوئی کسی سے بہ ہم دیگر آشنا بھی ہے
ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد — چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے
قاتل ہماری نعش کو تشہیر دے ضرور
آئندہ تا نہ کوئی کسی سے وفا کرے
فکر معاش و عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے
عالم کے بیچ پھر نہ رہے رسم عاشقی
گر نیم لب کوئی ترے شکوے سے وا کرے
تنہا نہ روز ہجر ہے سوداؔ یہ یہ ستم
پروانہ ساں وصال کی ہر شب جلا کرے

خواجہ میر دردؔ

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ، فریاد، آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
زور عاشق مزاج ہے کوئی
دردؔ کو قصّہ مختصر دیکھا

گلیم بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں
یہی بساط ہیں ہم خاکسار رکھتے ہیں
بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ!
سب اہل قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر؟
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلو گیری
یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں
نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نے سیلاب
وہ کچھ ہیں، پر کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا
اگرچہ دردؔ اسے ہم ہزار رکھتے ہیں

چمن میں صبح یہ کہتی تھی، ہو کر چشم تر شبنم
بہارِ باغ تو یوں ہی رہی، لیکن کدھر شبنم
ہمیں تو باغ تجھ بن، خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب، روتی تھی ادھر شبنم

کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف طبعوں کی
ہوئی آتش سے گل کی بیٹھتے رشکِ شرر شبنم
بھلا ٹک صبح ہونے دو، اسے بھی دیکھ لیویں گے
کسی عاشق کے رونے سے، نہیں رکھتی خبر شبنم
نہ سمجھا درد ہم نے بھید، یاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں، روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
سر تا قدم زباں ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں
نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن! ہوس رنگ و بو کریں

مراجی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
تمنا ہے تیری، اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے، اگر آرزو ہے
کیا سیر سب ہم نے گلزارِ دنیا
گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے
غنیمت ہے یہ دید وا دید یاراں
جہاں مند گئی آنکھ میں ہوں نہ تو ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر؟
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

میر تقی میر

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا
فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حال میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم!
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن مرض عشق کا علاج نہیں
شہر خوبی کو خوب دیکھا میر جنس دل کا کہیں رواج نہیں

نالہ مرا اگر سبب شور و شر نہ ہو　　پھر مر بھی جائیے تو کسی کو خبر نہ ہو
دل پر ہوا سو آہ کے صدمے سے ہو چکا　　ڈرتا ہوں یہ کہ اب کہیں ٹکڑے جگر نہ ہو
سمجھا ہوں تیرے آنکھ چھپانے سے خوش نگاہ　　مدِّ نظر یہ ہے کہ کسی کی نظر نہ ہو
اٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغان سب
اس تیرہ روزگار میں تو میرؔ اگر نہ ہو

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اس ہی عالم پر　　یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں　　حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز　　اسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

آتش

محبت کا تری بندہ ہر اک کو اے صنم پایا
برابر گردن شاہ و گدا دونوں کو خم پایا

برنگ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اس نے منزل مقصود کو زیر قدم پایا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم پایا

ہوا ہر گز نہ خطِ شوق کا ساماں درست آتش
سیاہی ہو گئی نایاب اگر ہم نے قلم پایا

تار تار پیرہن میں بس گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست

دور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا
آئینہ کو بس صفائی نے دکھایا روئے دوست

داغ دل پر خیر گزری تو غنیمت جانیے
دشمن جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست

یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم
جب اڑاتی ہے ہوائے تند خاکِ کوئے دوست

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

چمن میں رہنے دے کون آشیاں نہیں معلوم
نہال کس کو کرے باغ باں نہیں معلوم

اخیر ہو گئے غفلت میں دن جوانی کے — بہار عمر ہوئی کب خزاں نہیں معلوم
کیا ہے کس نے طریق سلوک سے آگاہ — مرید کس کا ہے پیر مغاں نہیں معلوم
سپرد کس کے مرے بعد ہو امانت عشق — اٹھائے کون یہ بار گراں نہیں معلوم
چھٹیں گے زیست کے پنجے سے کس دن اے آتش
جنازہ ہو گا کب اپنا رواں نہیں معلوم

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری — خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری
وہ گل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے — وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جس کے بو تیری
شب فراق میں اک دم نہیں قرار آیا — خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری
مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے — نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری
زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں — رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے
پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ — کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے
ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے — سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے
ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا — تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے
نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

ذوقؔ

اسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر؟
کہیں جس کا نشان پا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے
نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا
دہن پایا، لب گویا نہ پایا

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

کیا ڈھونڈھے دشتِ گم شدگی میں مجھے کہ ہے
عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر

اس مرغِ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
مرغانِ کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر

خود اُڑ کے پہنچے نامہ جو ہو مرغِ نامہ بر
اس شوخِ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر

کرتا ہے دل کا قصد کماں دار تیرا تیر
پر ہے نشانِ داغ سے دور اور شکستہ پر

اے ذوقؔ میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

تجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل!
تیری یہ اضطراب کی باتیں

سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

ذکر کیا، ذوقِ عشق میں اے ذوقؔ ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

بس کر اے سوزِ دروں بھن جائیں گے دل اور جگر
رحم جوشِ گریہ پھر چھاتی مری بھر آئے ہے

دم کی ہے سینے میں آکر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھیے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

نزع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانبِ در دیکھ لے ہے جب کہ ہوش آجائے ہے

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے
رواں ہوتا ہے اس بستاں سرا سے کاروانِ گل چٹکنے کو صبا غنچے کے آوازِ درا سمجھے
نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

غالبؔ

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

مومن

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

اس وسعت کلام سے جی تنگ آ گیا
ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا، گیا
ضد سے وہ پھر رقیب کے گھر میں چلا گیا
اے رشک! میری جان گئی تیرا کیا گیا
کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں
جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا، گیا
آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا
آہ سحر ہماری فلک سے پھری نہ ہو
کیسی ہوا چلی کہ یہ جی سنسنا گیا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
اس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجوم عشق!
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں — بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں، بے گریہ آنکھ سے — اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
فکر مآل سے ہے وشاہد رہے عزیز — پیری میں موت، یاد تھی پیری شباب میں
اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو — یوں کچھ نہ ہو، امید تو ہے انقلاب میں

مومن یہ عالم اس صنم جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہان سراسر خراب میں

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا ابھی گھر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ — غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے
میرے تغئیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
میرے آنسو نہ پوچھنا ہرگز — کہیں دامان تر نہ ہو جائے

مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

داغ

اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا
میں جاؤں گا اگر مرا سایہ نہ جائے گا

اے حشر! امتیاز کہ ہم ہیں شہیدِ ناز
مردوں کی طرح اس کو اٹھایا نہ جائے گا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

فتنہ نہیں ہوں جس کو اٹھایا کرے فلک
مجھ سے گرے ہوئے کو اٹھایا نہ جائے گا

زلفیں نہیں کہ شانے سے آراستہ کیا
بگڑا ہوا مزاج بنایا نہ جائے گا

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کرتے ہیں قتل وہ طلب مغفرت کے بعد
جو تھے دعا کے ہاتھ وہی امتحاں کے ہیں

جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشت خاک
اس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں

کیسا جواب؟ حضرت دل! دیکھیے ذرا
پیغام بر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

کیا اضطرابِ شوق نے مجھ کو خجل کیا
وہ پوچھتے ہیں کہیے ارادے کہاں کے ہیں

جلا تھا دل جب کیا تھا نالہ جلیں گے لب جب دعا کریں گے
جو وہ کیا تھا تو کیا کیا تھا، جو یہ کریں گے تو کیا کریں گے

ہزار ہیں رنگ عاشقی کے، جو ان کو برتے وہ ان کو جانے
تم ہی کو ہم بے وفا کہیں گے، تم ہی سے ہم التجا کریں گے
پیام بر کی مجال کیا تھی، جو ان سے کہہ کر جواب لاتا
بہت سنیں ہم نے ایسی باتیں، بہت سی ایسی سنا کریں گے
ہوئے ہیں وہ خوگر جفا ہم، یہ کہتے پھرتے ہیں جا بجا ہم
جو کوئی ہم پر ستم کرے گا، ہم اس کے حق میں دعا کریں گے
کوئی سہے رنج و غم کہاں تک، اٹھائے ظلم و ستم کہاں تک
وہ حضرت داغ ہی نہیں اب، جو تجھ سے مہر و وفا کریں گے

نا روا کہیے نا سزا کہیے
کہیے کہیے مجھے برا کہیے

آپ اب میرا منہ نہ کھلوائیں
یہ نہ کہیے کہ مدعا کہیے

وہ مجھے قتل کر کے کہتے ہیں
مانتا ہی نہ تھا یہ کیا کہیے

دل میں رکھنے کی بات ہے غم عشق
اس کو ہرگز نہ برملا کہیے

تجھ کو اچھا کہا ہے کس کس نے
کہنے والوں کو خبر کیا کہیے

آ گئی آپ کو مسیحائی
مرنے والوں کو مرحبا کہیے

ہوش جاتے رہے رقیبوں کے
داغ کو اور باوفا کہیے

امیرؔ مینائی

حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا
لا مکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا

بے تعلق کیا ہمیں اس کے تصور نے کیا
جب جھکایا سر گریباں اپنا خلوت خانہ تھا

باغ عالم میں تماشا باعث غفلت ہوا
دیکھنا آنکھوں کا کانوں کے لیے افسانہ تھا

اس قدر اس کے تصور نے مٹایا ہے مجھے
شبہ ہوتا ہے کہ ہستی میں کبھی تھا یا نہ تھا

آزما دیکھا اسے سو بار ہم نے اے امیرؔ
آشنا سے آشنا بیگانہ سے بیگانہ تھا

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

کوہ کن کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں
ہے جو عاشق دل معشوق میں گھر پیدا کر

رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا
نکہتِ گل کی طرح شوق سفر پیدا کر

قطرۂ اشک بنے گوہر گوشِ جاناں
آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر

آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے
پیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر

مے پئیں کیا کہ کچھ فضا ہی نہیں ساقیا باغ میں گھٹا ہی نہیں
خضر کیا جانیں مرگ کی لذت اس مزے سے وہ آشنا ہی نہیں

کس طرح جائیں ان کی محفل میں جن کے دل میں ہماری جا ہی نہیں
کیا سنیں گے وہ خلق کی فریاد کہتے ہیں جو کوئی خدا ہی نہیں

مرنے والوں سے کہتے ہیں وہ امیرؔ
کیا تمھاری کبھی قضا ہی نہیں

چاہنا ہم کو تو اس کا چاہیے وہ ہمیں چاہے تو پھر کیا چاہیے
دل نے جب پوچھا مجھے کیا چاہیے درد بول اٹھا تڑپنا چاہیے
کان جب آواز سنتے ہیں تری آنکھ کہتی ہے کہ دیکھا چاہیے
امتحاں ہے دوست دشمن کا عبث یہ تو اپنے دل سے پوچھا چاہیے

ہے مزاج اس کا بہت نازک امیرؔ
ضبط اظہارِ تمنّا چاہیے

شاد

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

چین دے گا نہ مجھے تازہ اسیری کا خیال
دھیان اس کا نہ تجھے حسرت پرواز آیا

رند پھیلائے ہیں چلّو کو تکلّف کیسا
ساقیا ڈھال بھی دے جام خداساز آیا

اک خموشی میں گلو! تم نے نکالے سب کام
غمزہ آیا نہ کرشمہ نہ تمھیں ناز آیا

کہتے ہیں شعر کسے، بزم میں کھل جائے گا
شاؔد آیا نہ کہو، حافظ شیراز آیا

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ — ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم — میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا — بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاؔد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں، جینا اسی کا ہے

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مکدر یا مصفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی مے خوار ہے پینا اُسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد!
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینا اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاہدِ بیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینا اسی کا ہے

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں، نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی
یہی جو ساماں ہیں یہ نہ ہوں گے تو پھر محبت کہاں رہے گی

بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو، بجھا چلا اپنے دل کی لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی

بہت سے تنکے چنے تھے میں نے، نہ مجھ سے صیاد تو خفا ہو
قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں، نظر سوئے آشیاں رہے گی

ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے، ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار اے آشیاں رہے گی

ہزار نقشِ قدم مٹا کر، زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں! رہے گی

اکبر الہ آبادی

نورِ عرفاں عقل کے پردے میں پنہاں ہو گیا
ہوش میں آنا حجابِ روئے جاناں ہو گیا

باعثِ تسکیں نہ تھا باغِ جہاں کا کوئی رنگ
جس روش پر میں چلا آخر پریشاں ہو گیا

صورت ظاہر میں دل اک قطرۂ خوں تھا فقط
آگیا جب جوش میں معنی کا طوفاں ہو گیا

اس توقع پر کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو
ماہ نو بھی چرخ پر شکل گریباں ہو گیا

کی ترقی چشم بد دور ایسی اپنے رنگ میں
اکبر اب مسند نشین بزم رنداں ہو گیا

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی

طبیعت کی گرمی بھی کیا چیز ہے
طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی

انھیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انھیں پر فدا ہو گئی

پھنسی جسم خاکی میں روحِ لطیف
اسیرِ کمند ہوا ہو گئی

دوا کیا کہ دقت دعا بھی نہیں
تری حالت اکبر یہ کیا ہو گئی

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے

وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگ وفا نہ رہا کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے

ہمیں لاکھ زمانہ لبھائے تو کیا نئے رنگ جو چرخ دکھائے تو کیا

یہ محال ہے اہلِ وفا کے لیے غمِ ملت و الفتِ دیں نہ رہے
جو تھیں چشمِ فلک کی بھی نورِ نظر، وہی جن پہ نثار تھے شمس و قمر
سو اب ایسی مٹی ہیں وہ انجمنیں کہ نشان بھی ان کے کہیں نہ رہے
وہی صورتیں رہ گئیں پیشِ نظر جو زمانے کو پھیریں اِدھر سے اُدھر
مگر ایسے جمالِ جہاں آرا جو تھے رونقِ روئے زمیں نہ رہے
غم و رنج میں اکبرؔ اگر ہے گھرا تو سمجھ لے کہ رنج کو بھی ہے فنا
کسی شے کو نہیں ہے جہاں میں بقا وہ زیادہ ملول و حزیں نہ رہے

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

چکبست

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا
تو پھر بے کار ہے تنگ آکے اس دنیا سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

وہ طبعِ یاس پرور نے مجھے چشم حقیقت دی
کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

نہیں منظور جینا روشناس چارہ گر ہو کر
رہے گا پاسِ غیرت پردۂ زخمِ جگر ہو کر

قفس کی آڑ سے محروم ہیں ہم آشیاں کیسا
پڑے ہیں دور صحنِ باغ سے بے بال و پر ہو کر

عدم سے آئے تھے دنیا میں کیا معلوم تھا ہم کو
رہے گا ساتھ سودا زندگی کا دردِ سر ہو کر

مقدر دیکھنا شبنم کا، پھولوں میں ہوئی پیدا
پیام آیا فنا کا، جلوۂ نورِ سحر ہو کر

یہی اک راستہ باقی تھا کیا اوجِ مراتب کا؟
بنے اہلِ نظر تم دشمنِ اہلِ ہنر ہو کر

شورش دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے
کچھ سمجھ کر ہم شریک بزم زنداں ہو گئے

درد الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

رہ گئی بازار محشر میں گنہ گاروں کی ساکھ
رحمت باری کے سکّے داغ عصیاں ہو گئے

اپنے دیوانوں سے ملنے کو چلی آئی بہار
سبزہ و گل صحن زنداں میں نمایاں ہو گئے

اس تمنا میں کہ آزادی کی دیکھیں گے سحر
ہم اسیر کلفت شب ہائے زنداں ہو گئے

جام تک خم سے شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلّف سے پریشاں ہو گئے

دل کیے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حُبِّ قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

کلفت دنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے
ہاتھ دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے

خود پرستی مٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی
ماتم احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

اقبال

(علامہ اقبال کی غزلوں میں شوکت و رعنائی کے ساتھ ساتھ ایک بلند آہنگ نغمہ پایا جاتا ہے۔"ضرب کلیم" کی غزلوں نے بالخصوص اردو غزل گوئی میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کیا۔ نمونے کے طور پر صرف چار غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا

مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں!
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں!
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کے جلانے کے لیے
وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لیے
دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں
لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لیے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو
آہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لیے
پاس تھا ناکامیِ صیّاد کا اے ہم صفیر
ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کے لیے

آرزو

(آرزو صاحب لکھنؤ کے اساتذہ میں سے تھے۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام خصوصیتیں ملتی ہیں جن کا تعلق لکھنؤ کے دبستان شاعری سے ہے۔ ایک زمانے میں آرزو صاحب کی "خالص اردو" کی بڑی دھوم رہی۔ خالص اردو سے مطلب ایسی زبان سے تھا جس میں عطف واضافت اور عربی و فارسی کے الفاظ نہ آئیں اس کا نمونہ بھی اس انتخاب میں ملے گا

جو سخن اس زبان سے نکلا — تیر گویا کمان سے نکلا
کم نہ تھی تیغ سے ادائے خرام — دوست دشمن کی شان سے نکلا
دل ہجوم ہوس سے نکلا خوب — اور بڑی آن بان سے نکلا
امتحاں میں وہ بے وفا بے مہر — بڑھ کے میرے گمان سے نکلا

آرزو عشق میں ہے پیر طریق
یہ چلن اس جوان سے نکلا

بہت دل لبھایا دل آزار ہو کر — کھلے پھول بن کر چبھے خار ہو کر
زباں کو تو یارا نہیں ذکر غم کا — کچھ آنکھیں ہی کہہ جائیں خوں بار ہو کر
پہنچتے ہیں ان تک پہنچ جانے والے — تہِ تیغ ہو کہ سر دار ہو کر
خجالت کی آئینہ بندی ہے ہر سو — کدھر جاؤں اپنے سے بے زار ہو کر

کلام خودی آرزو بے خودی میں
چھلکنے لگا ظرف سرشار ہو کر

جو سامنے اب تک آئے نہیں، کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
آنکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں، اور جی میں سمائے جاتے ہیں
جینا ہے تو دکھ بھی ہیں سکھ بھی، رونا بھی ہے ہنسنا بھی ہے
بین ایک ہی ہوتی ہے جس پر، سب راگ بجائے جاتے ہیں
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے
ہم ہیں کہ تلے ہیں مٹنے پر، وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں
اب آرزو اس پھلواری میں، بسنے کا سہارا کوئی نہیں
وہ سوکھے تنکے لاکے رکھو، تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

فرقت بھی وصل ہے جو نہ دل بدگماں رہے
جس حال میں بھی ہم تو رہے شادماں رہے
گہ آرزو نے کبھی درد نہاں رہے
القصہ دل میں گھس کے رہے تم جہاں رہے
انجام انتظار نے امید توڑ دی
ہاں کچھ دنوں تو ہم بھی بہت شادماں رہے
ان بن ہے باغ بان سے اور باغ سے لگاؤ
گل سے قریں نگاہ سے دور آشیاں رہے
غم چشمۂ حیات کی چلتی ہوئی ہے سوت
جب تک بھی آنکھ آنکھ ہے آنسو رواں رہے
وسعت کو دل کی تنگ نہ کر اے غم حیات
آخر غریب دردِ محبت کہاں رہے
پھر آرزو کو در سے اٹھا پہلے یہ بتا
آخر غریب جائے کہاں اور کہاں رہے

ریاضؔ

(ریاضؔ خیرآبادی ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ نہایت ثقہ بزرگ تھے لیکن غزلیں خمریات کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں)

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا

اٹھے نہ میری گور سے پھر وہ بھی بیٹھ کر
کیا عالم آج ہائے مری بے کسی کا تھا

مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا
جب دام دے کے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

دنیا کی کاہشوں سے ہمیشہ رہا اداس
پر آدمی ریاضؔ عجب دل لگی کا تھا

ہمارے شیشہ و ساغر ہیں یہ مہ و خورشید
ہمارے پینے کا اک خم ہے آسمان نہیں

ازل میں دیکھ چکے سن چکے مگر پھر بھی
یہ بات کیا ہے کسی کے بھی آنکھ کان نہیں

تلاشِ دل میں کسی در کی خاک چھانیں گے
سنا ہے آج وہاں کوئی پاسبان نہیں

تمام خلق ہے حسن بتاں کی گرویدہ
پھر اور کیا ہے اگر یہ خدا کی شان نہیں

مکان گور کی پستی عجیب رفعت ہے
جو لا مکاں بنے ایسا کوئی مکان نہیں

ہو کے آزاد تہِ دامن صیاد رہے
گھر میں صیاد کے جب تک رہے آزاد رہے

میں وہ بلبل ہوں کروں دامِ محبت میں اسیر
چار ہی روز میں صیاد نہ صیاد رہے

کوئی کہتا یہ گزرتا ہے ادھر سے ہر روز
ہم رہیں یا نہ رہیں مے کدہ آباد رہے

دامنِ کوہ میں خونِ سرِ فرہاد رہے
لالے کا پھول بنے داغ بنے رنگ بنے

ڈر سے محشر میں دمِ پرسشِ اعمال ریاضؔ
اس کی رحمت کے سوا کچھ نہ مجھے یاد رہے

اگتے تھے جن میں نخل، اُمیدِ وصال کے
کیا ہو گئے وہ باغ طلسمِ خیال کے

ہر بامِ طور، وادیٔ ایمن ہر اک صحن
جلوے کہاں نہیں تری برقِ جمال کے

بے درد تجھ کو بات کا جب بھی یقیں نہ ہو
ہم رکھ دیں سامنے جو کلیجا نکال کے

ان کی طرف سے آکے جو اس دل میں جم گئے
ذرے ہیں آسماں اسی گردِ ملال کے

اٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاضؔ جلد
آتے ہیں اک بزرگ یہ اپنے خیال کے

حسرت

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلا ہے کیا

گر جوش آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحر بے قرار
کچھ پوچھیے نہ وہ نگہ فتنہ زا ہے کیا

چل بھی دیے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں بھی یہ روا ہے کیا

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم زباں سے ہم

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدعا
اب تم سے دل کی بات کہیں کس زباں سے ہم

مایوس بھی تو کرتے نہیں تم ز راہِ ناز
تنگ آ گئے ہیں کشمکشِ امتحاں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں یہ چلے تھے جہاں سے ہم

حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں
اب تجھے اے ستم یار کہاں سے لاؤں

ہے وہاں شان تغافل کو جفا سے بھی گریز
التفات نگہ یار کہاں سے لاؤں

نور عنقا ہے شب ہجر کی تاریکی میں
جلوۂ صبح کے آثار کہاں سے لاؤں

صحبت اہل صفا خوب ہے مانا لیکن
رونق خانۂ خمّار کہاں سے لاؤں

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبی قسمت پہ اپنی ناز کرے

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

فانیؔ

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا
ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور
شاید میں درخورِ نگہ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور
ہے منع راہ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور
تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور
فانیؔ دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

وہی وہ ہیں مگر ظہور نہیں
اس طرح دور ہیں کہ دور نہیں
کچھ ہمیں کو یہ زندگی ہے عزیز
ان کی بے داد کا قصور نہیں
گھر جلاتے تو ہو مگر کس کا
دل ہے بندہ نواز طور نہیں
تم پہ مرنا جنھیں نہیں آتا
زندگی کا انھیں شعور نہیں
ہم بھی اپنی وفا پہ ہیں مغرور
بات کی بات ہے غرور نہیں

ترکِ دنیا نہ ہو سکے تو نہ کر غمِ دنیا مگر ضرور نہیں

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانیؔ
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

کارواں گزرا کیا ہم رہ گزر دیکھا کیے
ہر قدم پہ نقشِ پائے راہ بر دیکھا کیے

دردمندانِ وفا کی ہائے رے مجبوریاں
دردِ دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کیے

یاس جب چھائی امیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں
دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کیے

تو کہاں تھی اے اجل! اے نامرادوں کی مراد!
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

زیست تھی فانیؔ بقدرِ فرصتِ تمہیدِ شوق
عمر بھر ہم پرتوِ نورِ بشر دیکھا کیے

اصغر

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں، تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں

کبھی گُل کہہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر
کبھی مستی میں پھر گل کو رخِ زیبا سمجھتے ہیں

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

کبھی جوشِ جنوں ایسا کہ چھا جاتے ہیں صحرا پر
کبھی ذرّے میں گم ہو کر اسے صحرا سمجھتے ہیں

یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی
پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں

زمانہ آ رہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موجِ مے طہور میں
حسن کرشمہ ساز کا بزم میں فیض عام ہے
جانِ بلاکشاں بھی آج غرق ہے موجِ نور میں
اس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مے اچھال کر
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برق طور میں
خیرگیِ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتا نہیں
اور بھی دور ہو گئے آکے ترے حضور میں
تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں، میرے ہر اک قصور میں

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے
نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بےکار ہو جائے
تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے
نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے
کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں
کوئی اک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

جگرؔ مرادآبادی

کس نظر سے آج وہ دیکھا کیا
دل مرا ڈوبا کیا، اچھلا کیا

حسن سے بھی، دل کو بے پروا کیا
کیا کیا اے عشق تو نے کیا کیا

تو نے سو سو رنگ سے پردہ کیا
دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا

وہ بھی نکلی اک شعاعِ برقِ حسن
میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا

لذّت ناکام یابی! الاماں
تو نے ہر امروز کو فردا کیا

ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں
میں نے صحرا کو جگرؔ صحرا کیا

عشق کی یہ نمود بیہم کیا؟
ہو تمہیں تم اگر تو پھر ہم کیا؟

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسم کیا؟

اُن نگاہوں کے سب کرشمے ہیں
ورنہ یہ اضطراب پیہم کیا؟

موت کی نیند چھائی جاتی ہے
کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا؟

ہمہ تن عشق برملا بن جا
درد کی اک صدائے مبہم کیا؟

عشق خاموش کے مزے میں جگرؔ
جوشِ فریاد و شورِ ماتم کیا

مر کے بھی کب تک نگاہ شوق کو رسوا کریں
زندگی تجھ کو کہاں پھینک آئیں آخر کیا کریں

دیکھیے کیا شور اٹھتا ہے حریم ناز سے
سامنے آئینہ رکھ کر خود کو اک سجدا کریں

ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

عشق خود اپنی جگہ عینِ حقیقت ہے جگرؔ
عشق ہی کیوں ہو جو شانِ دلبری پیدا کریں

فکرِ منزل ہے، نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے
اب کدھر جاؤں، بتا اے جذبۂ کامل مجھے
ہر طرف سے آج آتی ہے صدائے دل مجھے
جا بھی اے ناصح! کہاں کا سود اور کیسا زیاں
عشق نے سمجھا دیا ہے عشق کا حاصل مجھے
کیسا قطرہ؟ کیسا دریا؟ کس کا طوفاں؟ کس کی موج؟
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیِ ساحل مجھے
دردِ محرومی سہی، احساسِ ناکامی سہی
اس نے سمجھا تو بہر صورت کسی قابل مجھے
یہ بھی کیا منظر ہے، بڑھتے ہیں، نہ ہٹتے ہیں قدم
تک رہا ہوں، دور سے منزل کو میں منزل مجھے

جورِ گلچیں اور جفائے باغباں دیکھا کیے
جو دکھایا تو نے وہ اے آسماں دیکھا کیے
اب قفس میں ہوش آیا تو یہ حیرت ہے ہمیں
کس طرح آنکھوں سے لٹتے آشیاں دیکھا کیے
جی بھر آیا ناتوانی پر جو راہِ عشق میں
دیر تک ہم نقشِ پائے رہ رواں دیکھا کیے
جب چمن سے لے چلا صیاد کر کے ہم کو قید
دور تک مڑ مڑ کے سوئے گلستاں دیکھا کیے
تھا اسیری میں بھی کچھ ایسا تعلق روح کو
ہم قفس میں روز خوابِ آشیاں دیکھا کیے

فراق گورکھپوری

تقدیر منزلوں کی جگاتے چلے چلو ۔۔۔ اے رہ روان راہ محبت! بڑھے چلو
جاتی ہے ہو کے زیر فلک راہ عشق بھی ۔۔۔ جو بار ہو اٹھاؤ، پڑے جو، سہے چلو
منزل عدم کی، راہ کٹھن، رات کا سفر ۔۔۔ تا صبح دم فسانۂ ہستی کہے چلو
اس بزم نازکیں یہی راز نشاط ہے ۔۔۔ ہر جنبش نظر کے سہارے مٹے چلو
منزل کی فکر کیا سر راہ جہاں فراق
جو کچھ دکھائیں قلب و نظر دیکھتے چلو

وسعتِ بے کراں میں کھو جائیں ۔۔۔ آسمانوں کے راز ہو جائیں
شاد و ناشاد ہر طرح کے ہیں لوگ ۔۔۔ کس پہ ہنس جائیں کس پہ رو جائیں
اپنے بعد آنے والی نسلوں کے ۔۔۔ راہ میں خار تو نہ بو جائیں
ہو سکے تو سکوت راز کو بھی ۔۔۔ اپنی آواز میں سمو جائیں
زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست ۔۔۔ سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

اسیران ستم نے اور ہی کچھ سوچ رکھا ہے
آخر بسر بھی کرنے والے یوں بسر کب تک
ابھی تو بڑھتی ہی جاتی ہے بے تابی تشفی سے
علاج درد دل ہوتا ہے دیکھیں کارگر کب تک
نوید طاقت پرواز لائی حد مجبوری
ترے بے بال و پر آخر رہیں بے بال و پر کب تک

حجاب حسن اگر ہیں جلوۂ مہر و مہ و انجم
نظر کو روکے رکھیں ہم بھی تا حد نظر کب تک

نظام دہر بدلے، آسماں بدلے، زمیں بدلے
لیے بیٹھا رہے کوئی حیات بے اثر کب تک

نہ جانے اشک سے آنکھوں میں کیوں ہیں آئے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ تجھے بھلائے ہوئے

یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی
چراغ دیر و حرم کیوں ہیں جھلملائے ہوئے

یہ اضطراب سا کیا ہے کہ مدتیں گزریں
تجھے بھلائے ہوئے تیری یاد آئے ہوئے

یہ حسرتیں ہیں کہ مایوسیاں کہ یاد تری
کچھ ابر سے دل افسردہ پر ہیں چھائے ہوئے

وہی ہیں رونق ہستی وہی ہیں جان نشاط
اداس بیٹھے ہیں جو تیری لو لگائے ہوئے

مجازؔ

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے
اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں ہو رخصت، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہ گزرِ کارواں سے ہم
ہم دم یہی ہے رہ گزرِ یارِ خوش خرام
گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم
کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھیے
الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم
ٹھکرا دیے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے
دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے
ہائے انجام اس سفینے کا
ناخدا نے جسے ڈبویا ہے
آہ کیا دل میں اب لہو بھی نہیں
آج اشکوں کا رنگ پھیکا ہے
پھر مری آنکھ ہو گئی نم ناک
پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

نشورؔ واحدی

سحر اور شام سے کچھ یوں گزرتا جا رہا ہوں میں
کہ جیتا جا رہا ہوں اور مرتا جا رہا ہوں میں

گل رنگیں یہ کہتا ہے کہ کھلنا حسن کھونا ہے
مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جا رہا ہوں میں

جوانی جا رہی ہے اور میں محو تماشا ہوں
اڑی جاتی ہے منزل اور ٹھہرتا جا رہا ہوں میں

بہت اونچا اڑا لیکن اب اس اوج تخیل سے
کسی دنیائے رنگیں میں اترتا جا رہا ہوں میں

نشورؔ آخر کہاں تک فکر دنیا دل دکھائے گی
غم ہستی کو ذوق شعر کرتا جا رہا ہوں میں

وہ آئے اس طرف ور یوں بطرز خوش گوار آئے
اچانک جیسے محفل میں کہیں پھولوں کا ہار آئے

فلک نے چھین لیں رنگینیاں اور لوٹ لی نکہت
مرے اجڑے ہوئے گلشن میں کیا لے کر بہار آئے

وہ انساں کیا جو بیگانہ ہو ذوق زخم و خنجر سے
وہ مے کش کیا جسے صہبا کی تلخی ناگوار آئے

نشورؔ اب زندگی پیمائش غم کے سوا کیا ہے
شب رخصت اگر گزرے تو شام انتظار آئے

سحر اور شام یوں ہی زندگانی ہوتی جاتی ہے
زمانہ بیتا جاتا ہے کہانی ہوتی جاتی ہے

وہی ہے ضبط غم لیکن اب آنسو آئے جاتے ہیں
وہی ہے دل مگر اب آگ پانی ہوتی جاتی ہے

گزشتہ الفتوں کا نقش گہرا ہوتا جاتا ہے
جو دنیا مٹ گئی ہے غیر فانی ہوتی جاتی ہے

نشورؔ اب اور ہی صورت ہو جینے کی تو بہتر ہے
نئی دنیا بھی نظروں میں پرانی ہوتی جاتی ہے

جذبی

مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے اے طوفانو! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے

اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمھاری نظروں کی
اک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

کیا ماتم ان امیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک ان تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھے، یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا، یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

زندگی اب زندگی کی داستانوں میں نہیں
بجلیوں کے [illegible]

جس کو کہتے ہیں محبت، جس کو کہتے ہیں خلوص
جھونپڑوں میں ہو تو ہو [illegible] مکانوں میں نہیں

زندگی کو لاکھ بن جائے تبسم آفریں
زندگی لیکن تبسم کے فسانوں میں نہیں

یوں بھی سنتا ہوں ترانے غم کے بزمِ اشک میں
جیسے کوئی بات ہی غم کے ترانوں میں نہیں

اب کہاں ڈھونڈھنے جاؤں سکوں کو اے خدا
ان زمینوں میں نہیں ان آسمانوں میں نہیں

وہ غلامی کا لہو جو تھا رگِ اسلاف میں
شکر ہے جذبی کہ اب ہم نوجوانوں میں نہیں

مثنویات

مثنوی اردو شاعری کی ایک مقبول صنف رہی ہے۔ یہ کارآمد بھی بہت ہے اس لیے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات کو روانی اور تسلسل کے ساتھ بغیر تکلف اور زحمت نظم کر سکنے کی زبردست صلاحیت اور گنجائش ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں چھوٹی چھوٹی تین رکن کی بحریں مروج تھیں۔ مولانا آزاد اور بعد میں شوق قدوائی نے کچھ مثنویاں اور حفیظ جالندھری نے تاریخی مثنوی شاہ نامۂ اسلام بڑی بحر میں لکھیں۔

قدیم شعرا غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی میں بھی بالعموم طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکبر و جہانگیر کے عہد میں افضل میرٹھی نے مثنوی لکھی۔ دکن میں غواصی، نصرتی، ابن نشاطی اور ولی وغیرہ کی مثنویاں ملتی ہیں۔ مگر دراصل اٹھارویں صدی کی مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان ایک ادبی شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سحر البیان کا اعجاز یہ ہے کہ وہ زبان و بیان کی گوناگوں لطافتوں کے اعتبار سے آج بھی اردو کی کامیاب ترین مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اسی دور میں میر اثر اور مصحفی نے بھی عمدہ مثنویاں لکھیں۔ میر اثر کی لکھی ہوئی مثنوی خواب و خیال کو مولانا عبدالحق اردو کی بہترین مثنوی خیال کرتے ہیں۔

طویل داستان نگاری اور فوق الفطرت قصوں کی بنیاد پر مثنویوں کا رواج انیسویں صدی کے نصف اول تک زیادہ رہا۔ دہلی میں مومن نے فرضی داستان محبت کی متعدد مثنویاں لکھیں۔ لکھنؤ میں آتش کے شاگرد دیا شنکر نسیم نے مثنوی گل زار نسیم لکھی جو لکھنؤ کے پر تصنع طرز بیان کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ جو فرق میر امن کی تصنیف باغ و بہار اور سرور کی تصنیف فسانۂ عجائب میں ہے کم و بیش وہی فرق مثنوی سحر البیان اور مثنوی گل زار نسیم میں پایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ قلق کی مثنوی طلسم الفت اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں بہار عشق، زہر عشق

جذبی

زندگی اب زندگی کی داستانوں میں نہیں — بجلیوں کا سوز شاخ آشیانوں میں نہیں
جس کو کہتے ہیں محبت، جس کو کہتے ہیں خلوص — جھونپڑوں میں ہو تو ہو پختہ مکانوں میں نہیں
زندگی کو لاکھ بن جائے تبسم آفریں — زندگی لیکن تبسم کے فسانوں میں نہیں
یوں بھی سنتا ہوں ترانے غم کے بزم اشک میں — جیسے کوئی بات ہی غم کے ترانوں میں نہیں
اب کہاں میں ڈھونڈنے جاؤں سکوں کو اے خدا — ان زمینوں میں نہیں ان آسمانوں میں نہیں

وہ غلامی کا لہو جو تھا رگ اسلاف میں
شکر ہے جذبی کہ اب ہم نوجوانوں میں نہیں

عیش سے کیوں خوش ہوئے کیوں غم سے گھبرایا کیے — زندگی کیا جانے کیا تھی اور کیا سمجھا کیے
ناخدا بے خود، فضا خاموش، ساکت موج آب — اور ہم ساحل سے تھوڑی دور پہ ڈوبا کیے
وہ ہوائیں، وہ گھٹائیں، وہ فضا، وہ اس کی یاد — ہم بھی مضراب الم سے سازِ دل چھیڑا کیے
مختصر یہ ہے ہماری داستانِ زندگی — اک سکونِ دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کیے

کاٹ دی یوں ہم نے جذبی راہ منزل کاٹ دی
گر پڑے ہر گام پر، ہر گام پر سنبھلا کیے

مزید مطالعہ کے لیے :- ہماری شاعری - از مسعود حسن رضوی
اُردو غزل (اقتباسات) از یوسف حسین خاں
غزل گو شعرا کے انتخابات - انجمن ترقی اُردو علی گڈھ
انتخاب کلام میرؔ، انتخاب کلام مومنؔ امیر حسن نورانی

مشقیں

۱- جن شاعروں کی غزلیں تم نے پڑھی ہیں ان کے کلام کے مجموعوں سے کچھ اور غزلیں پڑھو۔
۲- دورِ حاضر کے چند اور مشہور شاعر ہیں جیسے روشؔ صدیقی، وامقؔ جون پوری، جگن ناتھ آزادؔ، نشورؔ واحدی وغیرہ۔ ان کی غزلیں بھی حاصل کر کے پڑھو۔
۳- ان غزلوں میں حسن مطلع کن میں ہے۔
۴- غور کرو کہ یہ غزلیں مختلف اوزان کی ہیں اور اشعار میں ترنم، دل کشی، حسن بیان اور تاثر پیدا کرنے کے لئے شاعروں نے مختلف صنعتیں استعمال کی ہیں۔ ان سب باتوں کے جاننے کے لئے بھی ایک مخصوص علم ہے جسے علم عروض کہتے ہیں۔

اب یہ سمجھ لو کہ اُردو میں خاص طور پر گیارہ بحریں رائج ہیں اور ان کے ہیر پھیر سے نئی بحریں بن جاتی ہیں۔ ان کے تجزیہ یعنی شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر وزن کرنے کا نام تقطیع ہے۔ اس میں متحرک حرف متحرک اور ساکن، ساکن کے مقابل ہوتا ہے۔ اختلاف حرکات کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ تقطیع اس طرح کی جاتی ہے۔

شعر زندگی اب زندگی کی داستانوں میں نہیں بجلیوں کا سوز شاید آشیانوں میں نہیں

تقطیع

زندگی اب	زندگی کی	داستانوں	میں نہیں
۱	۲	۳	۴
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات
بجلیوں کا	سوز شاید	آشیانوں	میں نہیں
۱	۲	۳	۴
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات

تقطیع کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں مصرعوں کے اوزان برابر ہیں یا نہیں۔ یہ بحر رمل سالم ہے۔

مشہور بحروں کے نام اور ان کے اوزان یہ ہیں :-

رمل۔	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن	دوبار
رجز۔	مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن	دوبار
ہزج۔	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	دوبار
وافر۔	مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن	دوبار
متدارک۔	فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن	دوبار
کامل۔	متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن	دوبار
متقارب۔	فعولن فعولن فعولن فعولن	دوبار

اپنے استاد کی مدد سے ایسے اشعار کی تقطیع کرو جو ان بحروں میں ہوں۔ یہ ساتوں بحریں ایک ہی رکن کی تکرار سے بنتی ہیں۔

مثنویات

مثنوی اردو شاعری کی ایک مقبول صنف رہی ہے۔ یہ کارآمد بھی بہت ہے اس لیے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات کو روانی اور تسلسل کے ساتھ بغیر تکلف اور زحمت نظم کر سکنے کی زبردست صلاحیت اور گنجائش ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں چھوٹی چھوٹی تین رکن کی بحریں مروج تھیں۔ مولانا آزاد اور بعد میں شوق قدوائی نے کچھ مثنویاں اور حفیظ جالندھری نے تاریخی مثنوی شاہ نامۂ اسلام بڑی بحر میں لکھیں۔

قدیم شعرا غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی میں بھی بالعموم طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکبر و جہانگیر کے عہد میں افضل میرٹھی نے مثنوی لکھی۔ دکن میں غواصی، نصرتی، ابن نشاطی اور ولی وغیرہ کی مثنویاں ملتی ہیں۔ مگر دراصل اٹھارویں صدی کی مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی سحرالبیان ایک ادبی شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سحرالبیان کا اعجاز یہ ہے کہ وہ زبان و بیان کی گوناگوں لطافتوں کے اعتبار سے آج بھی اردو کی کامیاب ترین مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اسی دور میں میر اثر اور مصحفی نے بھی عمدہ مثنویاں لکھیں۔ میر اثر کی لکھی ہوئی مثنوی خواب و خیال کو مولانا عبدالحق اردو کی بہترین مثنوی خیال کرتے ہیں۔

طویل داستان نگاری اور فوق الفطرت قصوں کی بنیاد پر مثنویوں کا رواج انیسویں صدی کے نصف اول تک زیادہ رہا۔ دہلی میں مومن نے فرضی داستان محبت کی متعدد مثنویاں لکھیں۔ لکھنؤ میں آتش کے شاگرد دیا شنکر نسیم نے مثنوی گل زار نسیم لکھی جو لکھنؤ کے پر تصنع طرز بیان کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ جو فرق میر امن کی تصنیف باغ و بہار اور سرور کی تصنیف فسانۂ عجائب میں ہے کم و بیش وہی فرق مثنوی سحرالبیان اور مثنوی گل زار نسیم میں پایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ قلق کی مثنوی طلسم الفت اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں بہار عشق، زہر عشق

اور فریب عشق کافی مشہور ہوئیں۔ اودھ کے آخری تاج دار نواب واجد علی شاہ نے بھی کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ منیر شکوہ آبادی کی "معراج المضامین" اور تسلیم کی "نالۂ تسلیم" اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ داغ نے بھی "فریاد داغ" کے نام سے مثنوی لکھی مگر وہ زیادہ مقبول نہ ہوئی۔

انیسویں صدی کے آخر سے "داستانی مثنویوں" کا مذاق بالکل جاتا رہا۔ اس طرز کی آخری کوشش احمد علی شوق کی مثنوی ترانۂ شوق ہے۔ قدیم طرز کی مثنویوں کا ایک بندھا ٹکا سانچا تھا۔ پہلے حمد، نعت، منقبت اور مدح ستائی وغیرہ، پھر آغاز داستان اور واقعات کا تسلسل بعد میں دعائیہ کلام اور اختتام۔ شوق کے علاوہ محسن کاکوروی نے صبح تجلی اور چراغ کعبہ کے عنوان سے نہایت عمدہ مثنویاں لکھیں۔ جو کہ اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔

اس زمانے سے نئے طرز کی نظموں کا آغاز ہوا اور اس کا سہرا مولانا حالی اور آزاد کے سر ہے۔ انھوں نے مختلف مضامین پر مثنوی کے طرز پر نظمیں لکھ کر جدید نظم نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس دور میں اقبال نے ساقی نامہ کے عنوان سے بطرز مثنوی ایک نظم لکھی ہے جس کا فارم تو قدیم ہے مگر خیالات میں سیاسی رنگ اور حالات حاضرہ پر تبصرہ ہے۔ اس نظم میں مثنوی مولانائے روم کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں حفیظ جالندھری کی طولانی مثنوی کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو "شاہ نامۂ اسلام" کے نام سے چھپی ہے یہ بحر طویل میں ہے اور اس کا موضوع تاریخ اسلام ہے۔

سیاسی مثنویوں کا رواج اردو میں ابھی تک عام نہیں ہوا۔ علی سردار جعفری نے جو نئی نسل کے ایک ہونہار شاعر ہیں اپنی تصنیف "نئی دنیا کو سلام" میں اس کا استعمال نہایت کامیابی سے کیا ہے۔

پرانی مثنویوں میں چاہے مطالب عالیہ اور اخلاق افروز باتوں کی کمی رہتی ہو مگر ان کی حمایت میں یہ ضرور کہا جائے گا کہ وہ اپنے دور کے معاشرتی ماحول اور مذاق کی بہترین ترجمان ہیں۔ ان میں جگہ جگہ خارجی اشیا، سامان و اسباب، رسم و رواج، عقائد اور مناظر فطرت کا دل کش بیان ملتا ہے اور بہت سی باتیں تاریخی اہمیت کی معلوم ہوتی ہیں۔

میر حسن

داستان حالت تباہ کرنے ماں باپ کی شاہ زادے کے غائب ہونے سے

شتابی مجھے ساقیا دے شراب
کہ یہ حال سن کر ہوا دل کباب

یہاں کا تو قصہ میں چھوڑا یہاں
ذرا اب سنو غم زدوں کا بیاں

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں
تو دیکھا کہ وہ شاہ زادہ نہیں

نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہ رو
نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ اس کی بو

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی
کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی

کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی
کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی

کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دل گیر ہو
گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی
رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب
کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب

کسی نے دیے کھول سنبل سے بال
طمانچوں سے جوں گل کیے سرخ گال

نہ بن آئی کچھ ان کو اس کے سوا
کہ کہیے یہ احوال اب شہ سے جا

سنی شہ نے القصہ جب یہ خبر
گرا خاک پر کہہ کے ہائے پسر

کلیجا پکڑ ماں تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بِکس رہ گئی

کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا
عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا

گئیں لے وہ شہ کو لب بام پر
دکھایا کہ سویا تھا وہ سیم بر

یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا
کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا

مرے نوجواں میں کہاں جاؤں پیر
نظر تو نے مجھ پہ نہ کی بے نظیر

عجب بحر غم میں ڈبویا مجھے
غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

عجب طرح کی شب تھی ہیہات وہ
قیامت کا دن تھا نہ تھی رات وہ

سحر نے کیا جب گریبان چاک
اڑانے لگے مل کے سب سر پہ خاک

اٹھا شہر میں ہر طرف شور وغل
کہ غائب ہوا اس چمن سے وہ گل

غم و درد سے دل جو سب کا بھرا
ہوا باغ سارا وہ ماتم سرا

گیا جب کہ وہ سرو اس باغ سے
نظر پھول آنے لگے داغ سے

اکھڑ نا گئے سرو سب اپنا بھول
اڑانے لگیں قمریاں سر پہ دھول

صدا اب جو کوئی انھوں کی سنے
تو کوکو سے ان کے جگر تک بھنے

ہوئے خشک اور زرد سارے نہال
ثمر لگ کے پاؤں ہوئے پائمال

ترانے سے بلبل کے جی ہٹ گیا
گلوں کا جگر درد سے پھٹ گیا

تبسم گیا حزن سے غنچہ بھول
ہوا غم سے ازبس لہو پی کے پھول

اڑا نور نرگس کی آنکھوں کا سب
ہوئے بال سنبل کے ماتم کی شب

لب جو جو اڑنے لگی گرد گرد
گل اشرفی کا ہوا رنگ زرد

لگی آگ لالے کے دل کو تمام
دیا خاک میں پھینک عشرت کا جام

پڑا ماتم اس باغ میں بس کہ سخت
ہوئے نخل ماتم تمامی درخت

گرے غم سے انگور مدہوش ہو
پڑے سارے سائے سیہ پوش ہو

لگے تھے جو پتے درختوں کے ساتھ
وہ ہل ہل کے ملتے تھے آپس میں ہاتھ

وہ لب ریز جو نہر تھی جا بجا
سو آنکھوں کو وہ رہ گئی ڈبڈبا

اچھلتے تھے فوارے جو اس کے واں
گیا سب نکل اس کا تاب و تواں

مژہ پر جو کچھ اشک تھے جھڑ گئے — غرض روتے روتے گڑھے پڑ گئے
ہوا حال چشموں کا یاں تک تباہ — کیا رخت پانی نے اپنا سیاہ
نہ بگلوں کا عالم نہ وہ قرقرے — نہ وہ آب جوئیں نہ سبزے ہرے
گلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دل — سو وہ سب خزاں سے ہوئے مضمحل
نہ غنچہ نہ گل ہے نے گلستاں رہا — فقط دل میں اک خار ہجراں رہا
وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ — کہ ہوتی ہے اب اس کی حالت تباہ
کہا گو جدائی گوارا نہیں — ولیکن جدائی سے چارا نہیں
نہیں خوب اتنا تمہیں اضطراب — نصیبوں سے شاید ملے وہ شتاب
خدا جانے اب اس میں کیا بھید ہے — یہ کہتے ہیں جنتوں کو امید ہے
لٹایا بہت باپ نے مال و زر — ولیکن نہ پائی کچھ اس کی خبر

داستان وارد ہونا بے نظیر کا باغ میں بدر منیر کے

سنو ایک دن کی یہ تم واردات — اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا ناگہاں اس کا اک جا گزر — سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دو چند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا — وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور وہ مہ کا ظہور — لگا شام سے صبح تک وقت نور
یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ — اُتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں تو یاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اس کے جی میں اتر

کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو — ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
یہ کہہ نیچے اترا دبے پاؤں وہ — نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر — درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں — عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
عجب صورتیں اور طرفہ محل — چلا دیکھتے ہی دل اس کا نکل
ملی جنس کی اپنے جو اس کو بو — لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو
نظر آئی واں چاندنی کی بہار — کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
در و بام یک لخت سارے سپید — ہر اک طاق و محراب صبح امید
بلوریں دھرے ہر طرف سنگ فرش — کہ جس سے منوّر رہے رنگ فرش
ہر اک سمت واں نور کا ازدحام — لگے آئینے قد آدم تمام
لبالب وہ چوپڑ کی پاکیزہ نہر — پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر
لب نہر پر صاف جو غور کی — تو پٹری تھی وہ ایک بلّور کی
پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے — ہوا میں وہ موتی سے لٹتے ہوئے
لیے گود مقیّش چھوٹے بڑے — ہر اک جا ستارے اڑا دیں کھڑے
غرض اپنی صورت سے تاروں کو توڑ — زمیں کو فلک کا بنایا تھا جوڑ
ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم — ملیں جلوۂ مہ کو زیر قدم
فقط چاندنی میں کہاں طور یہ — کہ طرہ نہ جب تک ملے اور یہ
کھڑا ایک نم گیرۂ آب دار — کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار
جڑاؤ وہ استادے الماس کے — ڈھلے ایک سانچے کے اک اس کے
کھنچی ڈور ہر سمت زرتار کی — لڑی جوں کناری کی ہوں ہار کی
کہوں کیا میں جھالر کی اس کی پھبن — کہ سورج کے ہو گرد جیسے کرن

مغرق بچھی مسند اک جگمگی ... کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ پھولے سماتے تھے تکیے دھرے ... کہ تھے وہ فقط حسن سے ہی بھرے
زمیں نور کی آسماں نور کا ... جدھر دیکھو ادھر سماں نور کا
چمن سارے داؤدیوں سے بھرے ... جوانانِ شبّو کے ہر جا پرے
ستاروں کا مہتاب میں حال یوں ... کہ چونے میں پانی کے قطرے ہوں جوں
اگر کیجیے سایہ اوپر نگاہ ... تو ہے وہ بھی جوں سایۂ مہر و ماہ

کرے ہے نگہ جس طرف کو گزر
بجز نور آتا نہیں کچھ نظر

دیا شنکر نسیم

حمد و نعت و مناجات

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمد حق و مدحت پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زباں کی پیش دستی

یارب مرے خامے کو زباں دے
منقار ہزار داستاں دے

افسانۂ گل بکاؤلی کا
افسوں ہو بہار عاشقی کا

ہر چند سنا گیا ہے اس کو
اردو کی زبان میں سخن گو

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں
اس مے کو دو آتشہ کروں میں

ہر چند لگے جو اہل فن تھے
سلطان قلمرو سخن تھے

آگے ان کے فروغ پانا
سورج کو چراغ ہے دکھانا

پر بحر سخن سدا ہے باقی
دریا نہیں کار بند ساقی

طعنے سے زبان نکتہ چیں روک
رکھ لے مری اہل خامہ میں نوک

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر
نیرنگ نسیم باغ کشمیر

نقطے ہوں پسند خوش بیانی
جدول ہو حصار سحر خوانی

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے
مرکز پہ کشش مری پہنچ جائے

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں

گل چیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھل کھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی، کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہوکے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس! تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن! تو بتا کدھر گیا گل
سنبل! مرا تازیانہ لانا! — شمشاد! انھیں سولی پہ چڑھانا
ٹھہرائیں خواصیں صورت بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بے گانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پہ پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار! پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل!
او باد صبا! ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا، پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک، اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے؟
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزے سے راست مو براندام
انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی — دست آویز اس کے ہاتھ آئی
خاتم تھی نام کی نشانی — انسان کی دست برد جانی
ہاتھوں کو ملا، کہا کہ ہیہات! — خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اس کی جو کھینچیے سزا ہے
یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک — خوں روئی لباس کو کیا چاک
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ — ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی — اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے؟
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے؟

بیاہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کے ساتھ

شادی کی خبر سے خوش خوش آئی　　مشتاق کو خوش خبر سنائی

راتوں کو جو گنتے تھے ستارے　　دن گننے لگے خوشی کے مارے

واں مہندی نے چومے پاؤں خورشید　　یاں سبز ہوا نہال امید

وہ واں پہ گلاب سے نہائی　　یاں تازگی آبرو نے پائی

واں غازے سے رخ شفق میں خورشید　　یاں جم گیا منہ پہ رنگ اُمید

افشاں ہوئی واں ستارہ افشاں　　یاں جیغہ سے روشنی دوچنداں

واں مانگ سے رنگ کہکشاں ماند　　یاں شملہ سر سے ہالے میں چاند

واں زلف نے کھائے پیچ پر پیچ　　طرفہ کلغی پہ یاں تھا سرپیچ

آنچل ہوئے واں نقاب عارض　　سہرا ہوا یاں حجاب عارض

زیبا ہوا واں بدن پہ گہنا　　یاں جامہ وفا کا اس نے پہنا

الماس کے واں تھے جھاڑ فانوس　　یاں جلوہ فروش تخت طاؤس

مہتاب سی چاندنی کا واں فرش　　یاں چرخی سے چرخ میں سر عرش

واں جلوے حنائی انگلیوں کے　　یاں روشنی کے تھے پنج شاخے

بادل سے وہ واں گرج رہے تھے　　یاں دھوم سے باجے سج رہے تھے

واں پریوں میں ذکر آدمی زاد　　نوشہ کے جلو میں یاں پری زاد

گل گوں تھا کسی کا بادرفتار　　گل رنگ کسی کا تھا ہوادار

ہاتھی تھے تو مستیوں کی دھت تھی　　گھوڑے تھے تو چابکی کی لت تھی

وہ ماہ کہ تھا سوار شب دیز　　تھا پا بہ رکاب شوق مہمیز

در تک جو برات ادھر سے آئی　　کی سب نے ادھر سے پیشوائی

فیروز مظفر ایسے دو شاہ — پر نور تھے جیسے مہر اور ماہ
باران گلاب و بارش گل — ہو کر بڑھے آگے با تجمّل
ہریالے بنے کا شور و غل تھا — سنبل کا چنور تو چتر گل تھا
گل سے خوانوں میں زردہ آیا — ان غنچہ دہانوں کو کھلایا
خورشید سا آفتابہ لائے — منہ ہاتھ ہر ایک کے دھلائے
قلیاں پیے مشک بو دھواں دھار — بیڑے چکھے پان کے مزے دار

جب عقد کی ان کے ساعت آئی
دو رشتوں میں اک گرہ لگائی

شوق قدوائی

طوطا اڑ جانے پر افسوس

بگڑی صفت مزاج سب سے
کہنے لگی جوشش غضب سے

طوطا صیاد نے اڑایا
چڑیاں رہیں چپ، اڑیں خدایا

پہرے پہ یہ شجر کھڑے تھے
کانٹے رستے ہی میں پڑے تھے

سوسن کی زبان کیا تھی بے حس
کیا پھوٹ گئی تھی چشم نرگس

کیا باغ میں سو رہا تھا "سویا"
کلیاں نادان ہی تھیں گویا

شاخوں نے نہ برچھیاں لگائیں
پتوں نے نہ تالیاں بجائیں

پھیلائے ہوئے تھیں جال بیلیں
چلنے دیتیں نہ چال بیلیں

غنچوں کو حجاب کی پڑی تھی
سبزے کو خواب کی پڑی تھی

خاک آیا نہ میرے کام سنبل
مٹ جائے بلا سے نام سنبل

پکڑا کسی خار نے نہ داماں
زنجیر بنا نہ عشق پیچاں

تاکا نہ عدو کو تو نے او تاک!
آنکھوں میں پڑی نہ اڑ کے او خاک!

تو نے نہ دیا نسیم جھٹکا
کانٹا بھی تو پاؤں میں نہ کھٹکا

کس سوچ میں تھے یہ سر جھکائے
کچا کوئی ان پھلوں کو کھائے

انگور ہیں مے پرست کم بخت
یک سر پڑے ہوں گے مست کم بخت

لب کھول کے حوض کیوں نہ بولا
فوارے نے کیوں دہن نہ کھولا

موجیں دوڑیں نہ ہو کے بے تاب
طوق گردن ہوا نہ گرداب

سایہ ہی نہ پڑ کے کاش سوتا
بیلا ہی گلے کا ہار ہوتا

صفی لکھنوی

امید و بیم

امید کے وعدہ ہائے رنگیں
مانند گلاب عطر آگیں
شیریں دل کش نظر میں مقبول
جیسے کھلتا ہوا کوئی پھول
لیکن ہے بیم خار سر تیز
دل کے لیے سخت وحشت انگیز
اس کی دھمکی ہی جاں ستاں ہے
گویا اک زخم خوں چکاں ہے
کاموں میں نہ ہونے پائے سستی
ملحوظ نظر رہے درستی
کیوں نفع کی رکھ کسی سے امید
کیوں بیم سے کانپ صورت بید
خاموش معاملات سلجھا
ہم واری طبع تا ہو پیدا

واجب کاموں میں کر نہ اہمال
ہو موت کا خوف بھی تو کر ڈال
لے خوف بدی سے کر تنفّر
لیکن زیبا نہیں تفاخر
نیک آدمیوں کا یہی ہے دستور
دل کو کر نیکیوں سے معمور

رکھ دل میں امید کامیابی
کاموں میں پڑے نہ تا خرابی
مایوسی کو سمجھ کے منحوس
کر دل کو کبھی نہ اس سے مانوس

نواب مرزا شوق

آرائش باغ

نظر آیا دونوں کو اک خانہ باغ — کہ بلبل کا دل جس کی فرقت سے داغ
مصفّا وہ نہر اس میں اک بے عدیل — کہے تو کہ ہے موج زن سلسبیل
ہزاروں سے یوں اس کے پانی رواں — کہ برسائے مینہ جس طرح آسماں
تھی سرسبز بوٹوں میں مہدی جہاں — وہ گویا زمرد کی تھیں ٹٹیاں
شجر اس کے تھے سب کے سب باثمر — قرینوں سے سب کچھ ادھر اور ادھر
روش صاف صاف آئینہ کی مثال — شجر وہ کہ گل چیں ہو جس سے نہال
ہوا کے وہ جھونکے عجب سرد سرد — کہ کشمیر کا تختہ جس سے ہو زرد
وہ انگور کی اک طرح دار بیل — جوانوں کو مستی ہو لڑکوں کو کھیل
وہ بلبل کے نالوں کی ہر سمت دھوم — وہ ہر سرو پہ قمریوں کا ہجوم
وہ نہروں کا پانی چمکتا ہوا — پھرے مست جیسے بہکتا ہوا
درختوں پہ بیٹھے ہوئے وہ طیور — دلوں کو ہو جن کی صدا سے سرور
پپیہے کی آواز لیتی تھی جاں — وہ کہتا تھا چلا کے جب پی کہاں
تھی حالت عجب جان مایوس کی — صدا جب کہ آتی تھی طاؤس کی

عجب دل پہ ہوتا تھا وحشت کا زور
منڈیروں پہ جب رقص کرتے تھے مور

مثنوی ترانۂ شوق

خاتمہ

نیرنگ سخن دکھا چکا تو   سر سجدے کو اے قلم جھکا تو
اللہ کا شکر آج ادا کر   ماتھا رگڑ اور یہ التجا کر
مقبول ہو یہ فسانۂ شوق   ہر بزم میں ہو ترانۂ شوق
شاخیں نکلیں نہ اس بیاں میں   پھولے پھلے گلشن جہاں میں
رکھیں رکھنے کو طعنہ زن حرف   لیکن رکھیں نہ اہل فن حرف
سمجھیں رنگینی سخن سے   لعل اگلے ہیں شوق نے دہن سے
بلبل کی نظر سے پھول گر جائے   پانی رنگ چمن پہ پھر جائے
زرد اس سے ہو پھول کا پیالہ   گل ہو جل کے چراغ لالہ
روشن ہو یہ خوبی معانی   قصہ یوسف کا ہو کہانی
صفحوں کی چمک دکھائے یہ روپ   سائے کے لباس میں چھپے دھوپ
چاند اپنے گال کو چھپا لے   بدلی کی نقاب رخ پہ ڈالے
آنکھوں میں رہے یہ نور بن کر   جا دل میں کرے سرور بن کر
عاشق اپنا خیال سمجھے   معشوق اپنا جمال سمجھے
ارباب سخن کریں مری قدر   چمکا کے بنائیں ذرّے کو بدر
میں ملک سخن میں کچھ نہیں ہوں   ہاں کشت سخن کا خوشہ چیں ہوں
جتنی مرے سخن کی ہے دھوم   سب ہے فیضِ اسیر مرحوم

اقبال

ساقی نامہ

شراب کہن پھر پلا ساقیا ۔۔۔ وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا ۔۔۔ مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر ۔۔۔ جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے ۔۔۔ نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر ۔۔۔ تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر ۔۔۔ زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے ۔۔۔ مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر ۔۔۔ یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات ۔۔۔ کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں ۔۔۔ مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز ۔۔۔ مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری ۔۔۔ امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت، آئینۂ روزگار ۔۔۔ غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل، مری رزم گاہ حیات ۔۔۔ گمانوں کا لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر ۔۔۔ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط راز پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے — تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہان مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاق دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات
بڑی تیز طوفاں بڑی زود رس — ازل سے ابد تک رم یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

حفیظ جالندھری

صحرا کی دعا

یہ تشنہ لب جماعت تھی یہاں پہ رک گئی آکر
دعا کی دامنِ صحرا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر

کہ اے صحرا کو آتش ناک چہرا بخشنے والے
رُخِ خورشید کو کرنوں کا سہرا بخشنے والے

ازل کے دن سے اب تک بھاڑ میں بھنتا رہا ہوں میں
صدائے رعد و باراں دور سے سنتا رہا ہوں میں

ہوا ہوں جب سے پیدا جان پانی کو ترستی ہے
مرے سینے کے اوپر آگ کی بدلی برستی ہے

میں سمجھا تھا مقدر ہو چکی ہے دھوپ کی سختی
مری قسمت میں لکھی جا چکی ہے سوختہ بختی

بنایا رفتہ رفتہ سخت میں نے بھی مزاج اپنا
لیا ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج اپنا

خبر کیا تھی الٰہی ایک دن ایسا بھی آئے گا
کہ تیرا ساقیِ کوثر یہاں تشریف لائے گا

اگر یہ بات پہلے سے مجھے معلوم ہو جاتی
مرے دل کی کدورت خود بخود معدوم ہو جاتی

خبر کیا تھی یہاں تیرے نمازی آکے ٹھہریں گے
شہید آرام فرمائیں گے، غازی آکے ٹھہریں گے

خبر کیا تھی ملے گی یہ سعادت میرے دامن کو
بنایا جائے گا فرش عبادت میرے دامن کو
خبر ہوتی تو میں شبنم کے قطرے جمع کر رکھتا
چھپا کر ایک گوشے میں مصفّا حوض بھر رکھتا
مرے سر پر سے گزرا نوح کے طوفان کا پانی
تاسّف ہے کہ مجھ سے ہو گئی اس وقت نادانی
اگر کرتا میں اس پانی کی تھوڑی سی نگہ داری
تو ہو جاتا مری آنکھوں سے چشموں کی طرح جاری
یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے نہاتے غسل فرماتے
حضور ساقی کوثر مری کچھ لاج رہ جاتی
مری عزت مری شرم عقیدت آج رہ جاتی
ترے محبوب کے پیارے قدم اس خاک پر آئے
الٰہی حکم دے سورج کو اب آتش نہ برسائے
جلیل الشان مہمانوں کا صدقہ مہربانی کر
عطا بحر رضوان کے لیے تھوڑا سا پانی کر
برائے چند ساعت ابر باراں بھیج دے یارب!
بہاراں بھیج دے یارب! بہاراں بھیج دے یارب!

علی سردار

سازِ حیات

(”نئی دنیا کو سلام“ علی سردار جعفری کی ایک طویل تمثیلی نظم ہے جو بلحاظ موضوع اور طرزِ بیان (ٹکنیک) اردو شعر و ادب کے لیے ایک نئی چیز ہے۔
یہ مختصر اقتباس نظم کی چھٹی تصویر سے منتخب کیا گیا ہے جہاں نامہ بر جاوید کا خط پڑھ کر مریم کو سناتا ہے)

اگر دل میں ہے آرزو کا سرور — تو ہے زندگی نغمہ و رنگ و نور
مسرت نہاں سنگ پاروں میں ہے — فضاؤں میں ہے شاخساروں میں ہے
ہوائیں بجاتی ہیں جب دم ستار — پہاڑوں پہ گاتے ہیں جب آبشار
ہرے ہوکے جب لہلہاتے ہیں کھیت — بھری دھوپ میں جب چمکتی ہے ریت
کرن پھوٹتی ہے جب افلاک سے — نکلتی ہیں جب کونپلیں خاک سے
افق سے ابلتا ہے جب رنگ و نور — ہواؤں میں اڑتے ہیں جب دم طیور
تو بجتا ہے دل میں خوشی کا رباب — مسرت پلاتی ہے آکر شراب
یہ دریا یہ وادی یہ صحرا یہ پھول — مسرت نے بھیجے ہیں اپنے رسول
کوئی شے نہیں ہے جہاں میں حقیر — لبوں کا تبسم نگاہوں کے تیر
یہ شبنم کے قطرے خس و خار پر — یہ ڈھلتی ہوئی دھوپ دیوار پر
یہ شاخوں میں ہنستی ہوئی پتیاں — یہ پانی کے چشمے یہ پگ ڈنڈیاں
یہ مکڑی کے جالے یہ چاندی کے تار — یہ پیڑوں کی گردن میں پھولوں کے ہار
یہ آندھی سے طوفان سے کم نہیں — سمندر کے ہیجان سے کم نہیں

انھیں سب سے مل کر بنی ہے حیات
یہ سانچے ہیں جن میں ڈھلی ہے حیات

مزید مطالعہ کے لیے :۔ ساقی نامہ، اقبال
نئی دنیا کو سلام، سردار جعفری
شاہ نامہ اسلام (اقتباسات) از حفیظ جالندھری
مثنوی صبح امید، شبلی نعمانی
برکھا رت، حب وطن، مناجات بیوہ حالی

مشقیں

ا۔ پرانے اور نئے طرز کی مثنویوں میں جو فرق ہے اس کا تفصیلی جائزہ لو۔

۲۔ قدیم مثنوی نگاروں بالخصوص نسیم اور شوق وغیرہ نے اپنے کلام میں رعایت لفظی کا بہت استعمال کیا ہے، اس سے کہیں حسن بیان میں اضافہ ہوا ہے اور کہیں تصنع کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ رعائت لفظی کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ کہیں مماثل الفاظ آتے ہیں۔ یعنی دونوں لفظ ایک ہی طرح کے لیکن معنوں میں اختلاف ہوتا ہے کبھی دوسرے لفظ میں ایک حرف زائد ہوتا ہے۔ کبھی حرکت میں فرق ہوتا ہے۔ حروف کی تعداد اور نقطے یکساں ہوتے ہیں۔ کبھی ایک حرف میں اختلاف ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں رعایت لفظی ہے۔ باغ۔ داغ، بھول۔ دھول، گرد۔ زرد، چھاؤں۔ پاؤں
پھول۔ خار، داغ۔ چراغ

۳۔ مندرجہ ذیل اشعار میں رعایت لفظی کی مثالیں چھانٹو۔

لبالب وہ چوپڑ کی پاکیزہ نہر — پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
او خار! پڑا نہ تیر اچنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل!

۴ــــ رعایت لفظی کی ایک قسم ترصیع ہے، جس میں ایک مصرع کے الفاظ دوسرے مصرع کے ہم وزن اور ہم قافیہ ہوتے ہیں، مندرجہ ذیل اشعار سے مثالیں چھانٹو۔

مسرت نہاں سنگ پاروں میں ہے ‏ ‏ ‏ فضاؤں میں ہے شاخ ساروں میں ہے
یہ دریا یہ وادی یہ صحرا یہ پھول ‏ ‏ ‏ مسرّت نے بھیجے ہیں اپنے رسول
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر ‏ ‏ ‏ زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے ‏ ‏ ‏ مری عشق میری نظر بخش دے

۵ــــ شبلی نے اپنے مضمون "میر انیس کی شاعری کے چند محاسن" میں جو صنائع بیان کیے ہیں، انھیں غور سے پڑھ کر، صنائع کی اور مثالیں حصۂ نظم سے تلاش کرو۔

قصائد

قصیدہ گوئی کوئی اعلیٰ اور اخلاق افروز صنف شاعری نہیں ہے۔اس کا فروغ درباروں سے وابستہ تھا جب کہ حکمراں اپنی مبالغہ آمیز تعریفیں سن کر شعرا کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا کرتے تھے۔اس صنف کی تمام تر بنیاد تملق، مبالغہ آمیزی اور خارجی صناعی پر قائم تھی۔اب نہ دربار ہے اور نہ درباداری اس لیے قصیدہ خوانی کا زور بھی اب بہت کم ہے۔ ہر چند کہ سرکاری حکام کے تبادلوں پر اب بھی کہیں کہیں قصائد سننے میں آجاتے ہیں مگر اب پہلے والی ہما ہمی نظر نہیں آتی۔

لیکن اس بیان سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ یہ صنف اردو شعر وادب کے لیے بے کار محض تھی۔سچ یہ ہے کہ اردو شاعری نے پرشکوہ انداز بیان، تسلسل مضامین، خارجی اشیا کے بیان، نادر تشبیہات واستعارات اور معنی خیز تراکیب والفاظ کے استعمال میں قصائد سے فیض حاصل کیا ہے۔اس صنف میں سوداؔ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے حمد و نعت، منقبت، مدح اور ہجو ہر قسم پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں جوش، روانی اور ندرت بیان ہے۔سوداؔ کے بعد ذوقؔ کا نمبر آتا ہے۔ انھوں نے بھی بہت سے قصائد لکھے ہیں اور بہت اچھے لکھے ہیں۔ غالبؔ اور مومنؔ نے بھی اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن یہ ان کے مذاق کی چیز نہ تھی۔تاہم ان قصائد میں کافی جدت، تازگی اور شگفتگی ملتی ہے۔

آخری دور میں امیرؔ مینائی، منیرؔ شکوہ آبادی اور جلالؔ مشہور قصیدہ گو شاعر گزرے ہیں۔ ان کے قصائد اپنے پیش روؤں کے طرز پر ہیں۔ان میں اسلوب کی کوئی ندرت نہیں ہے۔ دراصل مدحیہ قصائد میں معنوی حیثیت سے کوئی خاص تنوع

بھی نہیں ہوتا ۔ تشبیب و گریز میں ہر شاعر اپنی جدت طرازی دکھاتا ہے ۔ مگر جہاں تک نفس مطلب کا تعلق ہے ہر شاعر انتہائی مبالغہ آمیزی اور تملّق سے کام لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ اس باب میں دوسروں سے سبقت لے جائے ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں محسن کاکوروی اور عزیز لکھنوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ محسن نے نعتیہ قصائد بہت اچھے لکھے اور عزیز نے ائمہ کرام کی شان میں جو قصائد لکھے وہ زبان و بیان کی لطافتوں اور جدت طرازیوں سے آراستہ ہیں ۔

اس صنف میں ترقی کی راہیں مسدود ہیں ۔ یہ صنف ایک مخصوص کلچر اور تمدن سے تعلق رکھتی تھی ۔ اس کلچر اور تمدن کے مٹنے کے ساتھ یہ صنف بھی زوال پذیر ہو گئی ۔ اب بہ لحاظ صنف اس کی حیثیت محض تاریخی رہ گئی ہے ۔

سودا

قصیدہ در مدح نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر

کہے ہے کاتبِ دوراں سے منشیِ تقدیر — سمجھ کے دفترِ قسمت کیا کر اب تحریر
یہ روز و شب تو بنائے گا تا کجا اس طرح — کہ جامِ مہر میں آتش دے مہ کو کاسۂ شیر
رہائی اس میں ہے تیری کہ کاغذِ سابق — درست کر لے عطارد کو کر کے اپنا مشیر
سنا نہیں ہے کہ غازیِ دیں عماد الملک — جو میر بخشی تھا واں کا سو اب ہوا ہے وزیر
اگر طلب کرے کاغذ وہ تجھ سے اے ناداں — تو کر سکے گا بھر اس وقت اس کی کچھ تدبیر
دیا جواب یہ ان نے کہ میرے کاغذ میں — حضور اس کی کسی وجہ کی جو ہو تقریر
یقیں ہے خامۂ دستِ کرم سے اس کے مجھے — سوائے عفو مرے حق میں کچھ نہ ہو تحریر
غنی ہوا ہے یہ اس کے کرم سے ہر محتاج — کہ فرق ہو نہیں سکتا باہم امیر و فقیر
بیاں میں کیا کروں اس کی شجاعت ا کیس کو — یہ کہتے ہیں صفِ مرداں میں کیا جواں کیا پیر
عجب نہیں ہے کہ قالب تہی کرے مریخ — اگر وہ چرخ پہ چڑھتے سنے تری شمشیر
برش کی اس کے جو دہشت نہ ہو زمانے کو — تو ہووے رنگ نہ اس کا ہر ایک دم تغییر
جہاں کے باغ میں نقاش تیرے گل گوں کے — جو چاہیں شکل بنا دیں تو کیا کریں تدبیر
نہ دوں گا اس کو میں تشبیہ برق و آتش سے — ترے حضور کروں جست و خیز کی تقریر
نہیں ہے مرکزِ خاکی پہ اس کے جلدی کا — بجز طبیعتِ معشوق کچھ عدیل و نظیر
تری رکاب کے بوسے کی آرزو تھی و لے — نہ آیا اپنے تئیں ماہ نو سمجھ کے حقیر
ثنا میں صفحۂ کاغذ پہ تیرے ہاتھی کی — قلم کو ہاتھ میں لے کیا بیاں کروں تحریر
صفِ عدو کے لیے رزم میں ہے روزِ سیاہ — ہے شمعِ بزمِ محباں کے واسطے شبِ قیر

بجا ہے گر کہوں اس کو اندھیری ساون کی
چلے ہے مستی سے اس طرح جوں سحاب مطیر

زمیں کی چھاتی کو دابا ہے آ سیاہی نے
زبان خلق اسے کچھ کیا کرے تعبیر

بیاں میں کیا کروں سامان تیرے لشکر کا
کرے ہے کوچ کسی سمت جب وہ جمع کثیر

گماں میں خلق کے آتا ہے دیکھ کر یہ نگاہ
زمیں پہ ابر یہ چھایا ہے یا چلی ہے بہیر

ستم جہاں سے ترا عدل یوں کرے معدوم
کہ جیسے خاصۂ تریاق زہر کی تاثیر

یہ پرورش ہے جہاں کی تری عدالت سے
کہ شیر کا بچہ، گوسپند ہے ہم شیر

مدبری کی ترے کیا ثنا کرے کوئی
کہ جس کے حق میں یہ مطلع ہے مثل مہر منیر

نہیں ہے معجزِ عیسیٰ سے کم تری تدبیر
کیا ہے زندہ سر نو سے جس نے عالم گیر

اگرچہ فتح دکن بیچ جا کے اکبر نے
کیا ہے بھاگ نگر اور قلعۂ آمیر

عزیمت اسم کو تیرے اگر پڑھے کوئی
کرے وہ ہند میں بیٹھا ستارے کو تسخیر

غرض نہ خلق ہو دنیا میں آدمی تجھ سا
کریں جو خاک کو آدم کے لاکھ بار خمیر

پس اس طرح کے بشر کی کوئی ثنا مجھ سا
اگر کرے تو وہ ہوتا ہے واجب التعزیر

اگرچہ میں یہ قصیدہ کہا تو ہے لیکن
تری ثنا کی مصنف ہو یہ زباں تقصیر

کرے ہے عرض یہ سودا ہمیشہ عالم کا
رہے تو کارکشا اے امیر ابن امیر

گرہ جو کام میں اعدا کے تیری ہے اس میں
پڑے ہزار گرہ شکل دانۂ انجیر

ذوق

در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی — برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال ابروے پرخم سے اشارہ — ساقی کو کہ بھر بادے سے کشتی طلائی
ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سرخ — کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ مے کش کے حنائی
کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں — ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی
یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے — ہووے نہ تمیز کرۂ ناری و مائی
پہنچا کمکِ لشکر باراں سے ہے یہ زور — ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی
ہو قلزم عماں پہ لب جو متبسم — تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی
ہے کثرت باراں سے ہوئی عام یہ سردی — کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی
سردی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک — معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دست حنائی
عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے — گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی
کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش سے عالم — ہے مدرسے میں بھی سبق صرف ہوائی
خالی نہیں مے سے روش دانۂ انگور — زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ریائی
جو آئینۂ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں — گویا کہ ہے مینائے مئے کاہ ربائی
کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی — کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی
تھا سوزنی خار کا صحرا میں جہاں فرش — سبزے نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی
آرائش گلشن کے لیے جامۂ رنگیں — زیبائش غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل — برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ابرو یہ کرے قوس قزح وسمہ تو خورشید
سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی
رخسارۂ گل چیں کا ہے سرخی سے یہ عالم
جوں وقت غضب چہرۂ ترکان خطائی
کیا ساغر نگیں کو کیا جلد مہیّا
نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں اک ساغر گل کی
شاخ گل احمر کی نزاکت سے کلائی
اعجاز نواسنجی مطرب سے چمن میں
ہر خار کی ہے نوک زباں شعر نوائی
حیرت کی نہیں جائے کہ دیوار چمن پہ
ہر طائر تصویر یہ کرے نغمہ سرائی
شاہا ترے جلوے سے ہے یہ عید کی رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی
کہتے ہیں مہ نو جسے ابرو نے وہ تیری
کی آئینۂ چرخ میں ہے عکس نمائی
پرتو سے ترے جام مئے عیش سر بزم
لے ساغر جمشید کرے کار روائی
ٹپکے لب ساغر سے وہ قطرۂ کروی شکل
ہو مثل فلک جس میں تماشائے خدائی
کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہو سکے کاسہ میں سمائی
پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں
اَحسَنتَ کہیں سن کے بھائی وسنائی

یوں کرسی زر پہ ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سر رحل طلائی

رکھتا ہے تو وہ دست سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بہ کف از بہر گدائی
گم رہ کو ہدایت جو تری راہ پہ لاوے
رہ زن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی
تا ناخن شمشیر نہ ہو ناخن تدبیر
دشمن کی ترے ہو نہ کبھی عقدہ کشائی
خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی
عکس رخ روشن سے ترے جوں ید بیضا
کرتا ہے کف آئینہ اعجاز نمائی
کرتا ہے تری نذر سدا نقد سعادت
ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی
اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے
گر سر بہ ہوا ہو وے ترا تیر ہوائی

ہر کوہ اگر کوہ صفا ہو تو عجب کیا ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی
ہو بلکہ صفا ایسی دل سنگ صنم میں ہر بت میں کرے صورت حق جلوہ نمائی
ہر شعر غزل میں ترے معنی صفا ہیں قربان غزل کے تری دیوان شفائی
مانع جو ہوا دست دراز ی کو ترا عدل پروانہ کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی
زنجیر میں جوہر کے رہی تیغ ہمیشہ خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی
دیتا ہے دعا ذوق کہ مضمون ثنا میں ہے ذہن رسا گو یہ کہاں اس کی رسائی

ہر سال شہا ہو وے مبارک یہ تجھے عید
تو مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

غالبؔ

قصیدہ در مدح بہادر شاہ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا! اے سرورِ خاصِ خواص — حبّذا! اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روز بہ سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص
گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گل فام
جب کہ چودہ منازل فلکی
کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر عام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف
نوبہار حدیقۂ اسلام
اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

وارث ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

منیر شکوہ آبادی

در تہنیت غسل صحت نواب تجمل حسین خاں فرخ آباد

قلزم فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر
اپنے کوزے میں لیے پھرتے ہیں دریا گوہر

دست گیری ہوئی پامالوں کی کس کو منظور
آبلوں سے ہوئے کس واسطے مانا گوہر

کس خدادوست کے ہاتھوں میں پہنچنے کے لیے
کرتے ہیں دانۂ تسبیح سے رشتا گوہر

غسل صحت کی خوشی کون سے فیاض نے کی
کس کے صدقے کے لیے لائے ہیں دریا گوہر

یارب آئی ہے یہ کس کی شب جشن عشرت
آج تاروں کے لٹاتا ہے مسیحا گوہر

محفل رقص میں کس نے یہ گہر باری کی
چرخ سے لوٹنے کو آئی ہے زہرا گوہر

وہ فلک مرتبہ نواب نصیر الدولہ
صدف قدرت حق کا ہے جو یکتا گوہر

دست پر نور سے سائل کو جو بخشا گوہر
ہو گیا دست گدا میں ید بیضا گوہر

فیض بالا سے نہیں اہل عدم بھی محروم
فرط بخشش سے ہوئے بیضۂ عنقا گوہر

آپ کے فیض نے جب ابر کرم برسایا
رعد کے بدلے گرجنے لگے کیا کیا گوہر

تیرے دریائے کرم کی نہ ملے گی کبھی تھاہ
آب میں اپنے عبث کھاتے ہیں غوطا گوہر

تیز ایسا ہے یہ گھوڑا دم رفتار اگر
پھینک دو ڈھال جگہ میں کوئی اچھا گوہر

شش جہت میں یہ فلک سیر پھر آئے جا کر
ایک پہلو بھی نہ بدلے ابھی اصلا گوہر

ہاتھی ایسا ہے سبک رو کہ قدم سے جس کے
ٹوٹنا کیا کہ نہ ہو نام کو میلا گوہر

پانی خرطوم سے پھینکا تو بنا در خوش آب
برسے اس ابر سیہ مست سے کیا کیا گوہر

دیکھ کر موتیوں کی جھولی یہ سب کہتے ہیں
پہنے پھرتی ہے عروس شب یلدا گوہر

ختم کرتا ہے دعا پر تری تعریف منیر — ہاتھ آتا نہیں اب نظم کا اچھا گوہر
ابر نیساں رہے جب تک کہ درافشاں یارب! — قلزم دہر میں جب تک کہ ہوں پیدا گوہر
میرے نواب ہمیشہ ہوں صحیح و سالم — مسند آرا رہے تا حشر یہ والا گوہر
عمر و اقبال زیادہ ہو عطا ہو فرزند — روز برسیں در دولت پہ خدایا گوہر
اپنے مداح کی اب عرض خداوند نہیں — نذر کے واسطے لایا ہوں میں کیا کیا گوہر
سچ یہ ہے آپ سخن گو بھی سخن فہم بھی ہیں — دیکھیے ان میں سے کوئی نہیں چھوٹا گوہر

منہ مرا گوہر انعام سے ہو مالامال
دہن فکر کے ہوں دانت سراپا گوہر

امیر مینائی

در مدح نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور

شش جہت میں ہے جو یہ خورشید یکتائے جہاں — گرد پھر پھر کر فدا ہوتے ہیں ساتوں آسماں
حبّذا وہ چشم جس کو ہو قدم بوسی نصیب — حبّذا وہ سر جو ہو صرفِ سجودِ آستاں
اے خوشا وہ سرزمیں جائیں جدھر اس کے قدم — اے خوشا کشور پھرے جس کی طرف اس کی عناں
مرحبا اس کو جو صبح و شام ہے اس کا مطیع — آفریں اس کو جو روز و شب ہے اس کا مدح خواں
ہے وہی دل جس میں ہے اس کی محبت کا مقام — ہے وہی سینہ ہے جس میں اس کی الفت کا مکاں
رستمی میں رشکِ رستم زور میں افراسیاب — ہمت عالی میں حاتم، عدل میں نوشیرواں
طفلِ مکتب ہے ارسطو وہ جہاں دے درسِ علم — روبرو اس کے فلاطوں، عامی کج مج زباں
شان دارائی کرے نظارہ دارا سے کہو — شوکت و اقبال کو دیکھے سکندر ہے کہاں
فی الحقیقت ختم ہے اس پر رعایا پروری — واقعی ایسا شریفوں کا کہاں ہے قدرداں
دست گیری کی ضعیفوں کی قوی بازو ہوئے — حق یہ ہے محنت نہیں جاتی کسی کی رائگاں
شہرۂ بخشش سے خلقت ہے در دولت پر جمع — جیسے مسجد میں مصلّی آتے ہیں سن کر اذاں
آئے اس کے سامنے مقصود کو پہنچے وہ پیر — ڈھونڈھتے تھے موسمِ طفلی سے جو بخت جواں
قلب روشن ہے وہ آئینہ کہ جس میں مثلِ عکس — صاف آتے ہیں نظر اشکالِ اسرارِ جہاں
شہر گلشن بت کدہ، مے خانہ، مسجد، خانقاہ — سب ہیں خالی در پہ اس کے جمع ہے سارا جہاں
دامنِ لطف و کرم جب تک نہ تھا اس کا دراز — تھا سفینۂ آرزوئے خلق کا بے بادباں
خاک کو اس کی نگاہِ مہر کر دیتی ہے زر — جیسے نخلِ تازہ اعجازِ نبی سے استخواں
عہد نصفت عہد میں سرکش نظر آتے نہیں — خوف کے مارے ہے آتش سنگ و آہن میں نہاں

جس طرف چاہے اسے پھیرے اسے ہے اختیار
ابلق ایام کی ہے دست قدرت میں عناں

زور بازو دے توانا سے کبا دہ ہو گئی
پہلوانوں سے نہ کھنچ سکتی تھی جو مطلق کماں

ہمت عالی سے ہیں دل ہائے عالم مطمئن
ہے عصائے پیر حرز طفل شمشیر جواں

ذکر خط کیا خط پیشانی کو پڑھ لیں کم سواد
بہر کحل چشم لے جائیں جو خاک آستاں

تا کجا طول سخن اب ہے مناسب اختصار
کس سے ہو سکتا ہے اوصاف معلّیٰ کا بیاں

جب تلک روشن رہیں افلاک پر خورشید و ماہ
جب تلک گردش کرے روئے زمین و آسماں

جب تلک ہو سنگ سے پیدا آتش یاقوت و لعل
جب تلک شاخوں سے غنچے گل ہوں غنچوں سے عیاں

مثل گل احباب تیرے اس چمن میں سرخ رو
روئے دشمن زرد یارب صورت باد خزاں

عزیزؔ لکھنوی

قندیل حرم

لے گئے روح مری جلوہ دکھانے والے
ہوش میں آئیں مجھے ہوش میں لانے والے

میں کوئی صفحۂ ہستی پہ نہیں حرف غلط
دیکھوں کس طرح مٹاتے ہیں مٹانے والے

وقت زینت بھی کیا کرتے ہیں مشق بے داد
زلف کے ساتھ نئی بات بنانے والے

غور سے دیکھ ٹپکتی ہیں لہو کی بوندیں
دل خوں گشتہ کے مٹھی میں چھپانے والے

میں ہوں دیدار کا مشتاق اجل سر پہ کھڑی
جلد آئیں سر بالیں کہیں آنے والے

اب جو الٹی بھی نقاب آپ نے رخ سے تو کیا
مر گئے طاقت نظارہ دکھانے والے

کچھ خبر ہے تری رفتار سے کیا عالم ہے
اے نشان گور غریباں کے مٹانے والے

حضرت ناصح فاضل سے بنے گی کیوں کر
اور اک آئے ہیں دیوانہ بنانے والے

شغل اچھا ہے سر گور غریباں لیکن
اپنے دامن کو بچا شمع بجھانے والے

جائیے جائیے ہم مر کے بھی ہوں گے یہیں دفن
بڑے آئے ہمیں محفل سے اٹھانے والے

پھر دل گم شدہ کو پوچھ رہا ہوں تجھ سے
پھر کوئی بات بنا بات بنانے والے

آج کعبہ میں سراغ دل گم گشتہ ملا
یوں پتا دیکھ لگاتے ہیں لگانے والے

بن گیا شمع زچہ خانہ زہے حسن فروغ
یا رب آباد رہیں اس کے جلانے والے

ہاں کہو نعرۂ مستانہ سے اب صل علیٰ
آتے ہیں کعبہ سے وہ راہ دکھانے والے

کھل گئی فرط مسرت سے حرم کی دیوار
آ گئے خانۂ کعبہ کے ہنسانے والے

کھول دے آنکھ ذرا دیر سے پھیلائے ہیں گود
اپنے بستر پہ شب ہجر سلانے والے

پہلے ہی روز زباں منہ میں دیے دیتے ہیں
کیا کیا تو نے محبت کے بڑھانے والے

چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا پھول ہے
چادرِ مہتاب ہے فرشِ فضائے بوستاں

جس طرف دیکھو زرِ گل باغ میں انبار ہے
شکلِ فوارہ ابلتی ہے زمیں گنجِ نہاں

غنچہ و سوسن سے کیا ہو شکرِ احسانِ بہار
وہ زبانِ بے دہن ہے یہ دہانِ بے زباں

مصر کا بازار کہیے باغ کے بازار کو
گل ہے یوسف گرد اس کے بلبلوں کا کارواں

مومن و کافر سے کہہ دو آئیں سب گل زار میں
عمر کرتے ہیں عبث دیر و حرم میں رائگاں

جس کی کرتے ہیں پرستش جس کی کرتے ہیں طلب
ان مکانوں میں ہے پوشیدہ یہاں ہر سو عیاں

آئینہ خانہ ہے گلشن آئینہ ہے برگ برگ
جلوہ گر ہے ہر طرف رنگِ بہارِ بے خزاں

گرچہ صحنِ باغ میں ہر سال آتی ہے بہار
اور آتا ہے نظر رنگِ زمین و آسماں

ہے سبب اس کا کہ اس روز ہوا مسند نشیں
سروِ گل زارِ ریاست صاحبِ بخت و جواں

منبعِ جود و سخاوت معدنِ لطف و کرم
ماہِ اوجِ چرخِ قدرت مہرِ اوجِ کن فکاں”

انتخابِ صنعِ حق، عالی نسب والا حسب
روحِ جسمِ انس و جاں، فخرِ زمین و آسماں

نام نامی وہ کہ ہے سب کے نگینِ دل پہ نقش
نام ور کلب علی خان بہادر نوجواں

جلالؔ لکھنوی

قصیدہ درجشن شادی عروسی ولی عہد بہادر

(پورا قصیدہ نہایت شاندار ہے مگر اس کی تشبیب اور گریز تو خاص طور سے نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہے۔ اس میں بڑی ندرت اور تازگی ہے)

تشبیب در مناظرۂ رنگ و بو

صبا جو لے گئی کل مجھ کو جانب گلشن
بہم مناظرہ آرا تھے رنگ و بوئے چمن

یہ اپنی شوخیوں کی مدح میں سخن پیرا
وہ اپنی خوبیوں کے وصف میں تھی گرم سخن

یہ کہہ رہا تھا کہ صدقے ہے مجھ پہ شاہد گل
وہ کہہ رہی تھی کہ مجھ پر فدا عروس چمن

یہ کہہ رہا تھا کہ گل اک مری دریدہ قبا
وہ کہہ رہی تھی کہ سنبل مرا لباس کہن

اسے تھا ناز بہار چمن مرا گل گوں
اسے تھا ناز کہ باد صبا مرا توسن

اسے تھا ناز کہ میں ہوں شراب کی شوخی
اسے تھا ناز کہ میں ہوں گلاب کا جوبن

اسے تھا ناز میں اک شاہد پری پیکر
اسے تھا ناز میں اک نازنین نازک تن

اسے تھا ناز کہ نوشاہ مجھ میں ڈوبا ہے
اسے تھا ناز کہ مجھ میں بسی ہوئی ہے دلھن

اسے تھا ناز کہ مجھ پر بسی ہوئی ہے حنا
اسے تھا ناز کہ مجھ سے بسے ہوئے ہیں چمن

اسے تھا ناز کہ میری کلاہ ہے شوخی
اسے تھا ناز کہ فتنہ ہے میرا پیراہن

یہ مدعی لب گل برگ کا میں رنگ بیاں
وہ مدعی دہن غنچہ کی میں بوئے سخن

یہ مدعی کہ مری شوخیاں ہیں ہوش ربا
وہ مدعی کہ مری سنیاں ہیں توبہ شکن

یہ مدعی کہ ادائیں مری نگاہ فریب
وہ مدعی کہ مرے ناز ہوش کے رہ زن

یہ مدعی لب گل برگ پر مرے اوصاف
وہ مدعی کہ مری گفتگو میں ہے سوسن

یہ مدعی کہ ثنا خواں ہے عندلیب مری
وہ مدعی کہ مرے وصف میں ہے چہچہہ زن

اسے تھا فخر کہ لعل یمن کا فخر ہوں میں
اسے تھا فخر کہ نازاں ہے مجھ پہ مشک ختن

اسے تھا فخر کہ گھر میرا لالہ زار نشاط
اسے تھا فخر کہ گل زار عیش میرا وطن

اسے تھا فخر کہ میرا مقام محفل جشن
اسے تھا فخر کہ عشرت سرا مرا مسکن

میں سن رہا تھا کھڑا بحث رنگ و بو چپکا
برنگ غنچہ گل گوش شوق تھا ہمہ تن

صدائے انجمن جشن گوش زد جو ہوئی
مخاطب ان سے ہوا رنگ طبع چہچہہ زن

وہ کیسا جشن ہے تم دونوں جس پہ ہو نازاں
وہ کیسی بزم ہے تم دونوں کا جو ہے مسکن

کہا یہ رنگ نے اک جشن ہے وہ رشک خلد
کہا یہ بو نے کہ اک بزم ہے وہ رشک چمن

وہ شاہ زادہ ولی عہد ہے لقب جس کا
بنائیں گے اسے نوشاہ زیر چرخ کہن

یہ مژدۂ طرب افزا جو رنگ و بو نے دیا
ترانہ سنج ہوا مرغ خوش نوائے سخن

محسن کاکوروی

بے بسی کا اظہار

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا — تڑپنے لگا دل اچھلنے لگا
زمیں تک مرے آنسو آنے لگے — فلک تک مرے نالے جانے لگے
مری چشم تر کا یہ کیا حال ہے — کہ دامن سے تا آستیں لال ہے
مرا رنگ فق ہوتا جاتا ہے کیوں — بدن خود بخود سنسناتا ہے کیوں
سبب کیا کہ میں سر کو دھننے لگا — ہوا کیا کہ میں تنکے چننے لگا
ہنسی میں مرے آنسو بہنے لگے — مجھے لوگ سودائی کہنے لگے
نیا راگ لائی مری بے کسی — چھٹا دیس جنگل کی دھن ہو گئی
مرے منہ پہ زردی سی کیوں چھا گئی — چمن میں مرے کیوں خزاں آ گئی
چمن سے مجھے شوق صحرا ہوا — نئے رنگ کا مجھ کو سودا ہوا
خزاں آئے تو دل کو کھٹکا نہیں — بہار آئے تو مجھ کو پروا نہیں
طبیب آئیں بالیں پہ تو دم گھٹیں — مری نبض دیکھیں تو نبضیں چھٹیں
عجب طرح کا ہے یہ دیوانہ پن — نہ شوق خموشی نہ ذوق سخن
اگر بے محل گفتگو کی ٹھنی — ملا نطق کو خلعت سوسنی
خموشی ہوئی گر بجائے سخن — ملا نالہ کو سرمئی پیرہن
جو سوتے ہیں شب کو رہی بے کلی — تو خواب پریشاں سے نیند اڑ گئی
جو دن کو بھی سوز باطن رہا — تو دن بھر مرا کیا برا دن رہا

کبھی میری کیفیت ایسی نہ تھی
یہ شورش یہ سوزش یہ گرمی نہ تھی

نہ ایسی کبھی بے قراری ہوئی
نہ مجھ پر غشی ایسی طاری ہوئی

نہ آنکھوں کے پردے گلابی ہوئے
نہ تار آنسوؤں کے شہابی ہوئے

گھڑی بھر میں ہیں ہوگیا گرد برد
ستم ہے، غضب ہے، کلیجے کا درد

نہ کیا کیا ہوس زندگانی کی تھی
مگر موت آنی جوانی کی تھی

کوئی دم میں دم ہی نکلتا ہے آج
کلیجا مرا کوئی ملتا ہے آج

چلی آتی ہیں، ہچکیاں دم بدم
مجھے یاد کرتے ہیں اہل عدم

اندھیرا مری آنکھوں میں چھا گیا
جبیں پر تو دیکھو عرق آگیا

تڑپنے مجھے دو نہ بولو ذرا
مرے ہاتھ اور پاؤں کھولو ذرا

نہ للہ مجھ کو سنبھالے کوئی
مرے منہ میں پانی نہ ڈالے کوئی

سبک روحی یاروں کو دکھلاؤں میں
کہ بو ہو کے غنچہ سے اڑ جاؤں میں

میں کس واسطے خاطر آزار ہوں
کسی کے دل و دوش کا بار ہوں

ہو آنکھوں سے آب رواں موج زن
اسی میں نہاؤں وہی ہو کفن

مرے فاتحہ کو نہ آئے کوئی
جنازہ نہ میرا اٹھائے کوئی

نہ قل ہو نہ پھول اور میلہ رہے
مرا مردہ سب سے اکیلا رہے

نہ شمع لحد کا بھی آنسو بہے
فقط بے کسی مجھ کو روتی رہے

خفا کر کے محسنؔ نہ پھیریں مجھے
فرشتوں سے کہہ دو نہ گھیریں مجھے

سمجھتا نہیں ہیں حساب و کتاب
یہ رکھتا ہوں اک مختصر سا جواب

نہ میں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی
مگر سجدۂ آستانِ نبی

مراثی

مرثیہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ کسی عزیز کے انتقال پر مرنے والے کی توصیف اور اظہار غم ایک قدرتی بات ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس کا وجود اردو شاعری کی ابتدا سے ملتا ہے۔ پرانے شعرا مرثیہ گوئی کو حصول ثواب کا ذریعہ سمجھتے تھے، اسی لیے عرصہ دراز تک مرثیہ محض مذہبی فریضہ سمجھ کر لکھا اور پڑھا جاتا رہا۔ سودا سے پہلے نہ تو اس کی کوئی شکل متعین تھی نہ اس کی کوئی ادبی حیثیت قائم ہوئی تھی۔ بالآخر شاہان اودھ کے زمانہ میں اس صنف کو بے حد فروغ ہوا اور اس کی ایک مستقل شکل اور حیثیت متعین ہو گئی۔

مرثیہ نے لکھنؤ کی شاعری پر دور رس اثرات ڈالے۔ غزلوں میں بھی مرثیہ کا رنگ جھلکنے لگا۔ گریہ، ماتم، میت، کفن، تربت اور گور غریباں وغیرہ الفاظ لکھنؤ کی غزل کے علامات بن گئے۔ مرثیہ نے اردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا۔ اردو میں (Epic) اور (Ballad) قسم کی طویل مسلسل نظمیں نہیں ملتیں۔ ان کی کمی اگر پوری ہوتی ہے تو مرثیوں سے جن میں رزم و بزم اور ماتم و بین سبھی کچھ ملتا ہے۔ مرثیہ نے جذبات نگاری، کردار نویسی، اخلاق، منظر نگاری، اور مذہبی اور نیم مذہبی تاریخی واقعات کو مسلسل نظموں میں پیش کر کے اردو شاعری کے دامن کو وسعت بخشی۔

عزیز لکھنوی

قندیل حرم

لے گئے روح مری جلوہ دکھانے والے
ہوش میں آئیں مجھے ہوش میں لانے والے

میں کوئی صفحۂ ہستی پہ نہیں حرف غلط
دیکھوں کس طرح مٹاتے ہیں مٹانے والے

وقت زینت بھی کیا کرتے ہیں مشقِ بیداد
زلف کے ساتھ نئی بات بنانے والے

غور سے دیکھ ٹپکتی ہیں لہو کی بوندیں
دلِ خوں گشتہ کو مٹھی میں چھپانے والے

میں ہوں دیدار کا مشتاق اجل سر پہ کھڑی
جلد آئیں سرِ بالیں کہیں آنے والے

اب جو الٹی بھی نقاب آپ نے رخ سے تو کیا
مر گئے طاقتِ نظارہ دکھلانے والے

کچھ خبر ہے تری رفتار سے کیا عالم ہے
اے نشاں گورِ غریباں کے مٹانے والے

حضرتِ ناصحِ فاضل سے بنے گی کیوں کر
اور اک آئے ہیں دیوانہ بنانے والے

شغل اچھا ہے سرِ گورِ غریباں لیکن
اپنے دامن کو بچا شمع بجھانے والے

جائیے جائیے ہم مر کے بھی ہوں گے یہیں دفن
بڑے آئے ہیں محفل سے اٹھانے والے

پھر دلِ گم شدہ کو پوچھ رہا ہوں تجھ سے
پھر کوئی بات بنا بات بنانے والے

آج کعبہ میں سراغِ دلِ گم گشتہ ملا
یوں پتہ دیکھیے لگاتے ہیں لگانے والے

بن گیا شمعِ زچہ خانہ زہے حسن فروغ
یارب آباد رہیں اس کے جلانے والے

ہاں کہو نعرۂ مستانہ ے اب صلِّ علیٰ
آتے ہیں کعبہ سے وہ راہ دکھلانے والے

کھل گئی فرطِ مسرت سے حرم کی دیوار
آ گئے خانۂ کعبہ کے ہنسانے والے

کھول دے آنکھ ذرا دیر سے پھیلائے ہیں گود
اپنے بستر پہ شبِ ہجر سلانے والے

پہلے ہی روز زباں منہ میں وہ دے دیتے ہیں — کیا کیا تو نے محبت کے بڑھانے والے

ابروؤں کا یہ اشارہ ہے کہ ہم ہیں دیکھو — تیغ سے ہیبتِ اسلام بڑھانے والے

دیکھ کر ان کی کلائی کو یہ کہتے ہیں رسول — ہیں یہ چولیں درِ خیبر کی ہلانے والے

اب زباں روک لے معبود نصیری للہ — بھول جائیں نہ خدا کو یہ زمانے والے

دوش پر چڑھ کے مرے کاسرِ اصنام بنو — کہتے ہیں بارِ امامت کے اٹھانے والے

آمرے پاس ذرا تیرے قدم تو چوموں — اے سرِ دوش نبی نقش بٹھانے والے

دیکھ کر فاطمہ کا چاند پکارا اسلام — تیرے قربان مری جان بچانے والے

بذل دیکھو تو یہ کہتا ہے قیافہ ان کا — کاسۂ شیر ہیں قاتل کو پلانے والے

شوق سے مشقِ ستم کر کہ خدا راضی ہے — بت ہیں کعبہ کے ترے ناز اٹھانے والے

بزمِ وحدت سے ملا تجھ کو یداللہ لقب — کیا کشش تھی تری اے ہاتھ ملانے والے

لے کے آغوش میں کہتے ہیں نبی کھول آنکھیں — بختِ خوابیدۂ اسلام جگانے والے

ہاتھ نکلا تھا یہ کس کا شبِ معراج بتا — پردۂ رازِ حقیقت کے اٹھانے والے

سقفِ کعبہ پہ اذاں پہلے پہل دی جاکر — اے مرے رونقِ اسلام بڑھانے والے

تیری کوشش کا صلہ آج ملا ہے مجھ کو — کیوں نہ ہو کیوں نہ ہو کعبے کے بنانے والے

لافتیٰ کہتے ہیں جبریلِ امیں سن تو سہی — کلمہ اپنی فتوت کا پڑھانے والے

کس کا فرزند ہوا گھر میں خدا کے پیدا — کیا کہوں بات بڑھا دینگے بڑھانے والے

دورِ آخر ہے کہیں بھول نہ جانا للہ
ہم بھی ہیں اے مئے کوثر کے پلانے والے

مزید مطالعہ کے لیے :- انتخاب سودا از ثاقب کانپوری
قصائد ذوق از دیوان ذوق

مشقیں

۱۔ قصائد کے جو اقتباسات اس کتاب میں ہیں ان کے علاوہ کچھ اور قصائد کا بھی مطالعہ کرو۔

۲۔ قصائد کے بیان میں تم نے پڑھا ہے کہ شعرا اپنے ممدوح کی مبالغہ آمیز تعریفیں کرتے تھے، اس لیے قصائد میں بالعموم مبالغہ کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ مبالغہ شاعری کی ایک صنعت ہے بشرطیکہ مبالغہ، حد کے اندر ہو۔ پڑھے ہوئے قصائد سے صنعت مبالغہ کی مثالیں تلاش کرو اور ان کا موازنہ کرو۔

۳۔ امیر مینائی اور جلال لکھنوی کے قصائد پر غور کرو، ان میں نہایت شگفتہ اور مترنم تراکیب استعمال ہوئی ہیں اور سب میں چمن اور بہار کی رعایت ہے۔ ان تراکیب کی تشریح کرو اور ان کی قسمیں بتاؤ۔

۴۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے پانچ پانچ قوافی لکھو۔

عدم، بار، حنا، تاب، سخن

۵ ـــ مندرجہ ذیل اشعار میں خالی جگہ بھرو۔

قلزم فیض سے کس کے ہوئے ـــــ گوہر
اپنے کوزے میں لیے ـــــ دریا گوہر
ابر نیساں رہے جب تک کہ ـــــ یارب!
قلزم دہر میں جب تک کہ ہوں ـــــ گوہر
دست گیری کی ـــــ کی قوی بازو ہوئے
حق یہ ہے ـــــ نہیں جاتی کسی کی رائگاں
شہرۂ بخشش سے ـــــ ہے در دولت پہ جمع
جیسے مسجد میں ـــــ آتے ہیں سن کر اذان

۶ ـــ ان قصائد سے تشبیب کے اشعار چھانٹو اور بتاؤ کہ تمھارے خیال میں کس قصیدے کی تشبیب زیادہ اچھی ہے۔

مراثی

مرثیہ نگاری اردو شاعری کی ایک اہم اور قدیم صنف ہے ۔ اس کا سراغ تو اسی وقت سے ملتا ہے جب کہ اردو شاعری وجود میں آئی تاہم سوداؔ سے پہلے نہ تو اس کی کوئی شکل متعین تھی اور نہ اس کی کوئی ادبی حیثیت قائم ہوئی تھی بشاہان اودھ کی ادب نوازی اور حوصلہ افزائی کی بدولت اسے لکھنؤ میں بے حد فروغ حاصل ہوا اور اس کی ایک مستقل حیثیت متعین ہو گئی۔

میر خلیقؔ اور ضمیرؔ کے زمانہ میں مذہبی مرثیہ کی ایک شکل مخصوص ہو گئی۔ اب مراثی مسدس کی شکل میں نظم ہونے لگے ۔ ان اساتذۂ کرام کے بعد انیسؔ و دبیرؔ نے اس صنف میں چار چاند لگا دیے ۔ یہ دونوں حریف بزم میدان ادب میں اترے اور ان کی معرکہ آرائیوں سے لکھنؤ کی ادبی فضا گونجنے لگی ۔ "انیسیوں" اور "دبیریوں" کی بحثیں آج تک لکھنؤ میں گرمیِ محفل کا سبب بنی ہوئی ہیں ۔ ہرچند کہ دبیرؔ بھی ایک قادرالکلام شاعر تھے مگر جو تاثیر اور فن کارانہ حسن انیسؔ کے کلام میں ملتا ہے وہ دبیرؔ کے کلام میں نہیں ملتا۔

دور حاضر میں جوشؔ اور حفیظؔ نے عام روش سے گریز کر کے مراثی لکھے ہیں۔ جوشؔ کی نظمیں پڑھ کر ہم صرف امام کی مظلومی اور مجبوری پر ماتم نہیں کرتے اور آنسو نہیں بہاتے بلکہ ان کی خودداری، عزم محکم اور بلندی ہمت کے آگے سر عقیدت خم کرتے ہیں۔ وہ حضرت امام حسین کی عظیم الشان قربانی کا واسطہ دے کر حکمراں قوم کے ظلم و تشدد کا مقابلہ کرنے کا پیغام قوم کو دیتے ہیں۔

عام طور سے لوگ مرثیہ کا مطلب محض واقعات کربلا کا بیان ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے ۔ خوشی اور مسرت کے بیان کے ساتھ ساتھ رنج وغم اور اپنے عزیزو اقارب کی وفات پر سوگ کا اظہار زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ شاعرانہ زبان میں اسی اظہار کو مرثیہ کہتے ہیں ۔ یہ ایک مفید اور کارآمد صنف سخن ہے جس کے ذریعہ شاعر غم انسانی کا شریک بن سکتا ہے ۔ چنانچہ غالبؔ کا مرثیۂ عارف، حالیؔ کا مرثیۂ غالب، چک بست کے مراثی، شبلیؔ کا مرثیۂ اسحاق، اقبالؔ اور مولانا احسنؔ کا مرثیۂ داغ اسی زمرے کی چیزیں ہیں ۔ انتخاب میں ہر قسم کے مرثیے کا نمونہ ملے گا۔

انتخاب میں ایک خاص اصول سے کام لیا گیا ہے ۔ میر انیسؔ کے ایک مشہور مرثیے کا طویل اقتباس منتخب کیا گیا ہے تاکہ ہر قسم کے قدرتی مناظر اور انسانی جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کا نقشہ طلبہ کے سامنے کھنچ جائے ۔ پچھلے نصاب میں دبیرؔ کا مرثیہ کورس سے خارج کر دیا گیا تھا اس لیے محض تین مختصر اقتباسات شامل کئے گئے ہیں جس سے طلبہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے طرز کلام کا فرق محسوس کر سکیں ۔ ان کے علاوہ مراثی کے چند مختلف نمونے بھی شامل کر دیے گئے ہیں ۔

مرزا غالب

(مرثیہ عارف)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری کہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

میر ببر علی انیس

صبح کا منظر

نظم کی یہ شکل مسدس کہلاتی ہے اور اردو میں بے حد مقبول ہے۔ ہر بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے جس میں پہلے چار مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔ پانچواں اور چھٹا مصرعہ آپس میں ہم قافیہ مگر اوپر کے چار مصرعوں سے جدا قوافی میں ہوتے ہیں۔ پانچویں اور چھٹے مصرعہ سے جو شعر بنتا ہے اسے اصطلاح میں گرہ یا بیت کہتے ہیں۔ گرہ کا شعر عموماً بہت زوردار ہوتا ہے۔

پھولا شفق[۵] سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گل زارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح — سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گذارِ صبح

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

---

۵ صبح کا منظر، گرمی کا سماں اور تلوار وغیرہ عنوانات کے تحت میں جو بند منتخب کیے گئے ہیں وہ مرثیہ کی تعریف میں نہیں آتے لیکن ان کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ مرثیہ کا جزو ہیں۔ انیس و دبیر وغیرہ کے مرثیوں میں صرف رنج والم کا اظہار اور گریہ و بین نہیں ہوتا بلکہ ان میں مناظر فطرت اور رزم بزم کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ ان کے مرثیے طویل ہوتے ہیں اور ان میں خارجی اشیا اور مناظر کا بھی تفصیلی اور مؤثر بیان ہوتا ہے۔

خالص مرثیہ کے نقطہ نظر سے "حر کی شہادت" اور "شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام" عنوانات کے تحت میں چند بند منتخب کئے گئے ہیں۔

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بہ دم   مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم   سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار   تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار   کو کو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں   تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں   نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

گرمی کا سماں

وہ لو، وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب   کالا تھا رنگ، دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب   خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا
شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے   آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے

آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے   گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں   انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں   تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب   چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب   کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

تلوار

چمکی، گری، اٹھی، ادھر آئی، ادھر گئی   خالی گئے پرے، تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم، کبھی بالائے سر گئی   ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی
غل تھا یہ کیا ہے آج جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں
بجلی گری کہ فوج پہ تیغِ دو سر گری   کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ، کبھی فرق پر گری   سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری

زرہیں تنوں میں مثل کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف پر کالے اڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف
خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئی شاخیں کمان کی

کیا کیا چمک دکھائی تھی سر کاٹ کاٹ کے تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانیے ملا تھا مزہ کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

حُر کی شہادت

سینہ سے جب کہ ہو گئی برچھی ستم کی پار گھوڑے پہ ڈگمگانے لگا حُرّ نامدار
رکھ کر جگر پہ ہاتھ پکارا وہ دل فگار اے فاطمہ کے لال یہ خادم ہوا نثار
اب شفقتِ امامِ حجازی کا وقت ہے
آقا یہی غلام نوازی کا وقت ہے

جس دم سنی امامِ امم نے صدائے حر چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولے کہ ہائے
رو کر کہا رفیقوں سے دیکھی وفائے حر خیمے میں پیٹنے لگی زینب برائے حر

کھینچی جو شہ نے آہ دلِ بے قرار سے
نکلی تڑپ کے فاطمہ زہرا مزار سے

دوڑے ادھر سے رن کی طرف سیدِ امم — آئے نجف سے حیدرِ صفدر بچشمِ نم
آواز دی نبی نے کہ حر کو لئے ہیں ہم — اس وقت پہونچے شاہ کہ وہ توڑتا تھا دم
سر کاٹنے کی فکر میں جو تھے وہ ہٹ گئے
مہماں سے اپنے دوڑ کے حضرت لپٹ گئے

زانو پہ رکھ لیا سرِ حر اور یہ کہا — بھائی حسین آیا ہے آ ہوش میں ذرا
آنکھیں قدم پہ مل کے یہ بولا وہ باوفا — مولا ہزار جان سے میں آپ پہ فدا
جن کے لئے زمیں پہ فلک سر جھکائے ہیں
وہ لوگ خلد سے مرے لینے کو آئے ہیں

زانو پہ سر ہے آپ کے یا شاہِ بحر و بر — محبوبِ کبریا ہیں ادھر شیرِ حق ادھر
یہ کون بی بی ہیں مرے پہلو میں نوحہ گر — شہ نے کہا کہ روتی ہیں اماں برہنہ سر
تو حشر تک امامِ دو عالم کے ساتھ ہے
ماتم ترا حسین کے ماتم کے ساتھ ہے

یہ سنتے سنتے غیر ہوا اس جری کا حال — زانوئے شاہِ دیں پہ کیا حر نے انتقال
خیمے کے در پہ لاش کو لایا علی کا لال — سب بیبیوں نے کھول دئے اپنے سر کے بال
زینب یہ روتی شہ کے فدائی کے واسطے
جیسے بہن تڑپتی ہے بھائی کے واسطے

حضرت قاسمؑ کی شہادت

(حضرت قاسمؑ حضرت امام حسنؑ کے لڑکے تھے وہ بھی میدان کربلا میں شہید ہوئے)

اعدا کو بھگا کر جو لگے ڈھونڈھنے سرور
پامال ہوئے قاسم نوشاہ سراسر
گودی کا پلا پاؤں رگڑتا تھا زمیں پر
روکر پسر فاطمہؓ نے پیٹ لیا سر
دیکھا جو حسنؑ کو تن صد پاش سے لپٹے
چلا کے حسینؑ ابن علیؑ لاش سے لپٹے
روکر کہا صدقہ ہو چچا منہ سے تو بولو
کیا حال ہے اے ماہ لقا! منہ سے تو بولو
بیٹا میں تڑپتا ہوں ذرا منہ سے تو بولو
گر اٹھ نہیں سکتے تو ذرا منہ سے تو بولو
مادر کو بڑا داغ دیے جاتے ہو قاسم
بیٹی کو مری رانڈ کیے جاتے ہو قاسم
یہ کہتے تھے جو موت کی ہچکی اسے آئی
منہ کھول کے حضرت کو زباں خشک دکھائی
مخدومۂ عالم نے یہ آواز سنائی
میں ساغر کوثر ہوں ترے واسطے لائی
پی لے اسے اے لال! اگر خشک گلا ہو
دادی ترے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ فدا ہو
اک شور اٹھا ہائے غضب مر گئے قاسمؑ
سب خون میں سر تا بہ قدم بھر گئے قاسمؑ
شہ بولے کہ برباد ہمیں کر گئے قاسمؑ
پیاسے مرے گھر سے لب کوثر گئے قاسمؑ
لو خیمہ میں لے جاؤ تم اس رشک چمن کو
شرم آتی ہے میں منہ نہ دکھاؤں گا دلھن کو

سلام

(سلام مرثیہ نگاری کا ایک جزو ہے۔ اس کی شکل غزل کی طرح ہوتی ہے مگر مضامین میں تغزل اور رنگینی نہیں ہوتی۔ سلام میں عموماً اخلاقی اور مذہبی باتیں خاص طور سے واقعات کربلا اور مصائب اہل بیت کا ذکر ہوتا ہے مگر غزل کے طرز میں۔ نمونہ کے طور پر انیسؔ کا ایک سلام درج کیا جاتا ہے)۔

کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے
کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

نہ روئے بیٹوں کے غم میں حسینؑ واہ رے صبر
یہ داغ ہوش بشر کے بجا نہیں رکھتے

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

سوائے کوثر و تسنیم و خلد باغ بہشت
یہ اشک ہیں وہ گہر جو بہا نہیں رکھتے

قناعت و گہر آبرو و دولت دیں
ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

غم حسینؑ کے داغوں سے دل کرو روشن
خبر لحد کے اندھیرے کی کیا نہیں رکھتے

گلوئے اصغرؑ معصوم و تیر وا ویلا
یہ ظلم وہ ہیں کہ جو انتہا نہیں رکھتے

فقط حسینؑ پہ یہ تفرقہ پڑا ورنہ
کسی کی لاش کو سر سے جدا نہیں رکھتے

انیسؔ بیچ کے جاں اپنی ہند سے نکلو
جو توشۂ سفر کربلا نہیں رکھتے

مہندی تمہارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلھن کو بیاہ کے، تاروں کی چھاؤں میں

ناگاہ آکے بالی سکینہ نے یہ کہا — کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا — لوگو مجھے بلائیں تو بیلنے دو اک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ — عمو نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ
بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ — اب تو علم ملا تمہیں پانی مجھے پلاؤ
تحفہ کوئی نہ دیجے نہ انعام دیجیے
قربان جاؤں پانی کا اک جام دیجیے

ڈیوڑھی پہ خادمان محل کی ہوئی پکار — آتے ہیں اب حضور خبردار ہوشیار
خلعت پہن رہے ہیں علمدار نامدار — نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

ناگہ بڑھے علم لیے عباس باوفا — دوڑے سب اہل بیت کھلے سر برہنہ پا
حضرت نے ہاتھ اٹھا کے یہ اک ایک سے کہا — لو! الوداع! اے حرم پاک مصطفےٰ
صبح شب فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو
سب مل کے ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ لو

شہ کے قدم پہ زینب زار و حزیں گری — بانو پچھاڑیں کھا کے پسر کے قریں گری
کلثوم تھرتھرا کے بروئے زمیں گری — باقر کہیں گرا تو سکینہ کہیں گری
اجڑا چمن ہر اک گل تازہ نکل گیا
نکلا علم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

مرزا سلامت علی دبیر

طلوعِ صبح

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی / پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی / مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

یوسف غریقِ چاہِ سیہ ناگہاں ہوا / یعنی غروبِ ماہ تجلی نشاں ہوا
یونس، دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا / یعنی طلوعِ نیرِ مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

روزِ سفید یوسفِ آفاق شب نقاب / مغرب کی چاہ میں تھا جو در زیرِ ماہتاب
سقائے آسماں نے لیا دلوِ آفتاب / اور ریسمانِ شعاع کی باندھی بہ آب و تاب
یوسف کو دلوِ مہر میں بٹھا کے چاہ سے
کھینچا نواحِ شرق میں مغرب کی راہ سے

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا / پھر مشکِ شب جہان سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہو گیا / باطل رسالۂ شبِ دیجور ہو گیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خانے میں
مضموں تھا آفتاب کا ذروں کے نامے میں

کھولے ہوا میں طائر زریں نے بال و پر — بیٹھا وہ آکے چرخِ چہارم کے بام پر
دانے ستاروں کے جو پڑے تھے ادھر ادھر — منقار زر میں چن لیے اس نے وہ سر بسر
پھر میہمانِ چشمۂ مہتاب ہو گیا
چشمہ تو خشک اور وہ سیراب ہو گیا

تلوار کی کاٹ

یہ سن کے دو زبانیں نکالے ہوئے چلی — سانچے میں اپنے فتح کو ڈھالے ہوئے چلی
جوہر کا جال دوش پہ ڈالے ہوئے چلی — قبضہ میں قہرِ حق کو سنبھالے ہوئے چلی
سایہ کو مڑ کے حکم دیا رہ نہ جائیو
انگلی اجل کی پکڑے ہوئے لیتا آئیو
سیفی چلی کہ سیف ید اللہ رواں ہوئی — تیغ نگہ نیام پلک میں نہاں ہوئی
صوفی کی طرح چلہ نشیں ہر کماں ہوئی — ہستی فنا ہوئی اور اماں بے اماں ہوئی
زیرِ فلک تڑپنے سے اس راہ وار کے
بجلی کے سر پہ رعد گرا چیخ مار کے

ــ حضرت امام حسین میدان جنگ میں تشریف لاتے ہیں اور حضرت زینب خیمہ کے در سے مرحبا کہہ کر ذوالفقار کو آواز دیتی ہیں ــ

ہاں ذوالفقار شمر کو زندہ نہ چھوڑیو

آنکھیں زرہ کی تیغ سے گرویدہ ہوگئیں　　مانند کاہ برچھیاں کاہیدہ ہوگئیں
تن پر کمانیں سہم کے چسپیدہ ہوگئیں　　تیغیں سمٹ کے قبضوں میں پوشیدہ ہوگئیں
حملے تو ہاتھ سے گرے ہاتھ آستین سے
سر تن سے پاؤں رن سے رن اٹھا زمین سے

ترچھی رواں پیادوں کے سر پر اگر ہوئی　　سیدھی وہ صف روانہ قعر سقر ہوئی
اللہ ری صفائی لہو میں نہ تر ہوئی　　گردن تو اک طرف نہ خبر کو خبر ہوئی
موج رواں کی طرح جدھر یہ پلٹ گئی
گردن سر آگے پھینک کے پیچھے کو ہٹ گئی

وہ تیغ یوں چمک کے سوئے راس و چپ گئی　　کوڑا لگایا رعد نے بجلی تڑپ گئی
بن کر سیاہ کے لیے لرزے کی تپ گئی　　دوزخ کے شعلوں کی کفنی تن پہ ٹپ گئی
دل ناریوں کا تپ کی حرارت سے جل گیا
کچھ کچھ بخار تیغ کے دل کا نکل گیا

شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام

خاک شفا سروں پہ اڑاتے چلے ملک　　خون جگر سے سبحۂ یاقوت تھی پلک
پہنچے تھے تا فلک کہ لرزنے لگے ملک　　اور یہ فغاں زمیں سے گئی آسماں تلک
فریاد گوشوارۂ عرش خدا گرا
لو خاک پہ ستارۂ خیر النسا گرا

گرتے ہی خاک پر شہ دیں کو غش آگیا پھر بھی نہ کوئی پیاسے کو پانی پلا گیا
خنجر لگا گیا کوئی نیزہ لگا گیا کھولی جو آنکھ شہ نے جگر تھرتھرا گیا
سر کاٹنے کو پاؤں کسی کا نہ بڑھ سکا
جز زنگ زردا در کوئی منہ نہ چڑھ سکا
پر آہ آہ شمر نے بڑھ کر غضب کیا سینہ پہ موزہ حلق پہ خنجر کو رکھ دیا
چلاتے آئے قبر سے محبوب کبریا باہیں گلے میں ڈال دیں خنجر پکڑ لیا
زہرا پکاری یہ دل حیدر کا چین ہے
میرا حسین ہے ارے میرا حسین ہے
اے شمر مصطفےٰ کی رسالت کا واسطہ اے شمر مرتضیٰ کی امامت کا واسطہ
اے شمر اہل بیت کی حرمت کا واسطہ اے شمر کبریا کی عدالت کا واسطہ
صدقہ نبی کی روح کا حیدر کی گور کا
تو گل نہ کر چراغ پیمبر کی گور کا
روشن اسی نواسے سے نانا کا نام ہے یہ سرپرست عزت خیر الانام ہے
خنجر نہ پھیر پیاس سے یہ خود تمام ہے آخر خدا ہے حشر ہے اور انتقام ہے
للہ خانداں کو نہ میرے تباہ کر
تو اس کے ننھے بچوں کے اوپر نگاہ کر
چلائی در سے زینب مضطر بھی وا اخا اماں تو آئیں میں بھی نکل آؤں ننگے پا
بولی سکینہ روک لوں میں خنجر جفا باقر پکارا روکے میں سو جان سے فدا
شاید یہ ہاتھ تھام لے معصوم جان کر
دادا ترے گلے پہ گلا رکھ دوں آن کر

مڑ مڑ کے زیرِ تیغ یہ بولے شہِ امم　　زینب تجھے غریبی شبیر کی قسم
بٹھلا رہے یتیموں کو خیمے میں ایک دم　　بٹتا ہے دھیان محوِ جمالِ خدا ہیں ہم
بچوں کو لے کے ڈیوڑھی سے زینب تو ہٹ گئی
یاں بوسہ گاہ احمد مختار کٹ گئی

لو مومنو! بپا ہوا محشر بکا کرو　　تن سے جدا ہوا سر سرور بکا کرو
لاشہ تڑپ رہا ہے زمیں پر بکا کرو　　نیزے پہ چڑھتا ہے سر اطہر بکا کرو
بجوائیں نوبتیں عمرِ و روسیاہ نے
تکبیر تین بار کہی فرق شاہ نے

بس اے دبیر بس کہ ملک کر رہے ہیں بین　　جبریل دے رہے ہیں ندائیں بہ شور و شین
آگاہ ہو کہ قتل ہوئے شاہ مشرقین　　عابد یتیم ہو گئے مارے گئے حسین
کھیتی علیؑ کی لٹ گئی بستی اجڑ گئی
پردیس میں حسین سے زینب بچھڑ گئی

لو مومنو! بپا ہوا محشر بکا کرو — تن سے جدا ہوا سر سرور بکا کرو
لاشہ تڑپ رہا ہے زمیں پہ بکا کرو — نیزے پہ چڑھتا ہے سر اطہر بکا کرو
بجوائیں نوبتیں عمرو روسیاہ نے
تکبیر تین بار کہی فرق شاہ نے

بس اے دبیر بس کہ ملک کر رہے ہیں بین — جبریل دے رہے ہیں ندا یوں بشور و شین
آگاہ ہو کہ قتل ہوئے شاہ مشرقین — عابد یتیم ہوگئے مارے گئے حسینؑ
کھیتی علی کی لٹ گئی بستی اجڑ گئی
پردیس میں حسین سے زینب بچھڑ گئی

حالی

مرثیۂ غالب (انتخاب)

(نظم کی یہ شکل ترکیب بند کہلاتی ہے۔ ایک بند میں غزل کی طرح چند اشعار ہم قافیہ اور ہم ردیف لکھ کر ایک شعر دوسرے قافیہ اور ردیف میں لکھا جاتا ہے۔ یہ آخری شعر گرہ یا بیت کہلاتا ہے۔ بند کی تعداد شاعر کی خوشی پر منحصر ہے۔ اگر ہر بند میں گرہ ایک ہی رہے تو اس نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں)

بلبل ہند مر گیا ہیہات! | جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس | پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج | رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول | سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بہ مثل | دن کو کہنا دن اور رات کو رات
ہو گیا دل پہ نقش جو لکھا | قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں | لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی | خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے داد سخن وری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہل انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط، منہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

نازش خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانہ میں ایک رنگیں طبع
رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بار احباب جو اٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دل میں مدت سے تھی خلش جس کی — وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دل مضطر کو کون دے تسکیں — ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج
تلخیٔ غم کبھی نہیں جاتی — جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر — ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد

برج نرائن چکبست

مرثیہ گوکھلے

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
جبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

وطن کو تونے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں امنڈ امنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں
اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
افق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا تھا

غریب ہند نے تنہا نہیں یہ داغ سہا وطن سے دور بھی طوفان رنج و غم کا اٹھا
جبیب کیا ہیں حریفوں نے یہ زباں سے کہا سفیر قوم جگر ہند سلطنت نہ رہا
پیام شہ نے دیا رسم تعزیت کے لیے
کہ تو ستون تھا ایوان سلطنت کے لیے

دلوں پہ نقش ہیں اب تک تری زباں کے سخن ہماری راہ میں گویا چراغ ہیں روشن
فقیر تھے جو ترے در کے خادمانِ وطن انھیں نصیب کہاں ہوگا اب ترا دامن
ترے الم میں وہ اس طرح جان کھوتے ہیں
کہ جیسے باپ سے چھٹ کر یتیم روتے ہیں
اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے
رہے گا رنج زمانہ میں یادگار ترا وہ کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا
پلی ہے قوم ترے سایۂ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

صفی لکھنوی

مرثیہ حالی

اس بزم میں آکے جانے والا پھر جاکے ادھر نہ آنے والا
کھولوں کو گھری سنانے والا اے قوم! ترا جگانے والا
خاموش لحد میں سو رہا ہے
اور اس کو زمانہ رو رہا ہے

سلطان قلمرو خیالی اقلیم سخن کا باب عالی
بے مثل، مثال بے مثالی شمس العلما جناب حالی
ذی عزت و خواجۂ گرامی
الطاف حسین نام نامی

کس بحر سخن کا آگیا نام بے تاب ہے مدو جزر اسلام
وہ نظم مسدس ایرد انجام ابر باراں گہر کی ریزش عام
راتیں نذر سخن وری کیں
سوکھی ہوئی کھیتیاں ہری کیں

سنجیدہ کلام نغمۂ راز اندوہ ربائے طبع ناساز
سیدھا سادھا وہ اس کا انداز تھا سحر حلال بلکہ اعجاز
پھونکی وہ سخن میں اک نئی روح
زندہ ہوئے پھر قلوب مذبوح

مرحوم تھے یادگار غالب — تلمیذ وفا شعار غالب
دم سے ان کے بہار غالب — روشن شمع مزار غالب
بے بادہ ہوا ایاغ افسوس
کل ہو گیا اب چراغ افسوس

وہ خضر ادب، ادیب مشاق — فرخندہ سیر، طبیب اخلاق
یکتائے زماں، وحید آفاق — گر نظم میں فرد، نثر میں طاق
پاکیزہ خیال، پاک طینت
جس بزم میں ہو وہاں کی زینت

ختم اس پہ تھی واقعہ نگاری — تھا نظم میں لطف نثر عاری
ہر گوشہ میں فیض اس کا جاری — ہر کشت رہین آب یاری
اندوہ ربا، نشاط امید
فرحت افزا، حیات جاوید

دنیا کا یہی ہے عام دستور — ہم بزم ہوں رفتہ رفتہ سب دور
سید کے جو نورتن ہیں مشہور — جن میں اک فرد ذات مغفور
سب نذر اجل ہوئے وہ گوہر
دکھلا گئے اپنے جوہر

نخانے کدہ جس جگہ وہیں ہے — لیکن پیر مغاں نہیں ہے
ساغر ہے کہیں سبو کہیں ہے — دل در طۂ غم میں تہ نشیں ہے
تو می وہ جہاز سارے ڈوبے
ڈوبا چاند اور تارے ڈوبے

ہر چند سبھی یہ نام ور تھے　　رفتار جہاں سے باخبر تھے
آزاد روی کے راہ بر تھے　　گویا کہ چراغ رہ گزر تھے

خواجہ لیکن سبھوں میں گل تھا
یا نی تھا مزاج، صلح کل تھا

دل خون کیا جب اس خبر نے　　آنسو برسائے چشم تر نے
دل سے درخواست کی جگر نے　　لکھی یہ صفی نوحہ گر نے

تاریخ وفات خواجہ حالیؔ
ہستی حالیؔ سے اب ہے خالی
سنہ ۱۳۳۳ھ مطابق سنہ ۱۹۱۴ء

جوشؔ

جوشؔ کی نظم "آوازۂ حق" سے ایک اقتباس

کیا جوہر شمشیر تھا، کیا زور شجاعت نزدیک کوئی آئے، نہ پڑتی تھی یہ ہمت
تابندہ خط و خال میں تھی برق امامت حیدر کی جو سطوت تھی تو حمزہ کی جلالت
شمشیر نہ تھی، فوج پہ بجلی کی چمک تھی
یا ابر سیہ تاب میں کوندے کی لپک تھی

جس سر پہ چلی پیکر بے جاں نظر آیا جس سمت گئی خون کا طوفاں نظر آیا
اونچی جو ہوئی برق کا داماں نظر آیا نیچی جو ہوئی قہر کا ساماں نظر آیا
تلوار تھی، یا ساز کہ نغمہ تھا غم اس کا
تھا مرکز آواز فنا زیر و بم اس کا

مصروف ابھی جنگ میں تھے حضرت شبیر آواز اک آئی کہ "بس اب روک لے شمشیر
لازم ہے کچھ امت کی شفاعت کی بھی تدبیر پی جام شہادت کہ بڑھے عزت و توقیر
طوفاں سے بچا حق کو، لہو اپنا بہا دے
امت کو، بہادر ہے تو اب مر کے جلا دے"

جھنکار سے میدان وغا گونج رہا تھا ناگاہ پئے صبر و رضا حکم جو پہنچا
یوں میان میں چلتی ہوئی تلوار کو رکھا غل جن و ملائک میں اٹھا صلِ علیٰ کا
ایمان کی ڈوبی ہوئی نبضیں ابھر آئیں
خدمت کے لیے چرخ سے حوریں نظر آئیں

ذروں پہ جو سجدے میں جھکے حضرت شبیر   چلنے لگے ہر سمت سے تیغ و تبر و تیر
بے کس پہ چمکنے لگی شمشیر پہ شمشیر   سر پیٹ کے کہنے لگی یہ زینب دلگیر
چھوٹوں گی نہ اس غم میں کبھی نوحہ گری سے
آندھی کا تصادم ہے چراغ سحری سے

ہے ہے کوئی عباسؑ دلاور کو پکارو   بابا پہ برا وقت ہے اکبر کو پکارو
اکبر نہیں ملتے ہیں تو اصغر کو پکارو   بیٹے پہ چھری چلتی ہے حیدر کو پکارو
زہرا کی دہائی ہے پیمبر کی دہائی
پھٹتا ہے جگر خالق اکبر کی دہائی

حضرت نے جو زینب کی سنی گریہ و زاری   چپ ہو گئے وہ قلب پہ حالت ہوئی طاری
تلواریں لگانے لگے بڑھ بڑھ کے جو ناری   مولا نے کہا شکر ہے اے ایزد باری!
کٹتا ہے گلا بھائی کا ہمشیر کے آگے
تدبیر سر خاک ہے تقدیر کے آگے

تڑپے جو کئی بار زمیں پر شہ والا   سمجھے یہ ملائک کہ قیامت ہوئی برپا
خیمے کو بڑی یاس سے مظلوم نے دیکھا   اتنے میں کسی سمت سے اک تیر وہ آیا
پامال صف لشکر غم ہو گئے مولا
دل میں وہ اٹھا درد کہ خم ہو گئے مولا

رک رک کے جو تلوار چلی خشک گلے پر   زہرا کی صدا آئی کہ "آہستہ ستم گر"
حیدر نے بڑے پیار سے زانو پہ لیا سر   گردوں کی طرف دیکھ کے بولے یہ پیمبر
شکوہ نہیں نکلا مرے پیاسے کے لبوں سے
نکلی ہے مری روح نواسے کے لبوں سے

ناشاد! تری بے کسی و یاس کے قرباں
نازک یہ ترا جسم، یہ تپتا ہوا میداں
ٹکڑے یہ بدن کے، یہ ردا خون میں غلطاں
ذرّوں یہ ہیں قرآن کے اوراق پریشاں
بے کس ترے اکبر کی جوانی کے تصدّق
مظلوم تری تشنہ دہانی کے تصدّق

تو اور سرِ خاک مرے گیسوؤں والے
یہ دل، یہ بلائیں، یہ زباں، اور یہ چھالے
اس بیاباں میں گردن پہ چھری جسم پہ بھالے
افسوس ہے اے فاطمہؑ کے ناز کے پالے
عبرت کا وہ منظر ہے کہ خود ظلم خجل ہے
یہ لاش نہیں خاک پر اسلام کا دل ہے

یہ شام کا ہنگام، یہ اندوہ، یہ میداں
یہ ہو کا سماں، اور یہ سنسان بیاباں
رانڈوں میں تلاطم ہے، اداسی کے ہیں ساماں
سوتے ہیں پڑے شام سے خیمے کے نگہباں
غم اتنے ہیں اور ایک بھی غم خوار نہیں ہے
جز ذاتِ خدا کوئی مددگار نہیں ہے

اے جوش یہ اب تک ہے اسی خون کی تاثیر
ہوتی ہے بالا علان بڑی شان سے تکبیر
اب بھی جنھیں ملتی ہے رہِ عشق میں تعزیر
صد شکر کہ خوش ہو کے پہن لیتے ہیں زنجیر
ڈرتے ہی نہیں دیکھ کے جلاد کی صورت
زنداں میں چلے جاتے ہیں سجاد کی صورت

بے درد کی حسرت کو نکلتے نہیں دیکھا
کاغذ کی کبھی ناؤ کو چلتے نہیں دیکھا
ظالم کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا
ٹھوکر ہے یہ وہ جس سے سنبھلتے نہیں دیکھا
وہ تخت ہے کس قبر میں وہ تاج کہاں ہے؟
اے خاک بتا زورِ یزید آج کہاں ہے؟

اسرار الحق مجاز

تاج وطن کا لعل درخشاں چلا گیا

گاندھی جی کی موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی

دردِ غمِ حیات کا درماں چلا گیا
وہ خضرِ عصر و عیسیٰ دوراں چلا گیا

ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

برہم ہے زلفِ کفر، تو ایماں ہے سرنگوں
وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا

بیمارِ زندگی کی کرے کون دل دہی
نباض و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا

کس کی نظر پڑے گی اب "عصیاں" پہ لطف کی
وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا

وہ رازدارِ محفلِ یاراں نہیں رہا
وہ غمگسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسم وہ دل بری نہیں
ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا

اک بے خودِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا
اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا

باچشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

اے آرزو! وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش
ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاک و خزف سربلند ہیں
تاج وطن کا لعل درخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغ خوں چکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

قطعات و رباعیات

مولانا حالیؔ اور آزادؔ نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں نظم جدید کی داغ بیل ڈالی جس سے اردو شاعری میں نئی وسعتیں پیدا ہوئیں۔ مختلف شکل میں نظمیں لکھی جانے لگیں انھیں میں سے ایک شکل قطعہ کی ہے۔

قطعہ کے معنی ٹکڑے کے ہیں اور ابتدا میں اسے قصیدہ کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ قدما کے یہاں قطعات زیادہ نہیں ملتے قطعہ بند اشعار ضرور غزل میں کافی ملتے ہیں لیکن اب اس کی ایک مستقل صنف ہو گئی ہے اور اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

قطعہ میں غزل یا قصیدہ کی طرح مطلع نہیں ہوتا۔ صرف قافیہ اور ردیف کی پابندی ہوتی ہے۔ اشعار میں معنوی تسلسل ہوتا ہے۔ ان کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ شاعر کی خوشی پر منحصر ہے مگر عام طور پر بہت طویل قطعے نہیں لکھے جاتے۔ پچھلے دور میں حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ اور سلیمؔ کے قطعات کافی مشہور ہیں۔

موجودہ دور میں نظم نگاری کی ترقی کے ساتھ ساتھ قطعات کا کافی رواج ہو گیا ہے۔ اب تو ہر شاعر قطعہ لکھنا بھی ضروری خیال کرتا ہے۔ جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ اور اخترؔ انصاری وغیرہ نے بہت عمدہ قطعات لکھے ہیں۔ ان کے قطعات کے نمونے اس انتخاب میں ملیں گے۔

رباعی۔ یہ اردو کی قدیم اور مقبول صنف سخن ہے۔ پہلے رباعی لکھنے کا بہت رواج تھا۔

مزید مطالعہ کے لیے : موازنہ انیس و دبیر (اقتباسات) از شبلی نعمانی
روح انیس از مسعود حسن رضوی
مرثیہ اسحاق از شبلی
مرثیہ داغ از اقبال

مشقیں

۱۔ مراثی کے جن اجزا کا ذکر تمہیدی بیان میں کیا گیا ہے ان کی مثالیں اقتباسات میں تلاش کرو۔

۲۔ چکبست نے ہندوستان کی چند مقتدر ہستیوں پر مرثیے لکھے ہیں، انھیں حاصل کرکے پڑھو۔

۳۔ تم نے شبلی کے مضمون میں پڑھا ہے کہ کسی چیز کا ہو بہو نقشہ کھینچنے کو محاکات کہتے ہیں۔ محاکات، شاعری کی ایک اہم صنعت ہے۔ قدیم اساتذہ میں انیس کو اس صنعت کے استعمال میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان اشعار کو دیکھو۔

وہ صبح نور اور وہ صحرا، وہ سبزہ زار ... تھے طائروں کے غول، درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیم صبح کا، رہ رہ کے بار بار ... کوکو وہ قمریوں کی، وہ طاؤس کی پکار

ان اشعار سے خارجی منظر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔
ان اشعار پر غور کرو، ان کی منظر کشی دوسری سطح پر ہے۔

آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے ... گردوں کو تپ چڑھی تھی اسی کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر ... بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

۴۔ بعض اشعار میں تخیلی منظر کشی ہوتی ہے مثال کے لیے اس شعر کو دیکھو۔

تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع ... رخصتِ موسم بہار ہے آج

غالب کا رنگین طبع ہونا، رنگینی کا تعلق موسم بہار سے ہونا، غالب کے مرنے سے موسم بہار کا رخصت ہونا وغیرہ۔
اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ محاکات کبھی خارجی ہوتی ہے کبھی داخلی۔
تم پڑھی ہوئی نظموں سے داخلی اور خارجی محاکات کی مثالیں تلاش کرو۔

اسرار الحق مجاز

تاج وطن کا لعل درخشاں چلا گیا

گاندھی جی کی موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی

درد و غم حیات کا درماں چلا گیا — وہ خضر عصر و عیسیٔ دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
برہم ہے زلف کفر، تو ایماں ہے سرنگوں — وہ فخر کفر و نازش ایماں چلا گیا
بیمار زندگی کی کرے کون دل دہی — نباض و چارہ ساز مریضاں چلا گیا
کس کی نظر پڑے گی اب "عصیاں" پہ لطف کی — وہ محرم نزاکت عصیاں چلا گیا
وہ راز دار محفل یاراں نہیں رہا — وہ غمگسار بزم حریفاں چلا گیا
اب کافری میں رسم رہ دل بری نہیں — ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا
اک بے خودِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا — اک عاشق صداقت پنہاں چلا گیا
باچشم نم ہے آج زلیخائے کائنات — زنداں شکن وہ یوسف زنداں چلا گیا
اے آرزو! وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش — ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا
اب سنگ و خشت و خاک و خزف سربلند ہیں — تاج وطن کا لعل درخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغ خوں چکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

قطعات و رباعیات

مولانا حالی اور آزاد نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں نظم جدید کی داغ بیل ڈالی جس سے اردو شاعری میں نئی وسعتیں پیدا ہوئیں۔ مختلف شکل میں نظمیں لکھی جانے لگیں انھیں میں سے ایک شکل قطعہ کی ہے۔

قطعہ کے معنی ٹکڑے کے ہیں اور ابتدا میں اسے قصیدہ کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ قدما کے یہاں قطعات زیادہ نہیں ملتے قطعہ بند اشعار ضرور غزل میں کافی ملتے ہیں لیکن اب اس کی ایک مستقل صنف ہو گئی ہے اور اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

قطعہ میں غزل یا قصیدہ کی طرح مطلع نہیں ہوتا۔ صرف قافیہ اور ردیف کی پابندی ہوتی ہے۔ اشعار میں معنوی تسلسل ہوتا ہے۔ ان کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ شاعر کی خوشی پر منحصر ہے مگر عام طور پر بہت طویل قطعے نہیں لکھے جاتے۔ پچھلے دور میں حالی، اکبر، اقبال اور سلیم کے قطعات کافی مشہور رہیں۔

موجودہ دور میں نظم نگاری کی ترقی کے ساتھ ساتھ قطعات کا کافی رواج ہو گیا ہے۔ اب تو ہر شاعر قطعہ لکھنا بھی ضروری خیال کرتا ہے۔ جوش، فراق، فیض اور اختر انصاری وغیرہ نے بہت عمدہ قطعات لکھے ہیں۔ ان کے قطعات کے نمونے اس انتخاب میں ملیں گے۔

رباعی۔ یہ اردو کی قدیم اور مقبول صنف سخن ہے۔ پہلے رباعی لکھنے کا بہت رواج تھا۔

اب بھی مشاق اور قادر الکلام شعرا رباعیاں لکھتے ہیں۔ دور حاضر میں جوشؔ اور فراقؔ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "جنون و حکمت" اور "روپ" علی الترتیب جوشؔ اور فراقؔ کی رباعیات کے مجموعے ہیں۔ رباعی میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہر قسم کے مضامین اس میں نظم کیے جاتے ہیں۔

ربع عربی میں چار کو کہتے ہیں اس رعایت سے چار مصرعوں یا دو شعر والی نظم رباعی کہی جانے لگی۔ رباعی کے اوزان مقرر ہیں۔ اس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہو سکتے ہیں لیکن عام طرز کے مطابق تیسرے کے علاوہ بقیہ مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، چوتھا مصرع جسے حاصل رباعی سمجھنا چاہیے بہت زور دار ہوتا ہے۔ شاعر کا تخلص بالعموم تیسرے مصرع میں ہوتا ہے۔

اس انتخاب میں قدیم شعرا کے علاوہ جوشؔ اور فراقؔ کی رباعیاں بھی ملیں گی۔

قطعات

غالبؔ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

حالی

اسراف اور بخل

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بہ خلاف آپ کے سب اگلے سخن ور
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کم تر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لیے ہے یہ بیاں موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر
پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

شبلی نعمانی

غربا نوازی

(شبلی کی شہرت بحیثیت ایک انشا پرداز، مورخ، فلسفی اور عالم کے ہے مگر وہ شعر وسخن کا بھی نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ آپ نے جو چھوٹی مثنویاں اور قطعات لکھے ہیں ان کی تعداد تو مختصر ہے لیکن ہیں وہ خاصے کی چیز)

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز، نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضورؐ نے — کل کس لیے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں — حیدرؓ نے ان کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبان بے وطن — جن کا کہ صُفّۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گزرتی ہیں — میں اس کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق — جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں — جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کاٹی اہل بیت مطہرؓ نے زندگی
یہ ماجرائے دختر خیر الانام تھا

اکبر الہ آبادی

ختم بہار

ختم کیا صبا نے رقص گل پہ نثار ہو چکی　　جوش نشاط ہو چکا صوت ہزار ہو چکی
رنگ بنفشہ مٹ گیا، سنبل تر نہیں رہا　　صحن چمن میں زینت نقش و نگار ہو چکی
رُت وہ جو تھی بدل گئی، آئی بس اب نکل گئی　　تھی جو ہوا میں نکہت مشک تتار ہو چکی
اب تک اسی روش پہ ہے اکبر مست و بے خبر　　کہہ دے کوئی عزیز من فصل بہار ہو چکی

مشرق و مغرب

مشرقی میں کشش ہے روحانی　　مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈاروِن بولے بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست　　فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

نئی روشنی

چالیس سال سے ہے نئی روشنی کا دور　　کیوں کر اسے کہوں کہ سراسر فضول ہے
البتہ ایک عرض کروں گا دبی زباں　　گو خوش نما بہت ہے مگر بے اصول ہے

کشمکش

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر　　تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں　　خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ ادھر　　زیادہ حد سے دیے پاؤں سب نے ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے　　ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک　　ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہاں گیر کے پردے میں شہنشاہ زمن

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

اب وہ نور جہاں ہے نہ وہ انداز غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغان چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بے کس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمت شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن

مفتی شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے رضا مند ہوں گر بچہ و زن

وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے "شاہ زمن"

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن

اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن

دفعتہً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

سلیمؔ

دعوت انقلاب

کیا لے گا خاک مردہ و افتادہ بن کے تو — طوفان بن کہ ہے تری فطرت میں انقلاب
کیوں ٹمٹمائے کرمکِ شبِ تاب کی طرح — بن سکتا ہے تو اوج فلک پر اگر شہاب
وہ خاک ہو کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر — وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعل ناب
چڑیوں کی طرح دانہ پہ گرتا ہے کس لیے — پرواز رکھ بلند کہ تو بن سکے عقاب
وہ چشمہ بن کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں — رہ رو کو تو فریب نہ دے صورت سراب

وقت سحر

ہوتا ہے وقت صبح عجب نور کا سماں — جب نرم نرم سبزہ بدلتا ہے کروٹیں
ہر باغ میں طیور چمن کے وہ چہچہے — ہر دشت میں نسیم کی وہ سرسراہٹیں
وہ چرخ سبز فام پہ کرنوں کا پھوٹنا — پانی میں نور صبح کی وہ جھلملاہٹیں
پانی کی چادروں کے وہ پر جوش زمزمے — گل ہائے رنگ رنگ کی وہ مسکراہٹیں
موروں کا صحن باغ میں وہ رقص دل فریب — ہرنوں کی سبزہ زار میں وہ چلبلاہٹیں

وہ مندروں میں گھنٹیوں کا شور دل خراش
تسبیح زاہدانہ کی وہ گنگناہٹیں

اقبالؔ

ملّا اور بہشت

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت!
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت
نہیں فردوس مقام جدل و قال اقول!
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بدآموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

مستیِ کردار

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بے دار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

نصیحت

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سال خورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے جام زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

جوش

انتظار

جس طرح گنجان باغوں کی ہوا وقت غروب شام کے انفاس سے بنتی ہے آہ سوگوار
کنج سے آتی ہے اک مرطوب بوجھل سی شمیم منجمد سی بھاپ ہوتی ہے کنار جوئے بار
سینۂ خنکی پہ ہوتا ہے حرارت کا دباؤ حسرت شبنم میں خوں روتی ہے چشم برگ و بار
یوں ہی ہو جاتے ہیں جب کچھ دن انھیں دیکھے ہوئے روح ہو جاتی ہے بوجھل اور سینہ تنگ و تار
اٹھنے لگتی ہے برابر ہر بن مو سے اک آنچ جس سے آتی ہے تمنا کی شمیم سوگوار
اور کچھ آنکھوں میں یوں آنسو مچلتے ہیں ندیم
ماہ تاباں کا ستاروں کو ہو جیسے انتظار

معذرت

ہنسا میں اور زمانے کی خوشی کا جڑھ گیا پارا معاً دنیا نے میرے قہقہے پر قہقہہ مارا
مگر کھینچی جب اہ سرد، قلب ناشکیبا نے تو غم خواری کجا، مڑ کر نہ دیکھا مجھ کو دنیا نے
کہا میں نے کہ اے وہ زلف جو برہم نہیں ہوتی شریک عیش ہوتی ہے شریک غم نہیں ہوتی
یہ سننا تھا کہ دنیا نے کہا نیچی نگاہوں سے
کہ مجھ کم بخت کو فرصت نہیں خود اپنی آہوں سے

فیضؔ

وقف

وقف حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے، اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریب زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

اختر

تاج

(چاندنی رات میں)

چاندنی رات کا سماں، تاج کا منظر جمیل — چھائی ہوئی ہیں مستیاں کیفیتوں کا دور ہے
قلزم نور چاندنی، کشتیِ نور تاج گنج — نور میں نور مل گیا، تاج نہیں کچھ اور ہے

ٹیگور کی شاعری

جب دھیمے سروں میں گاتا ہوں ٹیگور کی شیریں نظم کوئی — اس وقت مجھے محسوس یہ ہوتا ہے کہ نشیلی کیفیتیں
تحلیل فضاؤں میں ہو کے چھائی ہیں جہانِ تستاں پر — بستاں میں پڑا ہے اک جھولا اور جھول رہا ہوں میں اس میں

فطرت

یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی
وہ غم دیدہ دلوں کو غم کے بدلے عیش دیتی ہے
میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اس کی بزم عشرت میں
تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ لیتی ہے

رباعیات

حالی

(١)

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے　　طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور　　سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

(٢)

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں　　اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے چھپاتا ہوں میں اپنے خود عیب　　بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

(٣)

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا　　مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے　　جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

(٤)

حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا　　خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہے حذر　　بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

(٥)

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو　　روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

اکبر

(۱)

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت
ساتھ اس کے وہ لطف زندگانی رخصت
ہے اب تو اسی کا انتظار اے اکبر
ہم کو بھی کرے جہان فانی رخصت

(۲)

ہر اک سے سنا نیا فسانا ہم نے
دیکھا دنیا میں اک زمانا ہم نے
اول یہ تھا کہ واقفیت پہ تھا ناز
آخر یہ کھلا کہ کچھ نہ جانا ہم نے

(۳)

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ
دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

(۴)

اکبر کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں
گو اس نے بہت کہا، کہا کچھ بھی نہیں
زلف و کمر بتاں کا مفقود ہے ذکر
شیطان پہ طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

میر انیسؔ

(۱)

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگ گلو سے اس پر یہ بعد
اللہ اللہ! کس قدر دور ہے تو

(۲)

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانا ہوں
جو دام سے بھاگتا ہے وہ دیوانا ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں میں
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانا ہوں

(۳)

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے
جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگ دل ہوتے ہیں
دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

(۴)

پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے
ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

پیارے صاحب رشید

(۱)

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا — کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری — پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا

(۲)

طفلی میں جو تھا، وہ دل ہمارا نہ رہا — بعد اس کے شباب کا سہارا نہ رہا
فصل پیری میں دانت سب ٹوٹ گئے — آئی جو سحر تو کوئی تارا نہ رہا

(۳)

پیری سے خاک مہربانی نہ ہوئی — وقت آکر بھی کامرانی نہ ہوئی
یوں توڑتا دم کہ دیکھنے لوگ آتے — افسوس کہ اس وقت جوانی نہ ہوئی

(۴)

کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں — کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں
پیری تو جوانی سے گراں قدر نہیں — کیا بوجھ پڑا کہ جھکا جاتا ہوں

(۵)

کب کوئی بلا نگاہبانی سے رکی — اک لحظہ نہ موت زندگانی سے رکی
پیری کا نام گو ضعیفی ہے رشید — پر ایسی قوی، نہ جوانی سے رکی

جوشؔ

(۱)

افسوس ہے اے جی کے گنوانے والو! ہر سانس میں سو فریب کھانے والو!
غم موج تبسم سے ترشح جاتا ہے بیدار ہو اے اشک بہانے والو!

(۲)

ہر بات پہ منہ ترا اترتا کیوں ہے؟ جینے کے لیے بنا ہے مرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل، اے طفل حیات کونین خود اک کھیل ہے ڈرتا کیوں ہے؟

(۳)

کیا جانیے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے دل رنج والم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم کانٹا چبھنے لگے درد ہوتا کیوں ہے

(۴)

چھانی ہر چند اک خدائی ہم نے کیا کیا نہ یہاں خاک اڑائی ہم نے
واللہ کہ خشکی و تری میں کوئی شے انساں سے عجیب تر نہ پائی ہم نے

(۵)

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سننے والے تمام ہو جاتے ہیں افسانہ مگر تمام ہوتا ہی نہیں

(۶)

انسان کی جس قدر بھی طراری ہے بس وقت گزارنے کی عیاری ہے
افسوس کہ بے معرفت راز حیات جینا کتنی شدید بے کاری ہے

فراق گورکھپوری

(۱)

دنیا کو کسی نوع سے یہ راز ملے
دنیا کے کسی ساز سے یہ ساز ملے
دنیا کو تو ہم دیتے سکون جاوید
کچھ دل کے دھڑکنے کا بھی انداز ملے

(۲)

کرتے نہیں کچھ تو کام کرنا کیا آئے
جیتے جی جاں سے گزرنا کیا آئے
رو رو کے موت مانگنے والوں کو
جینا نہیں آسکا تو مرنا کیا آئے

(۳)

ناشاد کسے بتاتے ہیں شاد کسے
کہتے ہیں کسے اسیر، آزاد کسے
اک دل ہے کہ سو بھیس بدلتا ہے فراق
برباد کسے کہتے ہیں، آباد کسے

(۴)

دنیا جو سنور جائے سنور جانے دے
دنیا جو نکھر جائے نکھر جانے دے
یہ فرصت نظارہ غنیمت ہے فراق
دل پر جو گزر جائے گزر جانے دے

(۵)

آئینۂ نیلگوں سے پھوٹی ہے کرن
آکاش پہ ادھ کھلے کنول کا جوبن
یوں اودی فضا میں لہلہاتی ہے سحر
جس طرح کھلے ترے تبسم کا چمن

امجد حیدر آبادی

(۱)

زنجیرِ درِ عرش ہلاتا ہوں میں
اللہ غنی! کسے ہلاتا ہوں میں
سجدہ کے بہانے دل کی بے تابی سے
قدموں پہ کسی کے لوٹ جاتا ہوں میں

(۲)

خالق نے جنھیں دیا ہے زر دیتے ہیں
زر کیا ہے خدا کی رہ میں گھر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ
ساماں نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

(۳)

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا
نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

(۴)

خود اپنی نگاہوں سے گرا جاتا ہوں
قطرہ سا زمین میں سما جاتا ہوں
احباب مرے دفن کی کیوں فکر میں ہیں
میں شرم گنہ سے خود گڑا جاتا ہوں

(۵)

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے
پردہ ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

رواںؔ

(۱)

پابندی جان و دل ہے زنجیر حیات — اللہ اللہ ری فکر تو قیر حیات
آغاز کی کچھ خبر نہ انجام کا علم — کونین ہے پھر بھی محو تدبیر حیات

(۲)

ہے گرم ہر ایک سمت بازار فنا — ہے دار حیات سربسر دار فنا
لیکن کیوں کر جہاں کو فانی سمجھوں — ذرّے کو بھی جب نہیں ہے اقرار فنا

(۳)

یہ کیا کہ حیات جاودانی کیا ہے — پہلے دیکھو جہان فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواںؔ — یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

(۴)

تم تیشۂ باغباں سے کیوں مضطر ہو — شاید یہ قلم ہی نخل بار آور ہو
مقراض اجل ہے قاطع شاخ حیات — ممکن ہے اسی میں راز جاں مضمر ہو

(۵)

سرمایۂ جان و دل ہے مستی میری — ہے وجہ فنا بقا پرستی میری
ورنہ اس گنبد تعین میں رواںؔ — اک نالۂ رائگاں ہے ہستی میری

(۶)

دنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے — سامان خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکر فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں — کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

مزید مطالعہ کے لیے :۔ آبگینے، اختر انصاری
فکر و نشاط، جوش جنون و حکمت، جوش
مشعل، فراق گورکھپوری

مشقیں

۱۔ قطعہ بند اشعار اور غزل مسلسل کی مثالیں تلاش کرو اور ان کا تقابل قطعات سے کرو۔

۲۔ معنوی حیثیت سے، سلیم اور اقبال کے قطعات کا مقابلہ دوسرے شعرا کے قطعات سے کرو۔

۳۔ یہ سمجھایا جا چکا ہے کہ چوتھا مصرعہ بالعموم اظہار خیال کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ تخلص کا برمحل استعمال بھی رباعی میں جان ڈال دیتا ہے اس لحاظ سے تم پڑھی ہوئی رباعیات کا تجزیہ کرو۔

۴۔ تم پڑھ چکے ہو کہ کلام میں الفاظ کے معنوں کا آپس میں ضد ہونا تضاد ہے، اسے مقابلہ، مطابقت، تطبیق اور طباق بھی کہتے ہیں ایسے ہی ایک معنوی صنعت مراعات النظیر بھی ہے۔ جس میں ایک لفظ کی رعایت سے مناسب چیزیں کلام میں لائی جاتی ہیں۔ جیسے چمن کی رعایت سے آشیانہ، گل و بلبل، باغ باں، گل چیں، سرو قمری، رنگ و بو کا ذکر دیکھو! کشتی، قلزم، صبا، گل، چمن، نقش و نگار، شمع و پروانہ، عاشق و دیوانہ وغیرہ مراعات النظیر کی مثالیں ہیں ایسے ہی الفاظ تم سبق سے چھانٹو۔

۵۔ ایک رباعی کے مصرعے الگ الگ ٹکڑوں میں لکھے جا رہے ہیں۔ ان سے رباعی مکمل کرو۔

پتلی کی .... ہے تو۔ آنکھیں .... وہ نور ہے تو۔ نزدیک ——
اس پہ یہ بعد۔ اللہ اللہ —— ہے تو۔

نظم جدید

موضوع یا طرزِ ادا کے لحاظ سے نظم جدید اردو شاعری کی کوئی قسم نہیں ہے، اس لیے اس حصہ میں جو نظمیں منتخب کی گئی ہیں شکل کے لحاظ سے ان کے الگ الگ نام دیے جا سکتے ہیں۔ لفظ جدید کا مقصد محض شاعری کے نئے رجحان کو ظاہر کرنا ہے یہ نیا رجحان موضوع کے انتخاب میں بھی نظر آتا ہے اور اسالیب کے تنوع میں بھی حالیؔ اور آزادؔ سے پہلے اردو شاعری چند خاص اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ اور رباعی میں محدود تھی۔ ان میں بھی غزل پر زیادہ زور تھا۔ حالیؔ اور آزادؔ سے پہلے نظیرؔ نے بھی مختلف اور متفرق عنوانات پر نظمیں لکھی تھیں، مگر ان کی کوششوں کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ اس لیے کہ نظیرؔ کسی بلند شخصیت کے مالک نہ تھے۔

حالیؔ، آزادؔ اور مولانا اسمٰعیل کے بعد سے نظم نگاری کو بے حد فروغ ہوا۔ اس وقت اردو ادب میں ایسی نظموں کا کافی ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے جن میں مناظرِ فطرت، خارجی واقعات، داخلی کیفیات اور اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور دیگر مسائلِ حیات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ موجودہ اردو شاعری کا عام رجحان نظم کی طرف ہے۔ شکل اور موضوع دونوں کے اعتبار سے نظم لکھنے میں جو طرح طرح کی جدتیں اور خیال آفرینیاں کی جا رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم کا مستقبل بہت روشن ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے نظم نگاروں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان میں جوالا پرشاد برقؔ، درگا سہائے سرورؔ، تلوک چند محرومؔ

منظومات جدید

اردو شاعری کی ابتدا میں جو قسمیں عام طور پر رائج تھیں وہ ہیں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ اور واسوخت۔ تقریباً تین سو برس تک یہی اقسام ہماری شاعری کا سرمایہ رہیں۔ انھیں کے ذریعے شعرا اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے رہے۔ ان اصناف کا مستقل موضوع عام طور پر حسن و عشق، مدح یا ہجو، حکایت و افسانہ، حسرت و غم یا اخلاق و تصوف ہوا کرتا تھا۔ دوسرے مضامین اور موضوعات انھیں مستقل اور بنیادی موضوعات کے ضمن میں بیان ہوتے تھے۔

جدید شاعری کی ابتدا

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے انیسویں صدی کا آخری حصہ اردو شاعری کے لیے انقلاب آفریں دور تھا۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا آزاد اور حالی نے کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں پنجاب میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جس میں نیچرل اور متفرق مضامین پر مثنوی کی شکل میں نظمیں کہی گئیں۔ انھیں نظموں نے جدید شاعری کا سنگ بنیاد رکھا۔ اب یہ رنگ آہستہ آہستہ فروغ پانے لگا۔ بہ اعتبار شکل و موضوع اس میں نئے تجربے ہونے لگے اور بیانیہ، جذباتی، واقعاتی، منظر کشی یا تشریحی، تمثیلی اور قومی و ملکی نظمیں لکھی جانے لگیں۔

حالی کے پہلے نظیر اکبرآبادی نے بھی بے شمار نظمیں متفرق عنوانات پر لکھی تھیں وہ اپنے دور کے تنہا نمائندہ ہیں مگر چوں کہ وہ کسی بلند شخصیت کے مالک نہ تھے اس لیے ان کی شاعری زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔ ان کی قدر افزائی دراصل دور حاضر میں ہوئی جب مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری اور دوسرے ممتاز نقادوں نے ان کی

شاعری کو پرکھا اور انھیں اردو کا پہلا عوامی شاعر قرار دیا۔ نظیر، حالی، آزاد، شبلی اور مولوی اسمٰعیل دراصل نظم جدید کے پیش رو ہیں۔ اکبر نے اردو نظم نگاری میں ایک نیا رنگ پیدا کیا وہ تھا طنز و ظرافت کا۔ وہ اس رنگ کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔

بیسویں صدی کے آغاز سے جدید شاعری کا مستقل دور شروع ہوتا ہے جس کی رفتار و ترقی میں انگریزی تعلیم کی اور ماہوار رسائل کے اجرا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ نظم کی قدیم صورتوں (قطعہ، مسدس، مخمس، مربع، مستزاد، ترکیب بند، ترجیع بند) کے علاوہ عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوئیں۔ اسی طرح موضوعات نظم میں وسعت اور کثرت پیدا ہوئی۔

اس زمانے کے چند ممتاز شعرا یہ ہیں۔ شوق قدوائی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ، بیان میرٹھی، تلوک چند محروم، جوالا پرشاد برق، چک بست، درگا سہائے سرور، صفی، عزیز، عظمت اللہ خاں، سیماب، ناظر، ظفر علی خاں، امجد حیدر آبادی، اقبال، جوش، احسان بن دانش اور حفیظ جالندھری وغیرہ۔ اس فہرست میں اور بھی بہت سے نام شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ان سبھوں میں اقبال کا درجہ بہت بلند ہے۔ ویسے سبھی اساتذہ نے اپنے مخصوص و منفرد رنگ سے اردو شاعری کو سنوارا اور نکھارا مگر اقبال نے اسے زمین سے اٹھا کر آسمان کی چیز بنا دی۔

دورِ حاضر

گزشتہ جنگ عظیم نے طرح طرح کے اقتصادی اور معاشری مسائل پیدا کیے ان کا اثر شاعری پر پڑنا ناگزیر تھا۔ نوجوان شعرا کی ایک طویل فہرست نے سیاسی اور انقلابی رنگ کی چیزیں لکھنا شروع کیا۔ ان میں سرفہرست نام جوش کا آتا ہے جنھیں ”شاعر انقلاب“ کے لقب سے موسوم کیا گیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جوش اور دوسرے نوجوان شعرا کے یہاں اردو کی روایتی شاعری سرے سے مفقود ہے۔ خود جوش کے یہاں اعلیٰ درجہ کی غزلیں، رباعیات اور قطعات ملتے ہیں اور کلام کا اکثر و بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں شعلہ کی لپک کے ساتھ ساتھ شبنم کی نرمی اور تازگی بھی ہے۔ ان کی نظموں کے

ایک مجموعہ کا نام ہی شعلہ و شبنم ہے۔

دورِ جدید کے مشہور نظم نگار شعرا میں فراق، ساغر، مجاز، جذبی، علی سردار جعفری، اختر، کیفی اعظمی، اختر الایمان، ڈاکٹر تاثیر، میراجی، م۔ن راشد، جمال، فیض، مخمور جالندھری سلام مچھلی شہری، شاد عارفی، قیوم نظر، یوسف ظفر اور وامق جونپوری وغیرہ ہیں۔ یہ شعرا بہ اعتبار شہرت اور مقبولیت مختلف مدارج پر ہیں۔ ان میں سے اکثر کا کلام ابھی تجرباتی دور میں ہے اور بعض شعرا موضوع کے علاوہ 'فارم' میں بھی انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اور آزاد اور معریٰ نظم کے حامی ہیں۔

نوجوان شعرا میں سے اکثر ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں اور یہ الجھاؤ ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے یہاں شاعری کے کامیاب مرقعے اور نور آگیں مثالیں ملتی ہیں مگر کم۔ پرانے مذاق کے دل دادہ اور ثقہ و سنجیدہ حضرات نوجوان شعرا کی شاعرانہ خامیوں اور ذہنی گم راہیوں پر جیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔

اس ادبی ہلچل اور خلفشار میں طمانیت بخش چیز یہ ہے کہ ان نئے تجربات کی بہ دولت اردو شاعری کا دامن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان تجربات میں سے جو ناقص اور خام رہ جائیں گے وہ ادب میں مستقل جگہ نہ پائیں گے۔ جن تجربات میں حیات افزا اور پختہ عناصر شامل ہوں گے وہ ہمارے ادبی سرمایے کا جزو بن جائیں گے۔

نظموں کا انتخاب بڑی کاوش سے کیا گیا ہے۔ طلبہ کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے انتخاب میں تنوع، وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظیر اکبرآبادی

میلے کی سیر

آج میلے کا یاں جو ہے سامان — آئے ہیں دور دور سے انسان
کوئی درشن کوئی دعائیں مان — سب کی ہوتی ہیں مشکلیں آسان
ہر طرف کھل رہے گل و ریحان — ہار بدھی مٹھائی اور پکوان
بھیڑ انبوہ غل دکان دکان — اور یہی شور ہر گھڑی ہر آن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لوگ چاروں طرف کے آتے ہیں — آکے عیش و طرب مناتے ہیں
دل سے سب درشنوں کو جاتے ہیں — اپنے دل کی مرادیں پاتے ہیں
جھانجھ مردنگ دف بجاتے ہیں — راس منڈل بھجن سناتے ہیں
دل میں پھولے نہیں سماتے ہیں — سب یہ ہنس ہنس کے کہتے جاتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی میلا ہے

ناچ اور راگ کے کھڑاکے ہیں — گھنگرو اور تال کے جھناکے ہیں
نقلیں قصے کہانی ساکے ہیں — کھنڈ دُہرے کبت کتھا کے ہیں
آرتی کی کہیں مچی ٹھن ٹھن، — کہیں گھنٹوں کی ہو رہی ٹن ٹن
تال مردنگ جھانجھ کی جھن جھن — خاص پرشاد مصری اور ماکھن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آ — جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جا
لے کے مندر سے دو دو کوس لگا — باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا
ہیں ہزاروں بساطی اور سودا — لاکھوں بکتے ہیں گہنے اور مالا
بھیڑ انبوہ اور دھرم دھکّا — جس طرف دیکھئے اہا ہا ہا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہیں ہزاروں ہی جنس کے ہٹّے — موتی مونگا اور آرسی بٹّے
پیڑے لڈو جلیبی اور گٹّے — کولے نارنگی سنگترے کھٹّے
کوئی تو کر رہا ہے چھل بٹّے — کوئی چڑھاتا ہے کھیر کے چھٹّے
پُر ہیں مندر کے کوٹھے اور اٹّے — بوڑھے لڑکے جوان اور کٹّے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

حالیؔ

اقبال مندی کی علامت

الپ ارسلاں سے یہ طغرل نے پوچھا
کہ قومیں ہیں دنیا میں جو جلوہ فرما
نشاں ان کی اقبال مندی کے ہیں کیا
کب اقبال مند ان کو کہنا ہے زیبا
کہا ملک و دولت ہو ہاتھ ان کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ ان کے جب تک

جہاں جائیں وہ سرخ رو ہو کے آئیں
ظفر ہم عناں ہو جدھر باگ اُٹھائیں
نہ بگڑے کبھی کام جو وہ بنائیں
نہ اکھڑے قدم جس جگہ وہ جمائیں
کریں مس کو گر مس تو وہ کیمیا ہو
اگر خاک میں ہاتھ ڈالیں طلا ہو

ولی عہد کی جب کہ باتیں سنیں یہ
ہنسا سن کے فرزانۂ دوربیں یہ
کہا "جانِ عم گپ ہے گو دل نشیں یہ
مگر شرط اقبال ہر گز نہیں یہ"
حوادث سے بن گزارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

بہم ہے کبھی گاہ برہم ہے محفل
کٹھن ہے کبھی گاہ آساں ہے منزل
زمانہ کی گردش سے بچنا ہے مشکل
نہ محفوظ ہیں اس سے مدبر نہ مقبل
بہت یکہ تازوں کو یاں گھرتے دیکھا
سدا شہ سواروں کو یاں گرتے دیکھا

جہاں سود ہے یاں وہاں ہے زیاں بھی جہاں روشنی ہے وہیں ہے دھواں بھی
سقر بھی ہے یہ خاک داں اور جناں بھی بہاریں بھی ہیں اس چمن میں خزاں بھی
نکھرتے ہیں جو یاں وہ گدلاتے بھی ہیں
چمکتے ہیں جو یاں وہ گہناتے بھی ہیں

ضعیف اور قوی ارمنی اور عراقی چکھاتا ہے دُرد قدح سب کو ساقی
یہ اقبال کی ہے رمق جن میں باقی یہ سب تلخیاں ان کی ہیں اتفاقی
بلاؤں میں گھر کر نکل جاتے ہیں وہ
ذرا ڈگمگا کر سنبھل جاتے ہیں وہ

نہیں ہوتے نیرنگ گردوں سے حیراں ہر اک درد کا ڈھونڈھ لیتے ہیں درماں
اٹھاتے نہیں کچھ حوادث سے نقصاں وہ چونک اٹھتے ہیں دیکھ خواب پریشاں
بھڑکتے ہیں افسردہ ہو کر سوا وہ
پھپکتے ہیں پژمردہ ہو کر سوا وہ

پگھلتے ہیں سانچے میں ڈھلنے کی خاطر لگاتے ہیں غوطہ اچھلنے کی خاطر
ٹھہرتے ہیں دم لے کے چلنے کی خاطر وہ کھاتے ہیں ٹھوکر سنبھلنے کی خاطر
سبب کو مرض سے سمجھتے ہیں پہلے
الجھتے ہیں پیچھے سلجھتے ہیں پہلے

اکبرؔ

لبِ ساحل اور موج

دور کوہ لبِ ساحل سے جو گزری اک موج
کوہ نے اس سے کہا "تو نے نہ دیکھا مرا اوج
مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دمِ چند"
بولی "سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند
ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل
اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل"
ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب
"پوچھیے موج سے ہے بھی اسے رک جانے کی تاب
اپنے بس ہی میں نہیں ہے یہ تعلّی کیسی؟
اضطراری ہے روش شانِ ارادی کیسی!"
بہ گئی موج یہ کہہ کر کہ "میں مغرور نہیں
تجھ میں اے کوہ مگر روشنیٔ طور نہیں"
بلبلہ ٹوٹ گیا کوہ بھی خاموش رہا
وہی حیرت رہی دریا کا وہی جوش رہا

رنگ زمانہ

کہاں ثبات کا اس کو خیال ہوتا ہے
زمانہ ماضی ہی ہونے کو حال ہوتا ہے

فروغ بدرقہ باقی رہا نہ بت کا شباب
زوال ہی کے لیے ہر کمال ہوتا ہے

میں چاہتا ہوں کہ بس ایک ہی خیال رہے
مگر خیال سے پیدا خیال ہوتا ہے

بہت پسند ہے مجھ کو خموشی و عزلت
دل اپنا ہوتا ہے اپنا خیال ہوتا ہے

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

سوسائٹی سے الگ ہو تو زندگی دشوار
اگر ملو تو نتیجہ ملال ہوتا ہے

پسند چشم کا ہرگز کچھ اعتبار نہیں
بس اک کرشمۂ وہم و خیال ہوتا ہے

اگرچہ آہ سے تکلیف دل کو ہو لیکن
ہوائے نفس میں کچھ اعتدال ہوتا ہے

نگاہ لطف بتاں مطمئن نہیں کرتی
فریب ہی کا مجھے احتمال ہوتا ہے

خدا کا شوق ہو جس کو میں اس کا شائق ہوں
خدا کا یوں تو ہر اک کو خیال ہوتا ہے

اگرچہ ریش منڈانے میں ہے صفائی رخ
گناہ گار مگر بال بال ہوتا ہے

چکبست

آصف الدولہ کا امام باڑا

(لکھنؤ کا یہ امام باڑا فن تعمیر کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اس کی صناعی کو دیکھنے کے لیے دور دور سے سیاح آتے ہیں۔ چکبست کے چابک دست قلم نے اس امام باڑے کی کتنی موثر تصویر کشی کی ہے یہ نظم ترکیب بند کے طرز پر ہے)

(۱)

آصف الدولہ مرحوم کی تعمیر کہن / جس کی صنعت کا نہیں صفحۂ ہستی پہ جواب
دیکھ سیاح اسے رات کے سناٹے میں / منہ سے اپنے مہ کامل نے جب الٹی ہو نقاب
در و دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک / سحر کرتی ہے نگاہوں پہ ضیائے مہتاب
یہی ہوتا ہے گماں خاک سے مس اس کو نہیں / ہے سنبھالے ہوئے دامن بہ ہوائے شاداب
یک بہ یک دیدۂ حیراں کو یہ شک ہوتا ہے / ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اتر آیا ہے سحاب
بے خودی کہتی ہے آیا یہ فضا میں کیوں کر / کسی استاد مصور کا ہے یہ جلوۂ خواب

اک عجب منظر دل گیر نظر آتا ہے
دور سے عالم تصویر نظر آتا ہے

(۲)

شوکت و شان عمارت کی خبر دیتا ہے / پردۂ شب کے سرکنے پہ سحر کا آغاز
وہ سپیدی سحر نور کی ہلکی ہلکی / آشیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز
ایسے عالم میں وہ کہرے سے ابھرنا اس کا / جیسے موجوں کے تلاطم میں نمایاں ہو جہاز
ہوتے ہیں گنبد و مینار فضا میں ظاہر / بڑھ کے ہوتی ہیں زیارت سے نگاہیں ممتاز
جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوان بلند / جس کی صنعت کا ہے دنیا میں نرالا انداز

پارۂ چوب کے احساں کی ضرورت نہ رہی — خاک اور خشت نے مل کر یہ دکھایا اعجاز
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ — ہے یہ تہذیب اودھ کے لیے سرمایۂ ناز
بچ گیا خاک کے پردے پہ یہ مٹی کا طلسم — گو زمانے کی ہوا اس کے لیے تھی ناساز
اس کے سائے میں گرا تاج حکومت سر سے — اس نے دیکھا یہ زمانے کا نشیب اور فراز
مل گئے خاک میں سب اس کے بسانے والے — کچھ شجرہائے کہن اب ہیں پرانے دم ساز
کیا سر شام اداسی کا سماں رہتا ہے — در و دیوار سے کہہ جاتی ہے رونق پرواز
دھوپ اترتی ہوئی آنکھوں کو یہ دکھلاتی ہے — دل مجروح کا ہر خشت میں ہے سوز و گداز
جس کے فیضان حکومت کا کرشمہ ہے یہ — اس کے سائے میں ہے سویا ہوا وہ خلق نواز
اس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اس کی — اس کے اخلاق کی وسعت کا نہاں اس میں ہے راز
جب زیارت کو محرم میں بشر آتے ہیں — چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

بے ادب پا منہ ایں جا کہ عجب درگاہ است
سجدہ گاہ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

ہ شاہی خاندان کے لوگ۔

بے نظیر شاہ

چاندنی رات

ہے اس ناز سے چاندنی جلوہ گر
کہ سکتے کے عالم میں ہے ہر شجر
تجلی سے وادی یہ معمور ہے
کہ موج ہوا موجۂ نور ہے
وہ پھول اُجلے اُجلے جو ہیں سامنے
کٹوری سی چاندی کی سر پر لیے
دکھاتے ہیں اس وقت کیسی بہار
کہ ہوں ٹوٹ کر جن پہ تارے نثار
چمک ریگ پر صحن بلور کی
بچھائے ہوئے چاندنی نور کی
یہ عالم جو دیکھا تو شکل کتاں
ہوا پارہ پارہ دل عاشقاں
جو بھیگی ہوئی آب رحمت سے رات
کہ تر دامنوں کی ہو جس سے نجات
وہ شبنم کی خنکی وہ ٹھنڈی ہوا
وہ اشجار و آب رواں کی صفا
وہ شاخوں کا جھکنا لچک کر کہیں
وہ لہروں کا اٹھنا چمک کر کہیں
وہ میدان میں چاندنی کا سماں
وہ شبنم کا گرد اس کے کچھ کچھ دھواں
نجوم و قمر کا وہ عکس آب میں
وہ پانی میں جلتی ہوئی مشعلیں

وہ ہر سمت چھایا ہوا نور بدر
وہ شب لیلۃ القدر کو جس کی قدر

شبلی نعمانی

سرسید احمد خاں

وہ کشتۂ قوم، وہ فدائی — اٹھا لیے کاسۂ گدائی
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
ایک ایک سے عرض حال کرتا — در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم وہر انجمن میں پہنچا — ہر باغ میں، ہر چمن میں پہنچا
کاوش سے غرض تھی کچھ نہ کد سے — ملتا تھا ہر ایک نیک و بد سے
مردان خدا پرست سے بھی — رندان سیاہ مست سے بھی
گزرا وہ ہر ایک رہ گزر پر — دی اس نے صدا ہر ایک در پر
کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی — آہ اس کی کہاں کہاں نہ پہنچی
ہر اک کو یہ ماجرا سنایا — ہر بزم میں اپنا راگ گایا
نالے کیے داغ دل دکھا کر — رویا کبھی حال غم سنا کر
کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں — ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر — دشنام سنی دعائیں دے کر
لعل اس نے دیے شرار پائے — گل نذر کیے تو خار پائے
کیا تلخ ملے جواب اس کو — کیا کیا نہ دیے خطاب اس کو

برگشتہ کہا کسی نے دیں سے — لعنت کا صلہ ملا کہیں سے
منظور جو قوم کا تھا اعزاز — ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
دشنام کو وہ دعا ہی سمجھا! — وہ درد کو بھی دوا ہی سمجھا!
جور اُس نے سہے کرم کے بدلے — لطف اس نے کیے ستم کے بدلے
ہرچند کہ مشکلیں تھیں درپیش — گو غیر تھے سب یگانہ و خویش
دل کو نہ رہا تھا آسرا بھی — یاروں میں وفا نہ تھی ذرا بھی
پر زحمتیں گو تھیں ساتھ اس کے — پر زور تھے پر جو ہاتھ اس کے
آگے وہ بڑھا ہٹا کے سب کو — طے کر کے رہا وہ طلب کو
آئے تھے جو سنگ راہ بن کر — سب اڑ گئے برگ کاہ بن کر
آہوں نے دکھائی اس کی تاثیر — کام آئے وہ نالہ ہائے شب گیر
پردرد جو اس کی داستاں تھی — لبریز اثر جو وہ فغاں تھی
ٹھنڈے ہوئے، تھے جو گرم خو بھی — دل تھام کے رہ گئے عدو بھی
ہمت تھی جو شمع راہ اس کی — خالی نہ گئی وہ آہ اس کی
ہونی تھی کہ قوم کے پھریں دن — نالے نہ رہے اثر کیے بن
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر — ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے — اخبار کہیں، کہیں رسالے
تعلیم کے جابجا وہ جلسے — گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بے تاب ہر ایک جزو و کل تھا — ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

تعمیرِ قومی

درخت جڑ پہ ہے قائم تو استوار بھی ہے — کبھی خزاں ہے اور اس پر کبھی بہار بھی ہے
خلاف اس کے کرے گی خرد جو بے صبری — نہیں اٹھانے کا نیچر حکومتِ جبری
جو کوئی چاہے کہ قائم کرے نئی بنیاد — تو برگ بار نہ دار درخت بھی برباد

بنائے عظمتِ قومی ہے فطرتی اے یار — اسی بنا سے ہے وابستہ ہر خزاں و بہار
خیال وقعت ملت کا جس پہ ہے غالب — طریق راحت ذاتی کا وہ نہیں طالب
طریق حکمت و تزئیں ہر ایک رنگ میں ہے — نہ سمجھو یہ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے
نگاہِ غور کرو سوئے ٹرکی و ایران — نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویران
تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گمان آئے — تمہارے جسم میں کیوں دوسرے کی جان آئے
جو تو نے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا — تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا

جو بات ٹھیک ہے کہتا ہوں میں سے کھل کر
کہ سلطنت نہ سہی تم رہو تو ہل جل کر

وحید الدین سلیم

آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں

وہ دیکھ، کہ موجیں رقص کناں ہیں سطح زمیں پر گنگا کی
نو وارد آریہ حیرت میں ہیں، دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی، اٹکھیلیاں کرتی دھارا اس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں، متوالی ہے رفتار اس کی

اتر کی طرف جب اٹھتی ہے، اس قافلۂ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج کی، ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
پر قلۂ کوہ ہمالہ پر، عظمت کے ہیں بادل چھائے ہوئے
سینوں کو ہیں تانے دیو کھڑے، امبر سے سروں کو ملائے ہوئے

برگد کے درختوں کے جنگل، پھیلے ہیں پہاڑ کے دامن میں
شاخیں ہیں جوان کی سایہ فگن، ظلمت کا سماں ہے ہر بن میں
پھرتے ہیں وہ پیل مست یہاں، ہے دیو کا جن کے قد پہ گماں
یہ کالی گھٹا جب دوڑتی ہے، آتا ہے نظر ہیبت کا سماں

ہیں رنگ برنگ کے پھول کھلے زینت ہے چمن کی شباب ان کا
کھولا ہے نسیم سحر نے ابھی، کس شان سے بند نقاب ان کا
آئے ہیں مسافر ہند میں جو، خیبر کے دروں سے اتر کے ابھی
دیکھے تھے انھوں نے لالہ و گل، پامیر کی وادی میں نہ کبھی

طائر بھی یہاں پیدا ہیں کیے، قدرت نے عجب گل رنگ و حسیں
گر زمزمے ان کے رشی سن لیں، یاد آئے انہیں فردوس بریں
اندر کے اکھاڑے کی پریاں، گاتی ہیں جو دل کش راگنیاں
یہ لوچ سر دل سے ہیں ان کے نہیں، یہ سوز گلوں میں ان کے کہاں

سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں، ہیں چھیڑتی ٹھنڈی ہواؤں کو
بھر دیتی ہیں ذرہ حرارت سے، باغوں کو اور ان کی فضاؤں کو
سوتی ہوئی سوتیں چشموں کی، اٹھتی ہیں سب آنکھیں مل مل کر
دھاریں ہیں جو برف کے پانی کی، آتی ہیں پہاڑوں سے چل کر

اے آریو! آؤ قدم رکھو، ان حسن بھرے گل زاروں میں
جنت کے مزے لوٹو گے سدا، اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر، شہر اپنے نئے آباد کرو
گا گا کے بھجن، کر کر کے ہون، ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

اقبال

اخترِ صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے اماں مجھی کو تہِ دامنِ سحر نہ ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی
کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر! غمِ فنا ہے تجھے! گنبدِ فلک سے اتر
ٹپک بلندیٔ گردوں سے ہمرہِ شبنم مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

پارۂ چوب کے احساں کی ضرورت نہ رہی | خاک اور خشت نے مل کر یہ دکھایا اعجاز
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ | ہے یہ تہذیب اودھ کے لیے سرمایۂ ناز
بچ گیا خاک کے پردے یہ یہ مٹی کا طلسم | گو زمانے کی ہوا اس کے لیے تھی ناساز
اس کے سائے میں گرا تاج حکومت سر سے | اس نے دیکھا یہ زمانے کا نشیب اور فراز
مل گئے خاک میں سب اس کے بسانے والے | کچھ شجرہائے کہن اب ہیں پرانے دم ساز
کیا سر شام اداسی کا سماں رہتا ہے | در و دیوار سے کر جاتی ہے رونق پرواز
دھوپ اترتی ہوئی آنکھوں کو یہ دکھلاتی ہے | دل مجروح کا ہر خشت میں ہے سوز و گداز
جس کے فیضان حکومت کا کرشمہ ہے یہ | اس کے سائے میں ہے سویا ہوا وہ خلق نواز
اس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اس کی | اس کے اخلاق کی وسعت کا نہاں اس میں ہے راز
جب زیارت کو محرم میں بشر آتے ہیں | چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

"بے ادب پا منہ ایں جا کہ عجب درگاہ است
سجدہ گاہ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

ہ شاہی خاندان کے لوگ۔

اقبال

سیرِ فلک

(اقبال کی شاعری عمل، حرکت اور احساس خودی کی شاعری ہے۔ ان کا شعر ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ انساں اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس نظم کا بنیادی خیال بھی یہی ہے)

تھا تخیل جو ہم سفر میرا — آسماں پر ہوا گزر میرا
اڑتا جاتا تھا اور نہ تھا کوئی — جاننے والا چرخ پر میرا
تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے — رازِ سربستہ تھا سفر میرا

حلقۂ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا

کیا سناؤں تمھیں ارم کیا ہے — خاتمِ آرزوے دیدہ و گوش
شاخِ طوبیٰ پہ نغمہ ریز طیور — بے حجابانہ حور جلوہ فروش
ساقیانِ جمیل جام بدست — پینے والوں میں شورِ نوشانوش
دور جنت سے آنکھ نے دیکھا — ایک تاریک خانہ سرد و خموش
طالعِ قیس و گیسوے لیلیٰ — اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر — کرۂ زمہریر ہو روپوش

میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی　　حیرت انگیز تھا جواب سروش
یہ مقام خنک جہنم ہے　　نار سے، نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے　　جن سے لرزاں ہیں مرد عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

اختر صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا　　ملی نگاہ مگر فرصت نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دم آفتاب سے ہر شے　　اماں مجھی کو تہِ دامن سحر نہ ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی
کہا یہ میں نے کہ اے زیور جبین سحر!　　غم فنا ہے تجھے؟ گنبد فلک سے اتر
ٹپک بلندی گردوں سے ہمرہ شبنم　　مرے ریاض سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں، محبت بہار ہے اس کی
بنا مثال ابد پائدار ہے اس کی

شعاعِ امید

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میری تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو یہ چمنستان و بیابان و در و بام

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب! نہ کر ہم کو فراموش

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب!
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب!

چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درناب!
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب!
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب!
بت خانے کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب!
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

صفؔی لکھنوی

بہار

قابلِ دید ہے سرسبزیِ ایامِ بہار
مل گیا سبزۂ خوابیدہ کو پیغامِ بہار
ساغرِ گل کہ چھلکتا ہے کوئی جامِ بہار
ہو گیا چار طرف نامِ خدا نامِ بہار

آسماں سبز، زمیں سبز، در و بام ہیں سبز
اثرِ پرتوِ مینا سے خطِ جام ہیں سبز

عارضِ گل پہ صفؔی دوڑ گیا رنگِ بہار
کوئی غنچے کے سوا اب نہیں دل تنگِ بہار
ٹہنیاں جن میں نہ ہوں پھول ہیں وہ ننگِ بہار
تختۂ صحنِ چمن تختۂ ارژنگِ بہار

گو ستے گوشے میں ہزاروں ہی تو ہیں گل بوٹے
لطفِ نازونگہِ شوق کہاں تک لوٹے

دیکھ کر جلوۂ آرائشِ کاشانۂ گل
بلبلیں ہو گئیں سو جان سے دیوانۂ گل
جنبشِ شاخ سے وہ جلوۂ مستانۂ گل
مئے شبنم سے چھلکتا ہوا پیمانۂ گل

کوئی ساقی ہے نظر گو وہ نہیں آتا ہے
جام پر جام جو گل بن کو دیے جاتا ہے

بزمِ مرغانِ چمن اول شب سے شاخیں
وجد میں جھومتی ہیں جوشِ طرب میں شاخیں
جھکی پڑتی ہیں نزاکت کے سبب سے شاخیں
پازمیں بوس ہیں یہ فرطِ ادب سے شاخیں

جس قدر ٹہنیوں میں تیز ہے سبزی دیکھو
اس سے بڑھ کر کہیں گل ریز ہے سبزی دیکھو

دیکھیے فلسفیانہ تو نباتات کا جوش   پیکرِ روح نباتی ہیں ہے ذرات کا جوش
ہر طرف جوشِ بہار اور یہ برسات کا جوش   اف کسی حسن خود آرا کے خیالات کا جوش
یہ سلیقہ کہیں نیچر کو تھا گل کاری ہیں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری ہیں

تھے نہاں خاک کے پردے میں جو اب تک اسرار   سب نمودار ہوئے بن کے وہی نقش و نگار
جس طرف آنکھ اٹھاؤ نظر آتی ہے بہار   چشمۂ آبِ رواں عکسِ فروشِ گل زار
آبشاروں نے بلندی پہ جڑے آئینے
قدِ آدم سے بھی کچھ اور بڑے آئینے

باغ کے بیچ میں پُر لطف عجب نظارے   نور کا حوض چمن نور کے سب فوارے
قطرے پانی کے چمکتے ہوئے یا سیارے   یہی ہوتا ہے گماں ڈوب رہے ہیں تارے
پانی لیتے ہیں خزانوں کو گہر دیتے ہیں
جوشِ ہمت کی نگاہوں کو خبر دیتے ہیں

ظریف لکھنوی

جہاز کا ایک دلچسپ سفر

(یہ انتخاب ظریف صاحب کی طویل نظم سفر بغداد سے ماخوذ ہے۔ اس حصہ میں ان مستورات کی حالت بیان کی گئی ہے جو مقدس مقامات کی زیارت کے لیے ان کے ساتھ سفر کر رہی تھیں)

تھیں جن کے ساتھ عورتیں ان کا نہ پوچھو حال
لے جانا اور لانا تھا اک جان کا وبال
سیڑھی سے ان کو لے کے اترنا تھا اک کمال
بے پردگی کا دھیان نہ پردے کا تھا خیال
یہ پردہ داری جان کے اوپر عذاب تھی
ان عورتوں سے مردوں کی مٹی خراب تھی

کہتی تھی کوئی، لو مرا برقع اٹک گیا
ہے ہے نیا تھا تھا، تین جگہ سے مسک گیا
صاحب سنبھالو سر سے دوپٹہ کھسک گیا
لو پائچہ الجھ گیا، مقنع سرک گیا
کیا گت بنی ہے سب کی نگوڑے جہاز پر
پھسلن ہے کس غضب کی نگوڑے جہاز پر

لو بیوی، پان دان کا ڈھکنا بھی گر گیا
آفت پڑے جہاز پر، کتھا بھی گر گیا
توبہ ہے میرے بچے کا بوا بھی گر گیا
اے لو! نگوڑے طوطے کا پنجرا بھی گر گیا
کشتی پہ بقچی رہ گئی، ہے ہے غضب ہوا!
بٹیا کی ٹوپی بہہ گئی، ہے ہے غضب ہوا!

لوگو، مرے مقابے کی ڈبیا کدھر گئی　　کجلوٹی میرے بچے کی خالا کدھر گئی
باجی بتاؤ، لڑکے کی انا کدھر گئی　　کھیلے گی بچی کاہے سے، گڑیا کدھر گئی

چیزوں پہ پانی پھر گیا کیسا ستم ہوا
لو میرا بٹوا گر گیا، کیسا ستم ہوا

چاندی کی، لو سلائی مری کھو گئی موئی　　ہلڑ نگوڑ مارا یہ کاہے کا ہے، ووئی!
ہے ہے، نکالی کس نے تلے دانی سے سوئی　　ناخون کاٹنے کی مری قینچی کیا ہوئی

لڈن کے گھونگھرو، ببو کی چھاگل بھی گر پڑی
لو میرے سر کے تیل کی بوتل بھی گر پڑی

کیا چھوٹی سیڑھیاں ہیں نگوڑی خدا کی مار　　ایسا جہاز نوج ہو در گور دور پار
ہلتی بھی ہیں نگوڑیاں جن کو نہیں قرار　　رسی ہیں ڈنڈے باندھ دیے ہیں گے پانچ چار

زینہ نگوڑ ماروں نے کیسا بنایا ہے
یہ تو موؤں نے نٹ کا تماشا بنایا ہے

پہنچوں گی اب کی گرچہ اصل خیر سے میں گھر　　بیوی اُمینٹھے کان کروں گی نہ پھر سفر
قسمت میں کھا نا ٹھوکریں لکھا تھا دربدر　　ہچکولے مجھ کو یاد رہیں گے یہ عمر بھر

وہ کون لوگ ہیں کہ جو آتے ہیں بار بار
سچ ہے بوا کہ گھر ہے غنیمت ہزار بار

دُرگا سہائے سرور

"گل خزاں دیدہ"

خوشا وہ دن کہ میں آرائش صحن گلستاں تھا
خوشا وہ دن کہ میرے فرق پر تاج زرافشاں تھا
صبا گہوارہ جنباں قصہ گو بانگ عنادل تھی
مرا چھوٹا سا بستر خواب آرائش کا ساماں تھا
فضائے لالہ و ریحان و گل پریوں کی محفل تھی
نسیم صبح کا جھونکا جو تھا تختِ سلیماں تھا
ترنم ریز تھا شاخوں پہ میری طائر سدرہ
چمن کا میرے دست آموز اک مرغ غزل خواں تھا
جواب ہے خطۂ کشمیر میرا کنج دل کش تھا
بہار سبزۂ گل بھی ہجوم سرو ریحاں تھا
ادھر سنبل کو تھا ناز اپنے گیسوئے مسلسل پر
ادھر نرگس کو گلشن میں غرور چشم فتاں تھا
کلی دوشیزۂ ناکت خدا اک تھی گلشن میں
شگوفہ جو چمن میں تھا عروس گل بہ داماں تھا

کہاں لائی اڑا کر آہ تو بادِ خزاں مجھ کو
کہیں خارِ مغیلاں تھے کہیں غولِ بیاباں تھا
بہارِ عالمِ نیرنگ تھی ہر پنکھڑی میری
نہ تھا معلوم رنگِ انقلابِ دہر پنہاں تھا
حقیقت کھل گئی دورِ خزاں آیا جو گلشن میں
نہ تھا غازہ رخِ گل رنگ پر خونِ شہیداں تھا
تحیر زا تھا منظر آہ! اک اک باغِ ہستی کا
وجودِ عالمِ امکاں مگر خوابِ پریشاں تھا

سیمابؔ اکبر آبادی

تاج شب تاریک میں

(سیماب صاحب کے مجموعۂ کلام "کارِ امروز" سے منتخب کی گئی)

رات آئی پردۂ تاریک پھیلاتی ہوئی   جلوۂ شام و شفق کے ساتھ اتراتی ہوئی
حکم رانی ہو گئی ظلمت کی دشت و باغ پر   روشنی سمٹی ہر اک گوشے سے شرماتی ہوئی
ناگہاں مغرب سے اک خاموش تاریکی بڑھی   جگنوؤں کے روپ میں تارے سے چمکاتی ہوئی
جل اٹھیں شمعیں کہ عالم میں اندھیرا ہو گیا
اور پروانوں کی دنیا میں سویرا ہو گیا
اک اداسی ہر جگہ ہر چیز پر طاری ہوئی   عالمِ اجسام میں مرنے کی تیاری ہوئی
خواب نے انگڑائیاں لیں، لی جماہی کسل نے   انجمن میں بے خودی کی گرم بازاری ہوئی
اک نقابِ جلوہ دشمن میں مناظر چھپ گئے   حسن کو بارِ تماشا سے سبک ساری ہوئی
غرق اک سیال مستی میں زمانہ ہو گیا
ہو گیا غافل مصور، اور شاعر سو گیا
ہاں مگر اک "تاج" ہے اس وقت لعلِ شب چراغ   نور اس کا ہے نمایاں بجھ گئے ہیں سب چراغ
چاند سے گنبد کے، پیدا ہے طلائی روشنی   پھول کے معنی تجلی، غنچے کا مطلب چراغ
لاؤ تابانی میں اس کی اس کا عالم دیکھ لیں   کون اب فانوس مانگے کون ڈھونڈھے اب چراغ
اس کے سائے میں گیاہ سبز نخلِ طور ہے
زندگی اس کے اندھیرے میں ہمیں منظور ہے

شمع بن کر حوض میں اس کے شگفتہ ہیں کنول
چاندنی کا پھول ہے گویا شب مہ کا بدل

خلوت سبزہ میں ہیں جگنو چراغان بہار
نسترین و نسترن کا ہر روش پر ہے عمل

اس کا عکس مرمریں ماحول پر ہے نور بار
جب ادھر دیکھا تو گویا آفتاب آیا نکل

ہر روش پر زندگی کے مرتسم عنوان ہیں
تاج کی تو رات میں بھی صبح کے سامان ہیں

"تاج" اک موتی ہے، موتی نور کا جویا نہیں
"تاج" اک تارا ہے، تارا خواب کا آشنا نہیں

رات دن بیدار، پر انوار، سرشار بہار
"تاج" ہے اک چاند قسمت چاند کو سونا نہیں

پردۂ تاریک شب غالب ہوا اس پر کس طرح
"تاج" اک سورج ہے، اور سورج کبھی چھپتا نہیں

ہیں جو ظلمت جذب کر لینے کے جوہر "تاج" میں
نور بن جاتی ہے خود بھی رات آ کر "تاج" میں

تاج منہ سے بولتا ہے ساری دنیا ہے خموش
تاج اب تک ہے درخشاں تاج والا ہے خموش

رات کو آ "تاج" میں اور نغمۂ اسرار سن
گلستان "تاج" کا گو پتا پتا ہے خموش

کوئی سن سکتا ہے سب کچھ اور کوئی کچھ نہیں
ذرہ ذرہ نغمہ گر ہے، ذرہ ذرہ ہے خموش

ساری دنیا سو رہی ہے "تاج" جلوہ بار ہے
مادیت خواب میں، روحانیت بیدار ہے

جوشؔ

آواز کی سیڑھیاں

کل جھٹپٹے کے وقت کہ تھا زرد آفتاب　　چھایا ہوا تھا عرصۂ ہستی پہ رنگ خواب
ظلمت کی بڑھ رہی تھی لگاوٹ فضا کے ساتھ　　اک راگنی سی کھیل رہی تھی ہوا کے ساتھ
ہر سانس پر شفق کا گریباں تھا چاک چاک　　تھا اک خلا سا وقت کے سینے میں ہولناک

اتنے میں آئی مل کے صدائے طیور سے
بن کے کسی نگار کی آواز دور سے

بے صرفہ جستجو کی کہانی لیے ہوئے　　اک نو اسیر غم کی جوانی لیے ہوئے
نا آزمودہ غم کی جبیں چومتی ہوئی　　تپتی ہوئی لرزتی ہوئی جھومتی ہوئی
بیگانہ رسم عیش کی فکر فضول سے　　ملتی ہوئی غروب کی باد ملول سے

کچھ سرخیِ شفق میں سیاہی سی آگئی
میداں پہ اک اداس خموشی سی چھا گئی

ویرانہ فرط درد سے غم ناک ہو گیا　　اتنے میں کچھ ٹھہر کے پھر آئی وہی صدا

نغمے کی نبض سرد مکرّر تپاں ہوئی
گویا ٹھہر کے موج دوبارہ رواں ہوئی

پھر اس کے بعد تیز ہوئی تان دفعتہً — اللہ رے زور گونج اٹھا گنبد کہن
اور اس کے بعد لحن کا دامن سمٹ گیا
اور یوں صدا کا زور بہ تدریج گھٹ گیا
گویا سفید، دودھ سی، پتھر کی سیڑھیاں — پتلی، سبک، خنک، متناسب گہر فشاں
تیشے سے زیر و بم کے ترش کر سنور گئیں
ساحل سے تا بہ نہر مچلتی اتر گئیں

البیلی صبح

نظر جھکائے عروس فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھرتھرا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

طیور بزم سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مسکرا رہی ہے

سحر کو مد نظر ہیں کتنی رعایتیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں، ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

جوالا پرشاد برقؔ

عروس بہار

اٹھلاتی، لجاتی، مسکراتی
کس ناز سے ہے بہار آتی

کم سن، الھڑ، حسین، انیلی
چوتھی کی دولھن نئی نویلی

گہنا پھولوں کا زیب تن ہے
دھانی جوڑے پہ کیا پھبن ہے

گھونگھٹ اک ناز سے نکالے
سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے

ہریالی بنی وطن میں آئی
اک سبز پری چمن میں آئی

اتری گلشن میں جب سواری
سورج نے آرتی اتاری

گل نے زر گل کیا نچھاور
صدقے ہوئی عندلیب اڑ کر

شبنم بھر لائی کورے کورے
شربت میں گلاب کے سکورے

خورشید نے آئینہ دکھایا
کرنوں نے مورچھل ہلایا

نہریں بھر بھر کے لائیں پانی
سبزے نے بچھایا فرش دھانی

خوشیاں اشجار نے منائیں
میووں کی ڈالیاں لگائیں

غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں
بلبل نے چہک کے دیں دعائیں

مرغان چمن نے گیت گائے
کیا کیا نئے زمزمے سنائے

بدلی پھولوں نے اپنی وردی
اودی، زنگاری، لاجوردی

بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی
کوئل نے یہ بھیروی سنا دی

معشوقۂ گل عذار آئی
آئی آئی بہار آئی

حفیظ جالندھری

تین نغمے

ہم نوا کوئی نہ پایا جب زمیں کے فرش پر
جادۂ پامال مہر و ماہ طے کرتا ہوا
کہکشاں تا کہکشاں بڑھتا گیا بڑھتا گیا
زہرۂ افلاک میری لے اڑا کر لے گئی
کارپردازانِ قدرت ہم سفر بنتے گئے
مرحبا کہتے ہوئے ننھی سی مشتِ خاک پر
دو فرشتے ساتھ چلتے چلتے آخر رہ گئے
میں کہ تھا سرمستِ صہبائے ازل چلتا گیا
چلتے چلتے ایک ندی راہ میں حائل ہوئی
ہلکی ہلکی پر سکوں لہروں میں لہراتی ہوئی
لہریا آبی دوپٹا تا کمر لپٹا ہوا
عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ
جھاڑیاں تھیں یا کہ سکھیاں تھیں قطار اندر قطار
نازنیں شاخیں لچکتیں سر سراتیں جھومتیں
پھول سے کانٹا حسین معلوم ہوتا تھا یہاں

میرا نغمہ لے چلا مجھ کو اڑا کر عرش پر
مہ بہ مہ انجم بہ انجم راہ طے کرتا ہوا
آسماں تا آسماں چڑھتا گیا چڑھتا گیا
نقش سوز و ساز کے دل میں بٹھا کے گئی
اپنی اپنی منزلوں تک راہ بر بنتے گئے
ہو گئے رخصت ستارے بامِ ہفت افلاک پر
اے بشر! اب تیری جرأت ہے یہ فقرہ کہہ گئے
پاؤں تھک کر رہ گئے تو سر کے بل چلتا گیا
میرے ارمانوں منزل گاہ میں حائل ہوئی
میٹھے میٹھے گیت اپنی پریت کے گاتی ہوئی
دامنوں سے دامنِ شام و سحر لپٹا ہوا
تھی ہوا اس کے لئے ہم راز مشاطہ کا ہاتھ
نذر لائی تھیں پھلوں کی ڈالیاں پھولوں کے ہار
اپنے اپنے عکس کا منہ آئینے میں چومتیں
سبزہ بیگانہ نہیں معلوم ہوتا تھا یہاں

میرے جی میں بس گئی اس کی سکوت افزا بہار
میں یہ سمجھا ہو گیا میرا مقدر سازگار

پاؤں پھیلا کر خنک ندی میں سر دھننے لگا
آب جو کا نغمۂ جادو اثر سننے لگا

اب ہوا محسوس یہ سارا سماں نغمے کا ہے
یہ زمیں نغمے کی ہے یہ آسماں نغمے کا ہے

یہ عجب نغمہ تھا، اطمینان بخش و بے خروش
یہ عجب نشہ تھا جس میں کوئی بے تابی نہ جوش

محو گل گشت چمن پہنے ہوئے کلیوں کے ہار
نغمہ تھا، یا شام کی ٹھنڈی نسیم خوش گوار

نغمہ تھا یا حدت خوں کے لئے برف آب تھا
یا تھکے ماندوں کی بستی میں نفیر خواب تھا

نغمہ خواب آور تھا نیند آنے لگی میں سو گیا
اپنی منزل بھول کر اس رنگ و بو میں کھو گیا

کوئی ندی تھی نہ میدانِ گل و لالہ تھا یہ
نغمۂ ٹیگور تھا یہ سحرِ بنگالہ تھا یہ

دیکھ کر نغمے کا افسوں میں یہ حیراں ہو گیا
میری جمعیت کا شیرازہ پریشاں ہو گیا

پھول تھے، خوشبو بھی تھی، نشہ تھا، فضا تھی، مے نہ تھا
ساز کی دھڑکن بھی تھی، نغمے کی صدا تھی، میں نہ تھا

میری اپنی روح کے نغمے کی لے کم ہو گئی
قلب کو گرمانے والی کوئی شے گم ہو گئی

یاد مجھ کو اب وہ پہلی زندگی آنے لگی
یعنی اس افتاد سے شرمندگی آنے لگی

تازیانہ بن گیا مہرِ عمل یہ انفعال
دفعتاً پیدا ہوا خود اعتمادی کا خیال

جاگ اٹھا میں اور کنارے ہی کنارے چل پڑا
سر نگوں ہارے ہوئے دل کے سہارے چل پڑا

اس طرح طے کر گیا میں سرحدِ ادراک بھی
میرا منہ تکنے لگی اب جرأت بے باک بھی

سامنے دیکھا تو اک دریا نظر آیا مجھے
میری منزل آ گئی ایسا نظر آیا مجھے

مل گئی تھی جا کے دریا سے یہ پیاری جوئے آب
یعنی اپنے مدعا میں ہو گئی تھی کامیاب

یہ عروسِ فکرِ رنگیں بن سنور کر آئی تھی
دامنِ آبِ رواں میں پھول بھر کر لائی تھی

اک محبت، ایک مسرت کے نرالے جوش میں
لے لیا تھا بڑھ کے دریا نے اسے آغوش میں

پھر مرے ذوقِ عمل کو اک سہارا مل گیا — وہ کنارا مجھ سے چھوٹا یہ کنارا مل گیا
ہاں یہ دریا تھا مگر دریائے ناپیدا کنار — خوش نما، پر ہول، نغمہ آفریں اور پر وقار
سیل در آغوشِ سیل اور موج در آغوشِ موج — ہر طرف پر جوش لشکر ہر طرف پر جوش فوج
ایک طوفانِ تلاطم ایک سیلابِ رواں — ظاہراً آبِ رواں باطن میں سیمابِ رواں

سازِ قدرت واصلِ مضراب تھا دریا نہ تھا
اک مسلسل نغمۂ بے تاب تھا دریا نہ تھا

جس طرح آجائے پیاسا ساحلِ مطلوب پر — یا اچانک کوئی جا پہنچے درِ محبوب پر
اب یہ طوفانِ حیات افزا تھا میرے سامنے — نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے
درد کی چیخیں اٹھیں میرے شکستہ ساز سے — آب دیدہ ہو گیا دریا مری آواز سے
میرا نغمہ، نغمۂ دریا سے کم آواز تھا — ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا
ہوش نے چاہا کہ فکرِ خود فراموشی کروں — قطرہ ہوں، دریا سے مل جاؤں، ہم آغوشی کروں
اپنی ہستی کا ابھی تک تھا مگر دھوکا مجھے — شوق نے آگے بڑھایا، ضبط نے روکا مجھے
کھینچنے کو دوڑ کر موجوں کی زنجیریں بڑھیں — روکنے کو حفظِ خودداری کی تدبیریں بڑھیں
یہ خودی یہ بے خودی یہ ضبط اور یہ اشتیاق — اس طرح الجھے کہ آخر بن گئے دامِ فراق

مدعائے زیست حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا
جزو اپنے کل سے واصل ہوتے ہوتے رہ گیا

آنند نرائن ملا

ٹیگور کی یاد میں

خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعرِ اعظم تجھے سلام مرا
تجھے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
سحر کی مست ہوائیں سلام کہتی ہیں
یہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں
کہ ذرے ذرے پہ برسا ہے ابرِ جام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

شبیہ حسن ہے تیرے نگار خانوں میں
سرودِ عشق جواں ہے ترے ترانوں میں
حیات رقص کناں ہے ترے فسانوں میں
کہ اک بہشت ترنم ہے یا کلام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

کدورتوں پہ سدا خاک ڈالنے والا
خصومتوں کو محبت میں ڈھالنے والا
دلوں سے درد کا کانٹا نکالنے والا
سکون و امن کا حامل ہے ہر پیام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

وہ زیست پائی کہ اک کائنات رشک کرے
وہ خوبیاں تھیں کہ ہر ذی حیات رشک کرے
ملی وہ موت کہ جس پر حیات رشک کرے
یہ بزم سوگ ہے تیری کہ جشنِ عام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

افسر میرٹھی

طلوع خورشید نو

("جوئے رواں" سے منتخب کی گئی)

امن کے مشرق سے پھر ظاہر سحر ہونے کو ہے
آفتاب عافیت پھر جلوہ گر ہونے کو ہے

عہد گل آنے کو ہے پھولوں کی بارش کے لیے
ختم دور برق و بارود و شرر ہونے کو ہے

جلوہ گر ہونے کو ہے صبح بہار آشتی
ظلم سے آزاد کل نوع بشر ہونے کو ہے

ختم ہونے کو ہے وہم پاستاں کی رات اب
آفتاب فکر فردا جلوہ گر ہونے کو ہے

خضر کے اوصاف ہر رہرو کو بخشے جائیں گے
رہ زنوں سے پاک اب ہر رہ گزر ہونے کو ہے

ظلم و خود غرضی کا پرچم ہو رہا ہے سرنگوں
امن و راحت کا نشاں پیش نظر ہونے کو ہے

زیست کی لذت سے ہوگی آشنا نوع بشر
یعنی ہر اک تلخ اب شہد و شکر ہونے کو ہے

فرق مٹ جانے کو ہے انسان اور انسان کا
وحدت اقوام عالم جلوہ گر ہونے کو ہے

مل رہا ہے خاک میں قصر روایات قدیم
مطلع خورشید نو بر بام و در ہونے کو ہے

اختر شیرانی

نغمۂ زندگی

(اخترستان سے منتخب کی گئی)

بربط کائنات پر نغمہ سرا ہے زندگی — مست نوا ہے زندگی
وادیٔ مہر و ماہ تک بال کشا ہے زندگی — جلوہ نما ہے زندگی
جس کی کچھ ابتدا نہیں جس کی کچھ انتہا نہیں — جس کو کبھی فنا نہیں
خواب گہ فنا میں وہ موج صدا ہے زندگی — رقص صبا ہے زندگی
موسم شعلہ بار میں، دامن کشت زار میں — سینۂ کاشت کار میں
بن کے لہو کا اضطراب ہم ہمہ زا ہے زندگی — نغمہ سرا ہے زندگی
جام ہیں مختلف تو ہوں ان میں شراب ایک ہے — بادۂ ناب ایک ہے
ساز فنا میں مشترک ایک صدا ہے زندگی — ایک نوا ہے زندگی
رہ رو راہ ارتقا کے لیے اک مقام ہے — راہ زن خرام ہے
لے کے عدم سے تا عدم ایک فضا ہے زندگی — راہ نما ہے زندگی
اس کی ہوائے تند پر تیر رہی ہے کائنات — مست شراب حیات
طائر دہر کے لیے ایک فضا ہے زندگی — کیا کہوں کیا ہے زندگی

فیض احمد فیضؔ

اقبالؔ

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران مے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے باد فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشت صرصر سے بے خطر
یا شمع بزم صبح کی آمد سے بے نیاز

مجاز

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی

ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی

جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگھروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلھن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی

جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بہ دم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی

سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی

اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی

اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی

اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی / غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی / اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی، بکھری ہوئی / شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
پل پہ دریا کے دمادم کوندتی، للکارتی / اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں / ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر / دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی / ایک مفلس کی طرح سردی میں تھرّاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش / حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت سے نظر / کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامنِ تاریکیِ شب کی اڑاتی دھجیاں / قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آ جائے تو اس کو پیس کر / ارتقاے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے / ایک طوفانی گرج کے ساتھ دَرّاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار / عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ / گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے / وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی

الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

علی سردار جعفری

ٹوٹتا ہوا ستارہ

(انفرادیت کی شان دار ناکامی)

(یہ نظم جو علی سردار جعفری کے مجموعۂ کلام 'پرواز' سے منتخب کی گئی ہے
ان کی شاعرانہ فن کاری کا اچھا نمونہ ہے)

آرہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامانِ ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئینِ فطرت کو نثار
کس قدر بے باک، کتنا تیز، کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار
موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لیے
بڑھ رہا ہے کرۂ گیتی کا شوقِ انتظار
لیکن ایسا انجم روشن جبین و تابناک
خود ہی ہو جاتا ہے اپنی تابناکی کا شکار

مزید مطالعہ کے لیے :- انتخاب نظیر اکبرآبادی، امیر حسن نورانی

کلیاتِ اکبر

بانگِ درا، ضربِ کلیم اور بالِ جبریل کی منتخب نظمیں اور قطعات

شعلۂ و شبنم، جوش ملیح آبادی

کارِ امروز، سیماب

مسدسِ حالی

جوئے رواں، افسر میرٹھی

آتشِ خاموش، نوائے کارگر، احسان دانش

آہنگ، مجاز

فروزاں، جذبی

مشقیں

۱۔ نظمِ جدید کو سمجھاتے ہوئے شکل کے اعتبار سے، نظم کی مختلف شکلوں کا بیان ہو چکا ہے۔ تمھارے اقتباسات میں، ترکیب بند، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن وغیرہ کی مثالیں موجود ہیں، انھیں چھانٹو۔ نظم کی دوسری شکلوں کی مثالیں شعرا کے مجموعوں سے معلوم کرو۔ نظم کی ایک شکل مستزاد بھی ہے اس میں مصرع کے آخری ٹکڑے کے وزن پر ایک ہم وزن ٹکڑا اور لگا دیتے ہیں جیسے :-

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی ـــــ ناچتی گاتی ہوئی

جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی ـــــ عطر اڑاتی ہوئی

بادِ بہاری چلی

۲۔ درد کی چیخیں اُٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آب دیدہ ہوگیا دریا مری آواز سے

اس شعر میں شکستہ ساز سے دریا کی چیخوں کا اٹھنا اور دریا کا آب دیدہ ہونا بتایا ہے جو حقیقت میں اُن کی علت نہیں ہے۔ یہ حسن تعلیل کی مثال ہے۔ کسی شے کے لیے ایسی علت بیان کرنا جو حقیقت میں اس کی علت نہیں ہے حسن تعلیل ہے۔ تم پڑھے ہوئے اسباق سے حسن تعلیل کی کچھ مثالیں چھانٹو۔

۳۔ اقبال کی نظم "سیر فلک" دیکھو۔ اشعار میں اِرم، طوبیٰ، قیس و لیلیٰ کے قصوں کی طرف اشارے ہیں۔ ارم، شداد کی بہشت کہا جاتا ہے کہ خدا نے اس بہشت کو آسمان پر اٹھالیا ہے۔ طوبیٰ سے مراد جنت کا درخت ہے جو آخری آسمان پر ہے، جہاں شب معراج میں آں حضرت صلعم پہنچے تھے۔ ایسے اشاروں کو صنعت تلمیح کہتے ہیں۔ تم حصۂ نظم سے تلمیحات کی مثالیں چھانٹو اور یہ معلوم کرو کہ ان میں کن واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

نثر۔ شاعروں کے حالات

آتش۔ خواجہ حیدر علی (۱۷۶۷-۱۸۴۷ء)

فیض آباد میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ کم عمری میں سر سے اٹھ گیا۔ اس وجہ سے یہ کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ مزاج میں شوریدہ سری اور بانکپن پیدا ہو گیا۔ آتش لکھنؤ آئے اور مصحفی کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں کثرت مشق اور اُفتاد طبع کی بدولت اُستاد کے ہم پلّہ ہو گئے۔

آتش کی زندگی میں ردِ عمل شروع ہوا اور طبیعت فقر و فاقہ کی طرف مائل ہوئی۔ ساری عمر توکل اور قناعت کی راہ سے قدم نہیں ہٹایا۔

آتش اُردو غزل کے بہت بڑے محسن ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں اس دور میں داخلی کیفیات اور سوز و گداز کو جگہ دی، جب کہ سارا لکھنؤ حسن کے خارجی لوازمات کے بیان اور صنائع بدائع پر مٹا ہوا تھا۔ ان کے یہاں کافی اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں اثر انگیزی اور صداقت شعری ہے۔

آتش کے کلام کی جملہ خوبیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ لکھنؤ اسکول کے ممتاز ترین غزل گو شاعر تھے۔ ان کا کلام دو دیوانوں میں شائع ہو چکا ہے۔

انیس۔ میر ببر علی (۱۸۰۲-۷۴ء)

میر انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ بسایا تو میر انیس بھی یہیں آ رہے۔ ان کے والد میر خلیق مرثیہ گوئی میں بڑا نام پیدا کر چکے تھے۔ انیس کے دادا میر حسن تھے جن کی مثنوی سحر البیان، آج تک مقبول خاص و عام ہے۔ انیس نے جب آنکھیں کھولیں تو لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا بہت رواج تھا۔ انیس نے اپنے والد کی جگہ لی اور مرزا دبیر کے حریف بزم ہوئے۔ انتزاع سلطنت کے بعد ان

لوگوں کو بھی باہر جانا پڑا۔ چنانچہ یہ لوگ عظیم آباد اور حیدر آباد وغیرہ گئے اور وہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔

انیسؔ کے کلام کو بے انتہا مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی۔ فصاحت تو انیس کے کلام پر ختم ہے۔ مناظر فطرت کا بیان کرنا ہو یا انسانی جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچنا ہو، وہ ہمیشہ واقعیت اور اصلیت کو مد نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محاکات میں تمام شعرائے متقدمین پر سبقت لے گئے ہیں۔ وہ الفاظ سے ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ مصور بھی قاصر ہو جائے۔

میر انیسؔ کا طرز بیان بہت موثر ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ان کا طرز بیان کہیں سادہ، کہیں رنگین اور کہیں پر زور ہوتا ہے۔ لیکن کہیں تصنع اور آورد نہیں ہوتا۔ انیسؔ کو زبان پر جو قدرت حاصل ہے وہ اُردو کے کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ انیسؔ الفاظ کے جوہری ہیں اور انھیں نگینے کی طرح جڑ سکتے ہیں۔

امیرؔ۔ امیر احمد مینائی (۱۸۲۸-۱۹۰۰ء)

امیرؔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور علمائے فرنگی محل سے حاصل کی۔ رواج زمانہ کے مطابق شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے اور اسیرؔ کا تلمذ اختیار کیا۔ انھیں کی وساطت سے نواب واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ لکھنؤ کی تباہی کے بعد انھوں نے رام پور کا رُخ کیا۔ جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور ۴۳ سال فراغت سے یہیں رہے۔ داغؔ کے بلانے پر حیدر آباد کا سفر کیا۔ لیکن یہ سفر راس نہ آیا۔ کچھ دن کی علالت کے بعد وہیں انتقال کیا۔

امیرؔ اپنے علم و فضل اور قابلیت کے لحاظ سے یکتائے روزگار تھے۔ ان کے کلام میں شوخی اور متانت کی عمدہ آمیزش ہے۔ صحت زبان، روزمرہ اور بندش

کی طرف خاص نظر رہتی ہے۔ تصوف کا اثر ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ قصیدے بھی اچھے کہے ہیں۔ ان میں جوش بیان بھی ہے اور تخئیل کی بلندی بھی۔

آرزوؔ۔ سید انور حسین

۱۸۷۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا۔ جلالؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ اُستاد کی توجہ اور کثرت مشق کی بدولت تھوڑے ہی دنوں میں اساتذہ میں شمار ہونے لگا۔

آرزوؔ، لکھنؤ اسکول کی اس شاعری کے یادگار تھے، جس پر رام پور کے زمانہ میں دہلی اسکول کا اثر پڑ چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے کلام میں خارجی لوازمات کے ساتھ ساتھ داخلی محاسن بھی پائے جاتے ہیں۔

آپ جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ متوالی جوگن، دل جلی، بیراگن اور شیرازۂ حُسن، آپ کے ڈرامے ہیں۔ غزل گوئی کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ زبان عموماً صاف اور شیریں ہے۔ کہیں کہیں رعایت لفظی، کلام میں آورد اور تصنّع پیدا کر دیتی ہے، مگر عموماً آپ کا کلام صاف، اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں شوخی، معاملہ بندی اور نوک جھونک بھی نظر آتی ہے۔ بعض بعض غزلوں میں دردانگیز یاس پایا جاتا ہے۔ یہ غالباً میرؔ کی تقلید کا اثر ہے۔

آرزوؔ نے خالص اُردو میں غزلیں کہنی شروع کیں۔ ان میں عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب کا دخل نہیں تھا۔ ایک زمانہ میں "خالص اُردو" کی خاصی دھوم دھام رہی۔ آخری عمر میں کراچی پہنچ کر سینما کے لیے گانے لکھنے لگے تھے۔ وہیں وفات پائی۔

آپ کے دو مجموعے مشہور ہیں۔ جہان آرزوؔ اور فغان آرزوؔ، ایک مجموعہ

"سریلی بانسری"، کے نام سے بھی چھپا تھا جس میں خالص اُردو میں لکھی ہوئی غزلیں ہیں۔

اصغرؔ۔ اصغر حسین گونڈوی (۱۸۸۴-۱۹۳۷ء)

اصلی وطن گورکھپور ہے مگر گونڈے میں اتنے عرصے قیام رہا کہ گونڈوی مشہور ہوگئے۔ اصغرؔ کی ابتدائی تعلیم معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی لیکن آپ نے ذاتی مطالعہ سے عربی و فارسی کی اچھی استعداد پیدا کرلی۔ یہی حال انگریزی کا تھا۔ دوسرے باکمال شعرا کی طرح اصغرؔ کو بھی شاعری کا شوق ابتدا سے تھا۔ آپ نے مستقل طور پر کسی سے استفادہ نہیں کیا۔

اصغرؔ صاحب کی طبیعت نہایت پرسکون، قانع اور نفاست پسند واقع ہوئی تھی اسی لیے وہ ایک محدود دائرہ خاص طبقے میں مشہور ہوئے، عوام سے کوئی تعلق نہیں پیدا کیا۔ الٰہ آباد میں انتقال ہوا جہاں وہ ہندوستانی اکاڈیمی میں مشیر ادبی کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

اصغرؔ نے بہت کم کہا ہے۔ لیکن جو کچھ کہا ہے وہ منتخب ہے۔ تمام اشعار ایک ہی رنگ اور سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ رجائیت، شگفتگی اور رنگینی اصغرؔ کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

اصغرؔ کے یہاں "جمالیات" کا ایک مستقل نظریہ ملتا ہے۔ اُردو کے کسی شاعر نے اس نظریے کو اتنی شدت اور وضاحت سے نظم نہیں کیا۔

ان کی تمام غزلوں میں ایسا اختصار، ایسی تراش خراش، ایسی شعریت اور رنگینی پائی جاتی ہے جس میں تقلید و تتبع کی جھلک کہیں نہیں پائی جاتی۔ اصغرؔ کا کلام دو مجموعوں میں شائع ہو چکا ہے "نشاط روح" اور "سرود زندگی"۔ یہ مجموعے بہت مختصر ہیں لیکن اس اختصار میں بلند ترین شاعری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

افسر۔ حامداللہ میرٹھی

محکمہ تعلیمات میں اُردو کے ایک قابل اُستاد کی حیثیت سے ادبی خدمات انجام دے کر چند سال ہوئے ملازمت سے سبک دوش ہو گئے ہیں۔

اب بھی سارا وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا ہے۔ ان کا شمار دورِ حاضر کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل اور اقبالؔ کے بعد اُردو میں کسی شاعر نے بچوں کے لیے اتنی نظمیں نہیں کہی ہیں۔

طرزِ ادا میں پختگی، سلاست اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ کلام کا ایک مجموعہ "جوئے رواں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

اخترؔ۔ اختر خاں شیرانی

ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے مگر لاہور میں ہوش سنبھالا۔ یہاں ان کے والد محمود خاں شیرانی اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ حافظ محمود خاں خود ایک مقتدر عالم تھے۔ اخترؔ کی زندگی، سرشاری اور بدمستی میں گزری۔ انھیں شاعرِ رومان کہا گیا ہے۔ انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ "انتقال کی خبر بھی سب سے پہلے لاہور ہی کے اخبارات میں شائع ہوگی"۔ یہ پیشین گوئی صحیح اتری اور انھوں نے ۱۹۴۸ء میں لاہور میں وفات پائی۔

اخترؔ کا اندازِ بیان رنگین، شگفتہ اور والہانہ ہوتا ہے۔ ان کی اکثر نظموں کا تکلمانہ اندازِ ادا کی دل کشی کو بہت بڑھا دیتا ہے۔

نظمیں عام طور سے مترنم اور شیریں تو بہت ہوتی ہیں مگر اُن میں فکر کی گہرائی کم ہوتی ہے۔ ان کی نظمیں، نوجوان طبقہ میں بہت مقبول ہوئیں۔

صبح بہار، نغمۂ حرم، طیور آوارہ، اختر ستان اور شہ نازان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

اختر انصاری

نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں میں اختر انصاری اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ وہ تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں افسانے بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ڈائری کے اوراق بھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔ پھر بھی اختر انصاری کو وہ شہرت حاصل نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی وجہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت اور احساس خودداری ہے جو انھیں کسی مخصوص حلقے سے وابستہ نہیں ہونے دیتی۔ مزاج کی انفرادیت ان کے کلام اور ادب میں بھی نمایاں ہے۔ قطعہ، اُردو کی ایک قدیم صنف ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے اس کا رواج بہت ہو گیا ہے قطعات نگاری کو فروغ دینے میں اختر انصاری کا خاص حصّہ ہے۔ آج سے تقریباً ۸-۱۰ سال پہلے آپ کے قطعات کا ایک مجموعہ "آبگینے" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

جذبات واحساسات کی مصوری اختر انصاری کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ طرز بیان کی لطافت اور زبان کی سادگی نے اس خصوصیت کو اور بھی اُجاگر کر دیا ہے۔ اسی خصوصیت نے ان کے کلام کو بے حد پُراثر بنا دیا ہے۔

احسان۔ احسان بن دانش

حفیظ کی طرح احسان بھی اس دور کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ شاعری کی بہ دولت ان کو شہرت بھی ملی اور حصول معاش کا ذریعہ بھی ہاتھ آیا۔ احسان ایک مزدور تھے عرصۂ دراز تک محنت مزدوری سے کسب معاش کرتے رہے۔ اس کے بعد کتابوں کی دوکان کھولی۔ ان حالات نے احسان کو مزدوروں کا شاعر بنا دیا۔

اب تک ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نوائے کارگر، آتش خاموش اور جادۂ نو خاص ہیں۔

جہاں تک نظم کی ٹکنیک کا تعلق ہے، احسان نے اقبال سے فیض حاصل کیا ہے۔ اکثر نظمیں اقبال کے انداز میں لکھی ہیں۔ تشبیہ اور استعارے اکثر اچھوتے اور دل کش ہوتے ہیں۔

اکبر۔ اکبر حسین الہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء)

سید اکبر حسین کے والدین مالی حیثیت سے خوش حال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکول میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیل دار ہوئے اور ترقی کر کے ۱۸۹۴ء میں جج ہو گئے۔ گورنمنٹ کی طرف سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں انتقال کیا۔ ان کا مجموعہ کلام کلیات اکبر کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

اکبر کی شاعری زبردست تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری سے ہمیں اس انتشار اور تصادم کا پتا چلتا ہے جو ہندوستان کے بدلے ہوئے سیاسی نظام اور مختلف مغربی اثرات نے ہماری معاشرتی زندگی میں پیدا کر دیا تھا۔

اکبر فطرتاً قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ انھیں سر سید اور حالی کا نظریہ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"، قبول نہ تھا۔ وہ شبلی کی طرح پرانے نظام کے حامی ہیں اور تنہا زمانے کی رو کے خلاف کھڑے ہو کر اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے کہ نئی تہذیب کی ترویج میں وہ تخریب کے آثار دیکھتے ہیں۔

اکبر بلند پرواز تخیل اور ذہن رسا کے مالک تھے۔ وہ طنزیات کے بادشاہ ہیں۔ اکبر نے طنز و ظرافت کے فن کو ترقی دے کر معراج کمال تک پہنچا دیا۔

ان کی طبیعت پر مذہب اور تصوف کا رنگ غالب تھا۔ شوخی، طنز و ظرافت، مضامین میں بوقلمونی، مختلف تراکیب اور متنوع اجزا، انگریزی الفاظ کا الٹ پھیر اور بے باکی ان کی شاعری کے خارجی محاسن ہیں۔

اقبالؔ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۵-۱۹۳۰ء)

سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے انگلستان گئے۔ وہاں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصے تک لندن یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ واپس آکر لاہور میں وکالت شروع کی۔

اقبالؔ دنیا کے ان گنے چنے خوش نصیب شاعروں میں سے تھے جن کو اپنی زندگی میں قبولیت عام اور غیر فانی شہرت حاصل ہوئی۔ اقبالؔ کی شاعری اور اُن کے فلسفہ حیات نے ہمارے خیالات اور ادب پر نہایت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

اقبالؔ کا شمار دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا کے تمام ممتاز فلاسفہ اور شعرا سے استفادہ کیا ہے مگر اس استفادہ میں تقلید کی صورت نہیں ہے۔ اقبال نے سب کے خیالات سے فائدہ اٹھایا ہے مگر یہ خیالات اقبال کے فلسفہ حیات میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ کہیں بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے۔

نکھری ہوئی زبان، سلیس انداز کلام اور شگفتہ اور رنگین تراکیب ان کے کلام کے خارجی محاسن ہیں۔ بعض نظمیں ساخت کے اعتبار سے بھی اُردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلند آہنگ نغمہ اقبالؔ کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ یہ وہ نغمہ ہے جو محض ترنم یا الفاظ کا دروبست نہیں ہے۔ بلکہ ایک گہری شخصیت کا بلند اظہار ہے۔

اقبالؔ، حالیؔ اور اکبرؔ کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ ان کا اردو کلام تین مجموعوں پر مشتمل ہے۔ بانگِ درا، بال جبرئیل اور ضرب کلیم۔ ان کے علاوہ ارمغان حجاز میں بھی ایک حصہ اردو کلام کا ہے۔ اقبالؔ صرف نظم لکھنے ہی میں منفرد نہیں ہیں۔ ان کی غزلیں بھی دور جدید کی جملہ خصوصیات کی حامل ہیں۔ ان میں تاثیر، روانی، تحیر، رنگینی، شگفتگی اور عزم سبھی کچھ موجود ہے۔ ان تمام عناصر نے ان کی بلند شخصیت سے مل کر ان کے کلام میں نغمہ اور فلسفیانہ بلند آہنگی پیدا کر دی ہے۔

امجدؔ۔ امجد حسین حیدرآبادی

جنوبی ہند کے جن شعرا نے شاعری میں نام پیدا کیا ان میں امجد حیدرآبادی ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

انھیں شعر و سخن کا فطری ذوق ملا تھا اسی لئے ان کے کلام میں روانی، بے ساختگی اور پختگی کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی بہت ہے۔ ان کی نظم "دعائے یتیم" بہت مشہور ہوئی۔

امجدؔ کا حقیقی کارنامہ ان کی رباعیاں ہیں جن کی بدولت انھیں اردو ادب میں بقائے دوام کا درجہ ملا۔

رباعیوں میں مذہبی رنگ ہے۔ ہر رباعی کسی قرآنی آیت یا حدیث کی تعبیر ہے، مگر پڑھنے سے ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ خشک مضامین نظم کیے جا رہے ہیں۔ ان میں بھرپور شعریت ہے۔ ان رباعیوں نے ہر خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ امجدؔ کی رباعیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کی تفسیر ہیں اور بلحاظ ادب اظہار خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔

بےنظیر سید محمد نظیر شاہ وارثی

کڑا مانک پور ضلع الہ آباد میں ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کے فاضل تھے۔
انگریزی زبان سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے اور بڑے دین دار عالم تھے۔

انیسویں صدی کے آخری نصف میں غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کو بھی فروغ ہوا۔ حالی اور آزاد نے جو چراغ روشن کیا تھا اس کی لو تیز ہوتی گئی۔ نظم نگاری نے اپنا نقطۂ عروج اقبال اور جوش کی شاعری میں پایا۔ ان کے علاوہ بھی کئی شعرا ایسے ہیں جنھوں نے نظم نگاری کو ترقی دی۔ ایسے ہی شعرا میں بےنظیر شاہ بھی ہیں۔ آپ صفی، سیماب، برق، سرور اور سلیم وغیرہ کے ہم عصر تھے اور قدرتی مناظر پر نظم لکھنے میں خاصی قدرت رکھتے تھے۔
آپ کے کلام کا کافی حصہ دوران سفر میں گم ہو گیا مگر جو حصہ محفوظ ہے وہ بھی کافی وقیع ہے۔
غزل میں وحید الہ آبادی اور قصیدہ و مثنوی میں امیر لکھنوی سے اصلاح لی۔
آپ کا کلام بہت بلند پایہ تو نہیں ہے مگر اس کی سلاست، صفائی، روانی اور دل کشی پڑھنے والوں کو اپنی طرف ضرور متوجہ کر لیتی ہے۔ طلبہ کے مطالعے کے لئے بالخصوص آپ کی نظمیں بہت موزوں ہیں۔

برقؔ۔ جوالا پرشاد (۱۸۶۲-۱۹۱۲ء)

سیتا پور میں پیدا ہوئے۔ قانون کی ڈگری حاصل کرکے وکالت کی، بعد میں منصف اور جج ہوئے۔ طبیعت نہایت تیز اور رسا پائی تھی۔ ایک ممتاز شاعر اور زبردست نقاد تھے۔

کلام میں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ مقامی رنگ کافی نمایاں رہتا ہے۔ مختلف عنوانات پر نہایت کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ آسان، عام فہم اور سلیس زبان پسند کرتے تھے۔ آپ کی نظم، مثنوی بہار، اعلیٰ درجے کی ہے۔ سر سید کو یہ نظم بہت پسند تھی۔ اس نظم کا ایک انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔

جلالؔ۔ سید ضامن علی لکھنوی (۱۸۳۲-۱۹۰۹ء)

حکیم اصغر علی کے بیٹے تھے۔ فارسی و عربی اور طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی لکھنؤ ان دنوں شعر و سخن کا مرکز تھا۔ جلالؔ بھی وہاں کی معرکہ آرائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ غدر کے بعد مطب قائم کیا۔ پھر رام پور پہنچے اور وہاں بیس سال تک عزت و احترام سے رہے۔ کچھ عرصے تک ریاست منگرول سے بھی تعلق رہا مگر لکھنؤ میں آ کر پیوند خاک ہوئے۔

وہ ایک باکمال استاد تھے۔ شاعری میں ناسخؔ کی تقلید کی اور زبان کی درستی اور صحت کا ہمیشہ خیال رہا۔ جلالؔ نے قصائد بہت عمدہ لکھے ہیں۔ شکوہ الفاظ، رنگینی، معنی آفرینی اور تشبیب میں خوش گوار تنوع، ان کے قصائد کی خصوصیات ہیں۔ چار دیوان اور کئی متفرق تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

جوشؔ۔ شبیر حسن خاں

جوشؔ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں۔ قصبہ کنول ہار میں پیدا ہوئے۔ جوشؔ لڑکپن ہی میں سایہ پدری سے محروم ہوگئے جس کی وجہ سے تعلیم و تربیت پرخاطرخواہ توجہ نہ ہوسکی۔ شعر و سخن کا شوق شروع ہی سے تھا۔ چنانچہ اپنی خداداد ذہانت اور مذاق سلیم کی بہ دولت عہد حاضر کے صاحب طرز شعرا میں شمار کیے جانے لگے۔ مختلف حیثیتوں سے ادبی خدمات انجام دیتے رہے مگر کسی مقام پر پابند ہوکر نہیں رہے۔ جوشؔ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ آپ کی نظمیں رنگینی اور ندرت تخئیل کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ حسین تراکیب، اچھوتی اور خوب صورت تشبیہات آپ کے کلام میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ آپ کی نظمیں جذبات سے مملو ہوتی ہیں اور کلام میں بلا کا زور ہوتا ہے۔ تصویر کشی خواہ وہ خارجی مناظر کی ہو یا داخلی کیفیات کی، نہایت کامیابی سے کرتے ہیں اور بہ کثرت نظمیں ایسی ہیں جو آج کل کے سیاسی انتشار کی آئینہ دار ہیں۔ غزلیں اور رباعیاں بھی بہت اچھی کہی ہیں۔ ان میں بھی انفرادی رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ شعلہ و شبنم، نقش و نگار، حرف و حکایت، فکر و نشاط، جنون و حکمت وغیرہ۔

جگرؔ۔ علی سکندر مرادآبادی

مرادآباد آپ کا وطن ہے مگر اب گونڈے میں مقیم ہیں۔ جگر صاحب کو گونڈے سے نسبت خاص ہے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں جگر صاحب، اصغرؔ گونڈوی سے متاثر ہوئے۔ اصغر مرحوم گونڈے میں چشمہ کا کاروبار کرتے تھے۔ جگر صاحب چشموں

کی ایجنسی کیا کرتے تھے۔ اس کاروباری تعلق نے گہرا ادبی تعلق بھی پیدا کر دیا اور جگر صاحب کو اصغر مرحوم سے بے انتہا عقیدت ہو گئی۔ اس عقیدت کے گہرے اثرات جگر کے دیوان "شعلۂ طور" میں نظر آتے ہیں۔

جگر کی استعداد علمی معمولی ہے مگر مذاق شعری ورثے میں ملا تھا۔ ابتدائی اصلاح اپنے والد اور پھر داغ اور تسلیم سے لی۔ ان اساتذہ کی اصلاح کا اثر جگر کے پہلے دور کی شاعری میں نمایاں ہے۔

اصغر مرحوم سے وابستگی کے بعد جگر کی شاعری کا نیا دور شروع ہوا۔ اس دور کی غزلوں میں دل کشی، رنگینی، سرشاری، کیف، سرمستی اور بے خودی پائی جاتی ہے۔ اصغر کے اثر سے حقائق و معارف کی بھی چاشنی کافی نظر آتی ہے۔ دراصل اسی دور کی غزلوں نے جگر کو جگر بنایا۔ جگر صاحب الفاظ کے استعمال میں محتاط نہیں ہیں۔ تاہم ان کے کلام میں ترنم اور حسن کاری بے حد ملتی ہے۔ اُردو کے کم شاعروں نے اپنے دور کی شاعری پر جگر کے برابر اثر ڈالا ہے۔ "شعلۂ طور" اور "آتش گل" ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

جذبی ۔ معین احسن

جذبی ایک نوجوان شاعر ہیں۔ ان کی زندگی انتہائی پرپیچ راہوں سے گذری ہے اسی لیے ان کی طبیعت میں یاس انگیزی اور احساس ناکامی بہت ہے۔ اس وقت علی گڑھ میں اُردو کے استاد ہیں۔ شعر و سخن کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ اسی شوق نے انھیں بگاڑا بھی اور بنایا بھی۔ شاعری کے بڑھے ہوئے شوق نے انھیں سنجیدہ مطالعے کا موقع نہ دیا مگر اسی کی بدولت آج ان کو شہرت حاصل ہوئی۔ غزل گو شعرا میں ان کی حیثیت مسلم ہو چکی ہے۔ خستگی، یاس انگیزی، روانی اور ترنم

ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ" فروزاں ،، کے نام سے چھپ چکا ہے۔

چکبست۔ پنڈت برج نرائن لکھنوی

۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر کے وہیں وکالت شروع کر دی اور عین اس وقت جب کہ ان کی شاعری شباب پر تھی ۴۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ملک اور ادب کو ان کی ذات سے بہت سی توقعات تھیں مگر ان سب پر پانی پھر گیا۔

جدید ادب میں چکبست ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں ان کا کلام "صبح وطن،، کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مجموعہ بہت مختصر ہے۔ مگر کلام کی خوبی اور خیالات کی پاکیزگی ان کی شہرت اور بقا کی ضامن ہے۔ "صبح وطن،، چکبست کے رجحانات کا صحیح پتا دیتا ہے کیوں کہ جذبۂ قومی ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ ایک دردمند دل لے کر آئے اور ہمیشہ وطنیت، قومیت، باہمی ہمدردی اور آزادی کے نغمے سنا سنا کر قوم کو جد و جہد اور عمل کی ترغیب دیتے رہے۔

نظموں کے علاوہ چکبست غزل میں بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بندش کی چستی، صحت الفاظ، پختگی اور سلاست کی وہ تمام خصوصیات نظر آتی ہیں جو پرانے اساتذہ کا سرمایۂ کلام تھیں۔

حسن۔ میر غلام حسن (۱۷۳۶-۱۸۸۶ء)

میر غلام حسین ضاحک کے لڑکے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب دہلی کی سیاسی فضا خراب ہوئی اور دہلی کے اہل فضل و کمال نے اسے خیر باد کہا تو میر ضاحک بھی

فیض آباد تشریف لائے۔ نواب سرفراز جنگ کی خدمت میں پہنچ کر عزت و توقیر سے سرفراز ہوئے۔ بعد میں نواب آصف الدولہ کے ہم راہ لکھنؤ آئے۔ میر حسن پابند وضع، خوش اخلاق اور خوش مزاج شخص تھے۔

میر حسن نے ذوق شاعری ورثے میں پایا تھا۔ ویسے تو جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر مثنوی میں بالخصوص شہرت حاصل کر لی۔ مثنوی ''سحر البیان'' آپ کا شاہ کار ہے۔ اس کا شمار اُردو کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ مثنوی کا انداز بیان انتہائی دل کش برجستہ اور دل آویز ہے۔ زبان کی روانی، فصاحت، پاکیزگی اور ستھرا پن قابل داد ہے۔

حالیؔ۔ خواجہ الطاف حسین (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کم عمری میں والد کا انتقال ہو گیا اور انہیں ہوش سنبھالتے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی پریشانیوں سے عاجز آ کر حالیؔ دہلی پہنچے۔ وہاں غالبؔ سے نیاز حاصل ہوا اور انہیں سے فیض تلمذ حاصل کیا۔ اسی زمانے میں نواب شیفتہؔ سے ملاقات ہوئی اور ان کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالیؔ لاہور گئے اور پنجاب بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔ لاہور سے لوٹ کر مدرس ہوئے مگر یہ سلسلہ انہیں پسند نہ آیا۔ اسی اثنا میں سرسید کی مردم شناس نگاہیں حالیؔ پر پڑیں۔ سرسید نے ان کو حیدرآباد سے وظیفہ دلوایا اور وہ بقیہ زندگی پانی پت میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں بسر کرنے لگے۔

حالیؔ صرف نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے اُردو ادب میں ممتاز نہیں ہیں۔ وہ اُردو نظم کے بہت بڑے محسن ہیں۔ وہ جدید اُردو شاعری کے پیش رو تھے۔ ویسے تو

ان کی غزلوں میں بھی بڑی دل کشی، رنگینی اور جاذبیت ہے مگر ان کی شہرت زیادہ تر نظم نگاری کے بانی کی حیثیت سے ہے۔ کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں حالی اور آزاد نے لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جہاں سے جدید شاعری کا باب کھلا۔ اس مشاعرہ میں حالی اور آزاد نے اپنی نظمیں پڑھنا شروع کیں۔

حالی کا کلام غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی اور مسدس پر مشتمل ہے۔ حالی کے مسدس مدو جزر اسلام، نے غیر فانی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اس طویل نظم میں حالی نے مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب نظم کئے ہیں۔

حسرت۔ سید فضل الحسن

حسرت موہانی ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اُناؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور اساتذہ قدیم کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام میں حد درجہ پختگی اور قدرت بیان نظر آتی ہے۔ ان کے مجموعے میں جملہ اساتذہ کے رنگ میں غزلیں ہیں۔

مولانا کی زندگی ادبی خدمات اور سیاسی ہنگاموں سے عبارت تھی۔ سیاسی مشاغل کی وجہ سے اکثر "چکی" کی مشقت بھی جھیلنا پڑی، مگر "چکی" کی مشقت میں بھی مشق سخن جاری رہی۔

حسرت دور حاضر کے ممتاز ترین غزل گو شاعر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اُردو غزل میں ایک نئی روح پھونکی جس وقت اردو غزل جسد بے روح ہو چکی تھی اور اس سے عام بیزاری کا اظہار کیا جا رہا تھا حسرت نے اس میں نیا رنگ تغزل شامل کیا اور اس کو از سر نو مقبول کیا۔

تغزل مولانا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ طرز بیان میں بے حد شگفتگی، سادگی

اور ندرت ہے۔ عشقیہ جذبات اور حیات کی تصویر کشی اور واردات کی نقاشی جتنے کام یاب طریقے سے حسرت کے یہاں ملتی ہے اُردو کے کم شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ مولانا کا انداز بیان کافی شوخ ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ شوخی ذرا گہری بھی ہو جاتی ہے۔

حسرت کا سارا کلام مجموعے کی صورت میں ”کلیات حسرت“ کے نام سے انتظامی پریس حیدر آباد دکن سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا نے ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

حفیظ۔ محمد حفیظ جالندھری

دور حاضر کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ ان کی ہلکی پھلکی عشقیہ اور رومانی نظمیں نوجوانوں میں بالخصوص بہت مقبول ہیں۔ پڑھنے کا انداز مسحور کن ہے۔ اسی لیے شاعری میں بہت مقبول ہوئے۔ جگر کی طرح آواز نہایت دل کش پائی ہے مشاعرہ لوٹ لینے کا خاص ملکہ ہے۔

حفیظ کی غزلیں اچھی نہیں ہیں۔ نظمیں البتہ اچھی کہتے ہیں ”شاہ نامۂ اسلام“ میں اسلامی تاریخ کو انھوں نے چار جلدوں میں نظم کیا ہے۔ اسی کی بہ دولت انھیں بے حد شہرت حاصل ہوئی۔

حفیظ نے ہلکے پھلکے گیت بھی لکھے ہیں۔ ان میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی، لیکن عوام کے مذاق کو پسند آتے ہیں۔ مناظر فطرت پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بعض بعض بہت عمدہ ہیں حفیظ نے اُردو نظم کے اسالیب کو وسعت دینے کی کام یاب کوششیں کی ہیں۔ وہ نظم کی نئی نئی شکل پیدا کرنے کے استاد ہیں۔ ان میں بعض شکلیں دل آویز ہوتی ہیں۔

درد۔ خواجہ میر درد

۱۷۰۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاعری اور تصوف ورثے میں ملا۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کا شوق ہوا اور اپنے والد سے اصلاح لینی شروع کی۔

بائیس سال کی عمر میں والدِ بزرگوار کے سجادے کو رونق بخشی۔ خواجہ صاحب کو مذہبی تصنیف و تالیف سے بڑی دلچسپی تھی۔

مزاج میں آزادی، قناعت پسندی اور استغنا تھا۔ دلی کی بربادی پر تمام اہلِ فن اور اہلِ کمال نے دوسری جگہوں کا رخ کیا مگر دردؔ اپنے گوشۂ عافیت سے نہ ہلے مزاج کی یہ خصوصیات ان کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔

دردؔ غزل گوئی میں ایک انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں صاف ستھری، رطب و یابس سے پاک اور سادہ مگر شگفتہ اور مترنم ہوتی ہیں۔ اختصار ان غزلوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اکثر غزلیں چھوٹی بحر میں لکھی ہیں اور وہ بہت کامیاب ہیں۔ ان کے لہجے میں حد درجہ متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ تصوف کا رنگ شاعری میں غالب ہے۔ دیوانِ دردؔ آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔

دبیرؔ۔ مرزا سلامت علی (۱۸۰۳ء-۱۸۷۵ء)

مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے۔ باپ کے ساتھ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تحصیلِ علم میں مصروف ہوگئے یہاں تک کہ علمی استعداد فاضلانہ حد تک پہنچ گئی۔ شعر و سخن کا چسکا بچپن ہی سے لگ گیا۔ میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد ہوئے اور یہاں تک نام پیدا کیا کہ اُستاد سے زیادہ شہرت ہوگئی۔

مرزا دبیرؔ نے صرف اس ورثے پر قناعت نہیں کی جو استاد کے ذریعے ان تک پہنچا۔ انھوں نے اس ورثے کو وسیع کیا۔ جب ان کی شہرت بڑھی تو دربار اودھ نے بھی سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا۔ مرزا صاحب نے کم از کم تین ہزار مرثیے کہے ہوں گے۔ رباعی، سلام اور نوحے ان کے علاوہ ہیں۔ شکوہِ الفاظ اور جوشِ بیان ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام میں اکثر جگہ آورد اور تصنع نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغلق اور ثقیل الفاظ اکثر نظم کرتے ہیں۔ انیسؔ سے ان کی معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

ذوقؔ - شیخ محمد ابراہیم (سنہ ۱۸۵۴-۱۸۸۷ء)

دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد رمضان نہایت غریب، سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول سے حاصل کی اور شاہ نصیر اور بے قرار سے شعر میں اصلاح لی۔

بے قرار کی وساطت سے قلعہ تک رسائی ہوئی۔ وہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ شہزادگان اور خود شہنشاہ ظفرؔ کے کلام میں اصلاح دینے لگے۔ بہت سے خطابات اور مناصب عطا ہوئے۔

ذوقؔ قصیدہ گوئی میں بہت ممتاز ہوئے۔ سوداؔ کے بعد اس صنف سخن میں آپ ہی کا رتبہ ہے۔ الفاظ کی چستی اور ندرت بیان کی رنگینی اور تخئیل کی گرم جوشی آپ کے قصائد کی خصوصیات ہیں۔ دیوان ذوقؔ آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔

غزل گوئی آپ کا کوئی امتیازی رنگ نہیں ہے مگر خیالات نہایت متین اور سنجیدہ ہیں۔ کلام میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال بہت کرتے ہیں۔

رواںؔ - چودھری جگت موہن لال (سنہ ۱۸۸۹-۱۹۳۴ء)

رواںؔ اناؤ میں پیدا ہوئے۔ نہایت ذہین، طباع اور یار باش واقع ہوئے تھے۔ ایم۔اے۔ ایل۔ ایل بی ہونے کے بعد اناؤ میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت اور ذہانت کی بدولت کافی مشہور ہو گئے۔

شعر و سخن کا ذوق ابتدا ہی سے تھا۔ عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور اُستاد کی توجہ اور طبعی رجحان کے زیر اثر بہت جلد مشاقی بہم پہنچالی۔ رواں کی عمر نے وفا نہ کی۔ ۵۴ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ رواں کی وجہ سے اناؤ کی علمی و ادبی فضامیں کافی چہل پہل تھی۔ یہ چہل پہل ان کی ذات پر ختم ہو گئی۔

رواں زود گو بھی تھے اور پرگو بھی۔ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام میں سلاست، چستی، متانت اور گہرائی ملتی ہے۔ رواں نے رباعیات کی صنف میں اپنے لیے ایک ممتاز و مقتدر درجہ حاصل کر لیا ہے۔ وہ رباعیات میں زندگی کے گہرے مسائل نظم کرتے ہیں۔ بیان میں بلا کی اثر آفرینی ہوتی ہے۔ آپ کا مجموعہ کلام "رُوحِ رواں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

سودا۔ مرزا محمد رفیع (۱۷۱۳-۱۷۸۱ء)

والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا جو تجارت کے سلسلے سے کابل سے ہندوستان آئے۔ مرزا دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ شاہ حاتم کا تلمذ اختیار کیا اور استاد سے آگے نکل گئے۔

شاہ عالم ان کے شاگرد ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد حالات نے ایسی صورت اختیار کی کہ دربار سے قطع تعلق کر لیا۔ جب دہلی کی حالت خراب ہوئی تو سودا نے بھی دلی کو خیر باد کہا اور فرخ آباد میں نواب احمد خاں بنگش کے مہمان ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد سودا لکھنؤ پہنچے۔ جہاں نواب شجاع الدولہ اور لکھنؤ والوں نے مرزا کی بڑی قدر و منزلت کی۔ مرزا نے اپنی حیات کے آخری ایام فارغ البالی سے بسر کیے۔

مرزا نے رسا اور معنی آفریں طبیعت پائی تھی۔ زبان اور اظہار خیال پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے جملہ اصناف سخن پر انتہائی کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے مگر

قصیدے اور ہجو گوئی میں آج تک ان کا کوئی مدمقابل نہیں گزرا۔

سودا طبعاً زندہ دل، خوش مزاج اور طباع واقع ہوئے تھے۔ اس طباعی اور خوش مزاجی کا اثر ان کے کلام میں ہر جگہ اور بالخصوص قصائد میں بہت نمایاں ہے۔

سودا نے مرثیے کے دامن کو وسعت دی اور اُسے مذہبی دائرے سے نکال کر اس کی ادبی حیثیت متعین کی۔ ان کا کلام "کلیات سودا" کے نام سے دو حصّوں میں چھپ چکا ہے۔

سلیم مولوی وحید الدین (۱۸۶۷ء - ۱۹۲۸ء)

پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی فرید الدین صاحب بو علی شاہ قلندر کے مجاور اور مولانا سید غلام غوث علی شاہ کے مرید تھے۔ سلیم نے مختلف مقامات پر اور مستند اساتذہ سے عربی و فارسی اور علوم متداولہ میں دست گاہ حاصل کی۔ تلاش معاش کے سلسلے میں مختلف مقامات کی سیر کی اور مختلف قسم کی ادبی خدمات انجام دیں۔ بالآخر سرکار عالیہ نظام سے بلاوا آیا۔ سلیم وہاں پہنچے اور معزز عہدوں پر فائز ہوئے اور آخری ایام بڑے آرام سے گذرے۔ مولانا نہایت خوش دل، یار باش اور صاف گو آدمی تھے۔ وہ اُردو زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وضع اصطلاحات پر خاص قدرت رکھتے تھے۔

سلیم صرف اُردو نثر کے نہیں بلکہ نظم کے بھی اُستاد تھے۔ ذوق سخن نہایت پاکیزہ اور متین تھا۔ اشعار میں بلا کی رنگینی، شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بعض اچھوتے اور بالکل نئے عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اقبال کی طرح سلیم کے یہاں بھی ذوق عمل، خودداری اور بلند کرداری کی دعوت ملتی ہے۔ نظموں کے علاوہ ان کے قطعات بھی بہت عمدہ ہیں۔

سرورؔ۔ منشی درگا سہائے (۱۸۷۳-۱۹۱۰ء)

پہلے وحشتؔ بعد میں سرورؔ تخلص کیا۔ جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ دستور کے مطابق اُردو فارسی کی تعلیم حاصل کی اور طبابت کرنے لگے۔ انیسویں صدی کے آخر سے آپ کی شہرت شروع ہوئی اور مختلف رسائل میں آپ کا کلام چھپنے لگا۔ سرورؔ نہایت خوش اخلاق، نیک مزاج اور مہمان نواز تھے۔

سرورؔ اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ حالیؔ اور اسمٰعیل میرٹھی کی طرح آپ نے بھی نیچرل شاعری پر طبع آزمائی کی اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ مناظر فطرت کی مصوری اور جوش جذبات کی رنگینی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ مبالغہ آمیزی سے کلام بالکل پاک ہے۔ تشبیہ واستعارے کی دل آویزی اور تراکیب کی دلکشی حسن بیان کو دوبالا کرتی ہے۔

سرورؔ کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں "خم خانہ سرور" اور "جام سرور"۔

سیمابؔ۔ سید عاشق حسین اکبر آبادی (۱۸۸۰-۱۹۵۲ء)

آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے مگر لکھنے پڑھنے کا فطری ذوق تھا اس کی بدولت وہ ایک باکمال اُستاد بن گئے۔

شروع میں قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔ دھیرے دھیرے نظم نگاری کی طرف رجحان ہوا۔ نظم میں اعلیٰ خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کے حامی تھے فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پر زیادہ نظر رہتی تھی۔ مگر ان کی شاعری میں کیف وسپردگی کم ہے۔ بیان کی پختگی، اور عروض کی صحت ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

"سازِ آہنگ" "کارِ امروز" اور "کلیم عجم" آپ کے کلام کے مجموعے ہیں۔

شاؔد۔ سید علی محمد عظیم آبادی (۱۸۴۷ء-۱۹۲۹ء)

شاؔد نے زمانہ کے مذاق کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم مولویوں سے حاصل کی شاعری میں کئی اُستادوں سے اصلاح لی مگر آخر میں سید شاہ الفت حسین فریاؔد کے شاگرد ہوئے جو خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ آپ نے ساری عمر زبان اور ادب کی خدمت کی اور منجملہ ایک ضخیم دیوان کے کئی ایک تصانیف یادگار چھوڑیں۔

شاؔد نے اُردو کے اکثر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر مرثیہ اور غزل میں آپ بہت کامیاب ہوئے۔

شاؔد غزل کی دنیا میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں درؔد کا تصوف بھی ہے اور غاؔلب کی بلند نظری بھی۔ آتؔش کی بے نیازی اور والہانہ پن بھی ہے اور میؔر کی یاس انگیزی بھی۔ ان تمام اثرات نے مل کر شاؔد کے رنگ میں بلا کی شگفتگی اور پُرکاری پیدا کر دی ہے۔ ان کو روزمرّہ اور عام فہم الفاظ کے استعمال پر بھی پوری قدرت تھی۔ آپ کا کلام "نغمۂ الہام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

شبلؔی۔ علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۹ء)

بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل تھے۔ تحصیل علم کی غرض سے مختلف مقامات پر گئے اور اپنے زمانے کے مستند علما سے عربی، فارسی، معقولات، فقہ، حدیث اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔

۱۸۹۳ء میں سرسیّد سے ملاقات ہوئی۔ سرسیّد ان کی علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں علی گڑھ میں عربی و فارسی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ یہاں شبلؔی کی ملاقات مشہور مستشرق پروفیسر آرنالڈ سے ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں آپ نے آرنالڈ کے ساتھ بلاد اسلامیہ کی

سیاحت کی۔ سرسید کے انتقال کے بعد شبلی علی گڈھ چھوڑ کر حیدر آباد گئے اور وہاں علوم و فنون کے ناظم کے عہدے پر مامور ہوئے۔ حیدر آباد میں چار سال رہ کر لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلما کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ ۱۹۱۳ء میں اعظم گڈھ واپس گئے اور وہاں دار المصنفین کی بنیاد ڈالی۔

ہر چند کہ شبلی کی زیادہ تر تصنیف نثر میں ہیں لیکن وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے شاعری کا شوق حج سے واپسی پر پیدا ہوا تھا۔ اعظم گڈھ کے مشاعروں میں نہایت دل چسپی سے حصّہ لیا کرتے تھے۔ اُردو میں تاریخی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی عنوانات پر قطعات اور نظمیں ملتی ہیں۔

ان میں صبح اُمید، مساوات اسلام، عہد فاروقی کے عدل کا نمونہ، عدل جہاں گیری بہت مشہور رہیں۔

نثر کی طرح شبلی کی نظم میں بھی انتہائی پاکیزگی، شگفتگی اور ستھراپن پایا جاتا ہے۔

شوق۔ نواب مرزا تصدق حسین خاں

نواب مرزا کے نام سے مشہور ہوئے۔ خاص لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ اسکول کی تمام خصوصیات آپ کے کلام میں موجود ہیں۔

نواب مرزا نے بہت سی مثنویاں لکھیں اور انھیں سے ان کو شہرت ملی۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، سلیس اور شگفتہ طرز بیان اور جذبات کشی آپ کی مثنویوں کی خصوصیات ہیں۔ جذبات عشق کی خوب خوب تصویریں کھینچتے ہیں۔ یہ تصویریں اکثر عریاں بھی ہو جاتی ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ زہر عشق آپ کی بہت مشہور مثنوی ہے۔

صفی۔ مولانا سید علی نقی لکھنوی

۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا سید فضل حسین شاہ زادہ سلیمان قدر

بہادر مرحوم کے معتمد تھے۔مولانا صفی کے پر دادا دہلی سے فیض آباد اور وہاں سے لکھنؤ تشریف لائے اور دربار شاہی میں مختلف عہدوں پر سرفراز ہوئے۔

مولانا نے عربی و فارسی کی عمدہ تعلیم حاصل کی اور پھر انٹرنس کا امتحان پاس کر کے اودھ کے محکمۂ دیوانی میں ملازم ہو گئے۔پنشن لے کر سارا وقت علمی و ادبی مشاغل میں بسر کیا۔

مولانا کو ذوق سخن بچپن ہی سے تھا۔وہ کسی استاد کے حلقۂ تلامذہ میں داخل نہیں ہوئے۔فطری ذوق اور طبعی مناسبت کو اپنا رہ بر بنایا اور بہت جلد شاعری میں کامل دست گاہ حاصل کر لی۔جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن قومی و تاریخی نظمیں اور اخلاقی مثنویاں بالخصوص زیادہ مشہور ہیں۔آپ کی نظموں نے شیعہ طبقے کو بالخصوص بہت متاثر کیا اور اسی وجہ سے شیعہ کانفرنس کی طرف سے آپ کو "لسان القوم" کا خطاب ملا۔مولانا نے ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔

ظریف۔سید مقبول حسین (۱۸۷۰-۱۹۳۷ء)

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔طبیعت میں شوخی و بے باکی بچپن سے تھی۔ظریف کی شاعری اکبر کی شاعری کی طرح اصلاحی مقصد رکھتی ہے۔ان کے یہاں طنز کی وہ گہرائی تو نہیں ملتی جو اکبر کے یہاں نظر آتی ہے مگر ظرافت میں وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ظرافت کی آڑ میں وہ ادبی اور سماجی خرابیوں پر گہری چوٹیں بھی کر جاتے ہیں۔بیگماتی زبان کے استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔

وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے ظریف شاعر تھے۔ان کا مجموعۂ کلام دیوانجی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

عزیز۔مرزا محمد ہادی لکھنوی (۱۸۸۲-۱۹۳۰ء)

باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا۔حصول علم کا فطری شوق تھا اس لیے

آخر عمر تک مطالعہ اور کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا۔ عزیز کی قادر الکلامی اور فضیلت مسلم تھی۔ پہلے حضرت صفی لکھنوی سے استفادۂ سخن کیا مگر طبعی ذوق اور کثرت مشق سے بہت جلد مرتبہ استادی حاصل کر لیا۔

اس زمانے میں غزل گوئی سے تو ایک طرف بے زاری پھیل رہی تھی، دوسری طرف کچھ اساتذہ اس میں نیا آب و رنگ پیدا کر رہے تھے۔ عزیز آخری طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

عزیز کی غزلوں میں دورِ جدید کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ ہر چند کہ ان کے یہاں لکھنؤ اسکول کے اثر سے موت، نوحہ، ماتم، کفن اور شہرِ خموشاں کا اکثر ذکر آجاتا ہے مگر اس ذکر کی وہ کثرت نہیں ہے جو کہ لکھنوی شعرا میں بالعموم پائی جاتی تھی۔ تغزل ان کے غزلوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان میں سوز و گداز، سادگی، خیال آفرینی اور کیف و ترنم سبھی کچھ ہے۔ ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔

عزیز نے قصیدے میں بھی ایک امتیازی حیثیت پیدا کر لی ہے۔ انھوں نے قصیدہ نگاری کی جملہ خصوصیات مثلاً شکوہِ الفاظ، تسلسل، علوئے تخیل اور ندرتِ بیان کو سامنے رکھ کر اس میں نیا رخ پیدا کرنا چاہا ہے۔ ان کا دیوان "گل کدہ" بہت مقبول ہوا۔

علی سردار جعفری

بلرام پور ضلع گونڈہ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم علی گڈھ اور لکھنؤ یونی ورسٹی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے نہایت ہونہار، ذہین اور طباع تھے۔ سردار جعفری طالب علمی کے زمانے ہی سے سیاسی ہنگاموں میں شامل ہوئے۔ اس کا گہرا اثر ان کے مذاق شعر و ادب پر پڑا۔ کچھ دنوں بعد وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے روح رواں بن گئے۔

ان کی ذہنی نشو و نما میں جو بلندی اور مطالعے کی گہرائی ملتی ہے، وہ ان کے ہم عصروں میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں نعرہ بازی بھی نظر آتی ہے مگر ایسی نظموں

کی کمی نہیں ہے جن میں ایک خاص گہرائی اور دل کشی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں میں بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ "پرواز" اور "نئی دنیا کو سلام" ان کے کلام کے مشہور مجموعے ہیں۔

غالب مرزا اسد اللہ خاں (۱۷۹۶-۱۸۶۶ء)

آگرہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب ایبک ترکمانوں سے ملتا تھا۔ ان کے والد عبد اللہ بیگ فوج میں ملازم تھے اور الور کی کسی لڑائی میں مارے گئے۔ مرزا اس وقت صرف پانچ برس کے تھے چچا نے پرورش کی۔ شادی کے بعد آگرہ چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ مرزا کی آمدنی کے ذرائع غیر مستقل تھے سرکار انگریزی سے ان کو جو پنشن ملتی تھی بند ہوگئی اور باوجود ان کی متواتر کوششوں کے پھر جاری نہ ہوئی۔ البتہ دہلی، رام پور، اور اودھ سے ان کو روپئے ملتے رہے مگر اس میں بھی طرح طرح کی دشواریاں لاحق ہوتی رہیں۔ غالب کے خطوط اور اشعار میں اکثر جگہ اس تلخ حقیقت کا اظہار ملتا ہے۔

غالب کی طبیعت کا عام رجحان تقلید سے گریز اور مشکل پسندی کی طرف تھا۔ ابتدائی کلام میں فارسی شعرا بیدل، اور نظیری کے طرز کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ آخر زمانے میں میر کا رنگ اختیار کیا اور چھوٹی بحروں میں صاف اور سہل زبان میں غزلیں لکھیں۔ یہ غزلیں سہل ممتنع کی نادر مثالیں ہیں۔ ان کے کلام میں ہمیں ایک ایسی رفعت، ایک ایسا بلند آہنگ نغمہ ملتا ہے جن کی مثال سوا اقبال کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

مرزا کے کلام میں تغزل کے ساتھ ساتھ فلسفہ و تصوف کی آمیزش ہے۔ ان کی تخئیل بہت بلند تھی اور عام طور سے بلند افکار کو روش عام سے ہٹ کر نظم کرنے کی کوشش کرتے تھے شوخی، ندرت خیال، شگفتگی، خوب صورت الفاظ اور لطیف تراکیب کا مناسب استعمال، گہرائی اور گیرائی ان کے کلام کے محاسن ہیں۔

وہ اُردو نثر میں بھی صاحب طرز کی حیثیت رکھتے تھے۔ نثر میں غالب کی عظمت ان کے خطوط کی وجہ سے ہے جن کا ذکر حصّہ نثر میں ہوگیا ہے۔

فانیؔ شوکت علی - بدایونی (۱۸۷۹ء - ۱۹۴۱ء)

فانیؔ کے بزرگوں نے شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں کابل سے آکر ہندوستان میں سکونت اختیار کی اور صوبہ بدایوں میں گورنری کے معزز عہدے پر سرفراز ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے ساری حیثیت بگاڑ دی۔ فانیؔ کے والد شجاعت علی خاں مرحوم نے اپنی قابلیت اور قوت بازو سے پھر حیثیت بنائی۔ فانیؔ نے بریلی کالج سے بی۔ اے اور الہ آباد و علی گڑھ سے ایل۔ ایل۔ بی پاس کیا اور چاروناچار وکیل بن گئے۔ وکالت میں کام یابی نہ ہوئی۔

وہ بالآخر حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں محکمۂ تعلیمات میں مختلف جگہوں پر کام کیا۔ زندگی وہاں بھی خوش نہ گذری۔ وہیں انتقال کیا۔

فانیؔ کو اوائل عمر سے ہی شعروسخن کا چسکا لگا ہوا تھا مگر ان کے والد انھیں شعر کہنے سے ہمیشہ روکا کرتے تھے۔ اپنی شاعری کی تہذیب و تربیت کے لیے فانیؔ کسی استاد کے نہیں بلکہ اپنے مذاق سلیم اور پاکیزہ ذوق شعری کے رہین منت ہیں۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے باقیات فانی اور عرفانیات فانیؔ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

فانیؔ کی شاعری میں غالبؔ اور میرؔ دونوں کا رنگ نظر آتا ہے۔ جہاں تک الفاظ کے دروبست فارسی تراکیب کے استعمال اور فلسفیانہ زاویۂ نگاہ کا تعلق ہے وہ غالبؔ کے ہم رنگ ہیں۔ مگر فانی کے یہاں غالبؔ کا تنوع نہیں پایا جاتا۔ جہاں تک سوزوگداز، یاس و محرومی، خستگی اور کسک کا تعلق ہے وہ میرؔ کے جانشین معلوم ہوتے ہیں۔ فانیؔ کے کلام نے غزل کو ایک نیا مزاج، ایک لہجہ دیا جس میں باوجود غم گینی کے ایک دل کشی اور نغمگی ہے۔

فراقؔ - رگھوپتی سہائے

۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اچھے وکیل اور شاعر تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری میں انتخاب ہوا مگر کانگریس کی تحریک میں شامل ہو کر جیل گئے اور اس طرح ایک اعلیٰ ملازمت کو ٹھکرا دیا۔ الہ آباد میں طالب علمی کے زمانہ ہی سے شعروسخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور وہ برابر پروان چڑھتا رہا۔

کرسچین کالج لکھنؤ، اور سناتن دھرم کالج کان پور میں معلمی کرنے کے بعد الٰہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے اور اب بھی اسی جگہ کام کر رہے ہیں۔

فراقؔ کے پچھلے کلام میں کئی ممتاز اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ مگر اب ان کا ایک منفرد اور مخصوص رنگ ہو گیا ہے۔ وہ نئی نسل کے سب سے اچھے غزل گو شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ کیف، خستگی، رنگینی و رعنائی ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔ انھیں زبان اور طرزِ بیان پر بڑی قدرت ہے۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے نظمیں، رباعیات اور قطعے بھی کہے ہیں۔ رباعیاں خاص طور پر بہت زوردار لکھی ہیں۔

میر خود روئے اور دوسرں کو رُلایا۔ ان کی شاعری میں دردانگیزی کی نمائش نہیں ہے۔ ان کی شاعری ایک دکھے ہوئے دل کی آہ تھی اسی لئے اس میں بلا کی تاثیر اور اثر آفرینی ہے۔

میر اُردو غزل کے بہت بڑے محسن ہیں۔ جب تک اُردو غزل زندہ ہے، میر کا نام انتہائی عظمت سے لیا جائے گا۔

مومن۔ حکیم مومن خاں (۱۸۰۰-۱۸۵۳ء)

حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دہلی آئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے۔ مومن خاں نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں رہ کر عربی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد طب کی کتابیں پڑھیں اور علم نجوم کی طرف متوجہ ہوئے جس میں مہارت تامہ حاصل کی۔

مومن نے تیز ذہن اور طبیعت رسا پائی تھی۔ مزاج میں رنگینی، شگفتگی اور زندہ دلی تھی۔ یہ رنگین مزاجی ان کی وضع قطع، لباس اور اشعار میں سب جگہ نمایاں ہے جملہ اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے تاریخ گوئی میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔

معنی آفرینی اور جدت بیان کے لحاظ سے مومن ایک منفرد رنگ رکھتے ہیں۔ نازک خیالی، جدت طرازی اور شوخی ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ویسے تو ان کے اشعار میں نجوم و رمل کی اصطلاحات اور رموز تصوف اور فلسفیانہ مباحث عشقیہ کا بیان ہے مگر وہ "عشق پردہ نشین" میں مرتے ہیں اور داخلی کیفیات بڑے لطف سے بیان کرتے ہیں۔ کلیات مومن اور دیوان مومن کے نام سے آپ کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

محسنؔ۔ محمد محسن

قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ شاعری کی طرف رجحان بچپن سے تھا۔ برقؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کلام پر بڑی قدرت تھی، مشکل مشکل زمینوں میں لمبے لمبے قصیدے کہے ہیں۔ رواج زمانہ کے مطابق مثنویاں بھی کہی ہیں۔ ہر چند کہ کلام میں کہیں کہیں آورد نظر آتا ہے مگر

جو حصہ صاف ہے اس میں سوز و گداز بہت ہے۔ طبیعت میں مذہبیت کا رنگ غالب تھا۔ بڑے دین دار اور خدا پرست تھے اسی لیے آپ نے جو مذہبی قصائد لکھے ہیں ان میں بے حد جوش اور اثر پایا جاتا ہے۔ منقبت نگاری میں کوئی شاعر آپ کا ہم پلہ نہیں ہے۔

مُلّا۔ آنند نرائن

لکھنؤ کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ادبی ذوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ دھیرے دھیرے وہ ذوق نکھرتا گیا اور انھوں نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ لکھنؤ کے عام مذاق کا اتباع نہیں کیا۔ چکبستؔ، غالبؔ اور اقبال کا اثر کلام میں نمایاں ہے۔ لہجے میں متانت، سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ ہے۔ تاہم آپ کی غزلوں میں تازگی اور اثر آفرینی بہت ہے۔ نظمیں بہت اچھی کہتے ہیں۔ ان میں موضوع اور اسلوب کا تنوع ملتا ہے زبان نہایت پاکیزہ اور رچی ہوئی لکھتے ہیں مگر شگفتگی اور سلاست بہت ہوتی ہے۔ "جوئے تیر" کے نام سے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔

مجاز۔ اسرارالحق ردولوی

نوجوان شعرا میں مجازؔ ایک ممتاز اور مقتدر درجہ رکھتے ہیں۔ وہ سنہ ۳۶-۱۹۳۴ء میں علی گڈھ یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند ادبی تحریک نے علی گڈھ میں زور پکڑا۔ مجاز بہت جلد اس تحریک کے ایک سرگرم کارکن بن گئے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مختلف جگہوں پر ملازمت کی مگر حساس اور بے قرار طبیعت نے کبھی جمنے نہ دیا۔ شراب نوشی کی کثرت نے جسم و دماغ دونوں پر بے حد مضر اثرات ڈالے اور یہی شراب نوشی بالآخر ان کی جواں مرگی کا باعث ہوئی۔ انھوں نے دسمبر سنہ ۱۹۵۵ء میں انتقال کیا۔ ان کی مثال ایسی ہے

جیسے کوئی درخشاں ستارہ دم بھر چمک کر فضا کی تاریکیوں میں گم ہو جائے۔

مجاز کی غزلوں میں اساتذہ کی پختگی، روانی اور برجستگی ہے۔ نظمیں بھی بہت اچھی کہتے تھے۔ جذبات نگاری پر اُنھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ کلام میں جوش اور ولولہ ہے اور سماجی نظام کو بدل دینے کا عزم۔ بہ حیثیت مجموعی وہ اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ "آہنگ" اور "سازِ نو" ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

منیرؔ۔ سید اسمٰعیل حسین

شکوہ آباد کے رہنے والے تھے مگر ناسخ کے تلامذہ میں سے تھے۔ پہلے نواب باندہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ غدر کے بعد رام پور تشریف لے گئے لکھنؤ کی تباہی اور غدر کے ہنگامہ کے بعد رام پور شعر و سخن کا مرکز ہو رہا تھا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں کی قدردانیوں نے بہت سے شعرائے باکمال کو یہاں جمع کر دیا تھا۔ ان مشاہیر شعرا میں داغ، امیر، منیر، اسیر اور تسلیم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ نواب صاحب رام پور نے منیر کی بڑی قدر افزائی فرمائی۔ آخر عمر تک ریاست کے دعا گو رہے اور بالآخر ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔

منیر نے غزل گوئی میں کوئی خاص نام پیدا نہیں کیا۔ ان کی غزلوں میں ناسخ کا رنگ صاف طور سے نظر آتا ہے۔ منیر اپنے قصائد کے لیے مشہور ہیں۔ سودا اور ذوق کے بعد قصیدہ گوئی میں انھیں کا نمبر آتا ہے۔ لیکن چوں کہ قصیدہ بحیثیت صنف کے بہت محدود ہے، اس لیے ان کے قصائد میں کوئی جدت نظر نہیں آتی۔ وہی لفاظی اور مبالغہ آمیز باتیں جو کہ قصیدہ کا جزو لاینفک ہیں ان کے یہاں بھی موجود ہیں۔ سودا اور ذوق اور بالخصوص سودا نے اس صنف سخن میں جو جدت طرازیاں کیں، ان کا جواب کہیں نہیں ہے۔

نظیر۔ شیخ ولی محمد اکبر آبادی (۱۸۳۰-۱۷۴۰ء)

دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے بڑے ناز و نعم سے پلے۔ لڑکپن میں اپنی والدہ کے ساتھ آگرہ پہنچے اور محلہ تاج گنج میں سکونت اختیار کی۔ نظیر آزاد منش اور درویش مزاج آدمی تھے۔ گوشہ نشینی چھوڑ کر درباداری کا دردِ سر مول لینا قبول نہ کیا۔ آگرہ ہی میں ایک معلم کی زندگی بسر کر کے راہی ملک عدم ہوئے۔

نظیر کا مجموعۂ کلام بہ نام "کلیات نظیر" چھپ چکا ہے۔ اس میں مختلف عنوانات پر بہت سی نظمیں ہیں۔ اکثر نظمیں ظرافت آمیز ہیں۔ نظیر حقائق و معارف کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔ واقعات زمانہ کے اچھے برے دونوں پہلوؤں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تصویر کھنچ جاتی ہے۔

نظیر کے کلام میں ہمواری نہیں ہے۔ جو نظمیں سنجیدگی سے لکھی گئی ہیں وہ بلند پایہ ہیں لیکن اکثر نظمیں فحش گوئی، ابتذال اور رکاکت کے علاوہ قواعد و عروض کی غلطیوں سے بھری ہیں۔ دورِ حاضر کے نقادوں نے انھیں اردو کا پہلا عوامی شاعر بتایا ہے۔

نسیم۔ پنڈت دیا شنکر (۱۸۴۳-۱۸۱۱ء)

کشمیری برہمن تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں کی فضا میں پلے بڑھے۔ رواج زمانہ کے مطابق اردو فارسی اور علوم متداولہ کی تکمیل کی اور شعر گوئی کی طرف

مائل ہوئے۔ اصلاح سخن کے لیے خواجہ حیدر علی آتش کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔

نسیمؔ، فوج کی وکالت کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ تیئیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ نسیمؔ کی شوخ طبعی، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ضرب المثل تھی۔ ان کی حاضر جوابی کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔

نسیم کی شاعری میں استادانہ فن کاری نظر آتی ہے۔ ویسے تو نسیمؔ نے غزلیات کا ایک دیوان چھوڑا ہے مگر اردو شاعری میں ان کی تمام تر شہرت مثنوی "گل زار نسیم" کی وجہ سے ہے۔ یہ مثنوی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ تناسب الفاظ، پختگی بیان، بندش کی چستی اور اختصار و ایجاز اس مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ مثنوی کی آرائش میں صنائع بدائع کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس نقص کے باوجود یہ مثنوی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور اردو ادب میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

نشور واحدی

نئے دور کے شعرا میں نشور ایک بلند درجہ رکھتے ہیں۔ غزلوں کی وجہ سے ان کی شہرت زیادہ ہوئی حالاں کہ انھوں نے نظمیں بھی بہت کہی ہیں اور اپنے کو آفاقی شاعر تصور کرتے ہیں۔

اس وقت حلیم مسلم ڈگری کالج کان پور میں اُردو کے پروفیسر ہیں مگر ان کی تمام تر شہرت پروفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ شاعر کی حیثیت سے ہے۔

ان کی غزلوں کا مخصوص رنگ ہوتا ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی دل کش اور منفرد ہے۔

نشور کی غزلیں نہایت شگفتہ اور مترنم ہوتی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ان میں کافی تنوع ہوتا ہے اور جذبات کی گہرائی اور گیرائی بھی ملتی ہے مگر ان کی نمایاں خصوصیت شگفتگی اور اثر آفرینی ہے۔

غزل میں حسن پیدا کرنے کے لیے وہ حسب ضرورت قوافی اور محاوروں کے استعمال میں تصرف سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اکثر نکتہ چیں ان دانستہ لغزشوں پر معترض ہوتے ہیں مگر نشور ان اعتراضات کی پروا نہیں کرتے۔